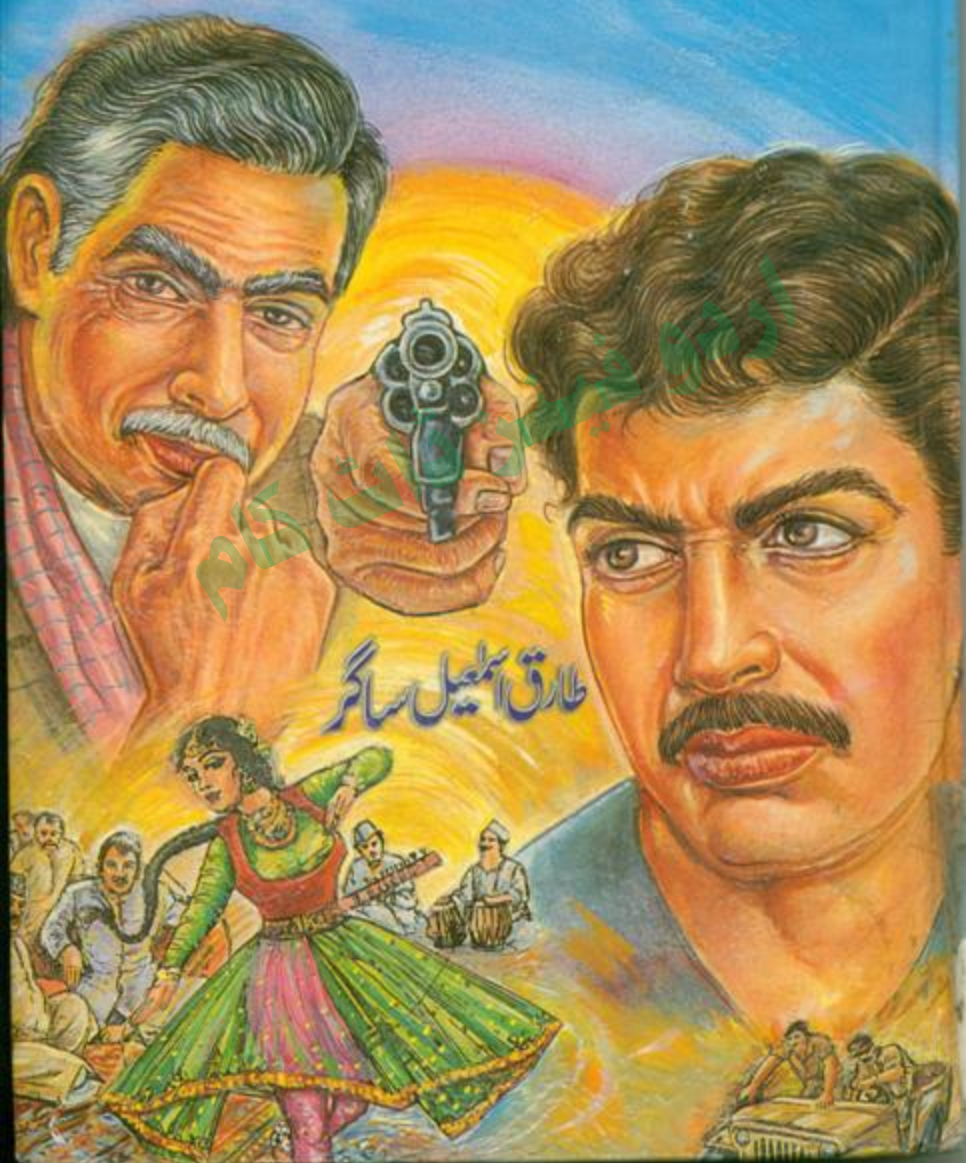


جنتی ہوارا ہی



طارق انجیل ساگر

جنگل کا پتھر اور لہجہ

طارق اسماعیل ساگر

ساگر پبلشرز

برائے کوثر مال - داتا دربار روڈ - لاہور

www.sagar.com

فہرست

5	عرض مصنف
9	تکراؤ
20	سراب
30	جال
41	شکار اور شکاری
53	سیاست اور.....
64	فریب نگری
78	شطنج کے مہرے
95	ہتھ ٹھوکا
108	قربانی کے بکرے
119	انٹیلی جنس
136	آستین کے سانپ
157	گھناؤنے کھیل

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب: بھٹکا ہواراہی
مصنف: طارق اسماعیل ساگر
ناشر: ساگر پبلشرز، 7۔ اے لوئر مال، داتا دربار روڈ، لاہور
فون:- 7230423
کمپیوٹر کوڈ: 1S98
قیمت: 200/- روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953 فیکس:- 042-7238010
9۔ انکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350
14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی
فون:- 021-2210212-2212011-2630411
e-mail:- zquran@brain.net.pk
Website:- www.ziaulquran.com

عرض مصنف

یہ کتاب جو آپ پڑھنے جارہے ہیں ذرا مختلف ذائقہ رکھتی ہے۔
آپ نے آج تک میری جن کتابوں کا مطالعہ کیا ہے ان میں ایمان داری اور اپنی بساط
بھرکوشش سے میں نے پاکستان کے دشمنوں کو بے نقاب کیا ہے۔
میں نے کوشش کی ہے کہ تصویر کا وہ رخ آپ کو دکھاؤں جس کو دیکھنا ہم پسند نہیں
کرتے۔

یہ جاننے کے باوجود کہ.....
تلخ حقائق کے سامنے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے ہم بلی کے خطرے کو نہیں ٹال
سکتے۔

”بھٹکا ہوا راہی“ میرے اس مشن کا حصہ ہے.....!
یہ آستین کے ان سانپوں کی کہانی ہے جو مادر وطن کو ڈنک لگانے سے کبھی نہیں چوکتے۔
یہ ان خون پینے والی جوکوں کا قصہ ہے جو روپ بدل بدل کر سامنے آتیں اور ملت کے
جسد خاکی سے خون چوس کر اپنی پیاس بجھا رہی ہیں۔
ان خونی درندوں کے جو بظاہر بڑے معزز انسانوں کے روپ میں ہمارے سامنے
موجود ہیں، کئی نام ہیں۔

181	دوستی کے نام پر
195	بھولا پنچھی
213	سانپ کے منہ میں چھپکلی
224	سیا دا اپنے دام میں
236	انکشاف
251	نہلے پہ دہلا
265	آتش فشاں
276	دوسرا روپ
311	سازش اور ٹکراؤ
344	فاتح
362	حملہ
375	پارٹ آف گیم
389	زمین اور ماں

کئی حوالے ہیں.....!

کئی شناختیں ہیں.....!

ان کے آج تک سلامت رہ جانے کا راز بھی شاید یہی ہے کہ انہوں نے خود کو کبھی ایک روپ تک محدود نہیں رکھا.....

وقت کے ساتھ ساتھ یہ خون آشام بھیڑیے اپنے چہروں پر نقاب بدلتے رہتے ہیں۔ تاکہ..... ان کی شناخت ممکن نہ رہے۔

50 سال سے یہ خونخوار درندے پاکستان کے غیور اور سادہ لوح عوام کی رگوں سے لہو نچوڑ رہے ہیں۔

گھن کی طرح انہوں نے ہماری ملی اقدار و روایات کو چاٹ لیا ہے۔

اب جب کہ ان کے کالے کرتوتوں کے سبب ہم اپنا آدھا ملک گنوا چکے ہیں تو بھی ان کالی دیوی کے پجاریوں کی پیاس نہیں بجھی۔

اور.....!

یہ نفرت، تعصب، منافقت اور ریاکاری کے گھٹاؤ نے حربے سے مسلح ہو کر ایک مرتبہ پھر اپنی تمام تر شیطانی قوتوں کے ساتھ پاکستان کی سلامتی پر حملہ آور ہوئے ہیں۔

بھائی کو بھائی سے لڑا کر، گھٹاؤ نے نعروں کی آڑ میں پاکستانیوں کو آپس میں ٹکرا کر یہ وحشی اپنی سیاست کی دکان چکا رہے ہیں۔

انہوں نے آج اس عظیم ملک کو جو اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام پر معرض وجود میں آیا تھا، اقوام عالم کی نظروں میں ایک عام سالک بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

وہ عظیم قوم جس نے اپنے لہو کے دریا میں تیر کر پاکستان کی منزل پائی تھی۔ آج ان انسان نمادرندوں کے ہاتھوں بے بس ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔

لیکن.....!

یہ نہیں جانتے کہ بظاہر جو دکھائی دے رہا ہے وہ سارا سچ نہیں ہے۔ گو کہ ان کی شیطان کاریوں کے ہاتھوں آج باغیرت پاکستانیوں کو دم گھٹا محسوس ہو رہا ہے۔

لیکن.....!

ایک لاوا اندر ہی اندر دھک رہا ہے۔

اور جس روز یہ لاوا پھٹے گا.....

ان سب شیطانوں کو جو اپنی دانست میں زمین پر خدا بنے بیٹھے ہیں، اس طرح بہا کر لے جائے گا۔

جیسے تیز آندھی راگھ کو اڑالے جاتی ہے.....

مکافات عمل سے بے بہرہ یہ ملک دشمن نہیں جانتے کہ پاکستان خدا کے بابرکت نام پر معرض وجود میں آیا تھا۔ اس کی جڑوں میں لاکھوں ماؤں، بہنوں، بچوں، بزرگوں اور نوجوانوں کا خون ٹھانھیں مار رہا ہے.....

اس کی ہریالی کو رہتی دنیا تک شہیدوں کا خون قائم رکھے گا.....

اور.....

اس کے دشمن اس مملکت خدا داد کا برا چاہنے والے ایک روز اس طرح نیست و نابود ہو جائیں گے کہ پھر شاید ان کی داستان تک بھی داستانوں میں باقی نہیں رہے گی۔

طارق اسماعیل ساگر

ٹکراؤ

ٹرین نیویارک کے ”پن سٹیشن“ میں داخل ہو رہی تھی۔

ایک مرتبہ پھر اپنے کوٹ کی جیب تھپتھا کر اس نے اندر کی جیب میں پلاسٹک کے چھوٹے سے پیکٹ کی موجودگی کا احساس کیا اور اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رین کوٹ جو اس نے سلیقے سے تہہ کر اپنے سر کے اوپر سامان کے لئے مخصوص جگہ پر رکھا تھا، اب اٹھا کر پہننے کی تیاری کرنے لگا۔ موسم کے تیور بتا رہے تھے کہ یہ جلد رکنے والی پھوار نہیں ہے۔

سٹیشن سے باہر اس کا استقبال برفیلی ہوا کے تھپڑوں نے کیا۔ ایک لمحے کے لئے رک کر اس نے گہرا سانس لیا، جیسے ہوا میں موجود ساری ٹھنڈک کو اپنے پیچھے پھڑوں میں اتار لینا چاہتا

ہو۔

گرم ہال کمرے کے باہر لوگ قطار بنا کر ٹیکسیوں میں سوار ہو رہے تھے لیکن وہ پیدل ہی اپنے سامنے والی سڑک عبور کر گیا۔ دائیں ہاتھ پہلا موڑ مڑ کر اب وہ ”براڈوے“ پر آ گیا تھا۔

اپنے دونوں ہاتھ اس نے کوٹ کی لمبی جیبوں میں ٹھونسنے ہوئے تھے۔ کوٹ کے کالر کھڑے کئے..... اور سر پر فلیٹ ہیٹ جمائے وہ بظاہر برفباری سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ سڑک کے

کنارے کاروں کی لمبی قطاریں گرین سگنل کی منتظر تھیں۔ کاروں کی چھتوں پر سفید برف کے گالے جیسے تھے اور ونڈ سکرینوں پر وائپر اپنی پوری رفتار سے چل رہے تھے۔ قریباً سب ہی کاروں کی ونڈ سکرینوں کے کونوں پر برف جمی تھی۔

زندگی اس کے قدموں کی رفتار کے ساتھ ساتھ رینگ رہی تھی۔ سڑک کنارے بنی دکانوں کے چھجوں تلے امریکن کالے اور گورے شراب کی بوتلیں ہاتھوں میں تھامے جھوم رہے تھے۔

ہڈیوں میں سرایت کرتی اس سردی میں وہ اکیلا ہی پیدل نہیں چل رہا تھا۔ کچھ اور لوگ بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

”بیچارے.....!“ اس نے زیر لب ان پر تبصرہ کیا۔

کھر کی چادر نے اپنے دامن میں سڑک سے آسمان تک کو سمیٹ لیا تھا لیکن وہ آنکھیں بند کر کے بھی ”پنٹا ہوٹل“ تک پہنچ سکتا تھا۔

فاصلہ تھا ہی کتنا.....؟

بشکل دو فرلانگ.....!

○

معمول کے مطابق وہ چلتا ہوا ہوٹل کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازے کے باہر ہوٹل کے مستعد ملازمین ہر آنے والے گاہک کا سامان لپک لپک کر تھام رہے تھے۔ ہوٹل کے شیڈ کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر اس نے اپنے کار پر جمی برف کو جھاڑا پھر یہی عمل دونوں کندھوں پر دہرایا اور اب اپنے بازو پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھنے کے لئے وہ رین کوٹ..... کی آستین ہٹا رہا تھا۔

اچانک ہی مائیکل اس کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔

بالکل ایسے جیسے مصیبت بن بتائے اور بن بلائے اچانک کسی کے سر پر پہنچ جائے۔

اس کے لئے اب اس ”اچانک“ کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ اسے زندگی میں

اچانک بہت سے عجیب و غریب حالات سے سابقہ پڑتا رہتا تھا۔

جتنی حادثاتی زندگی اس نے گزاری تھی اس کا گمان کسی دوسرے کے بس میں نہیں تھا۔

مائیکل شاید پہلے ہی کہیں قریب موجود رہا تھا اور اس اطمینان کے بعد کہ وہ ”محفوظ“ ہے اس نے ارسلان کے نزدیک پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع دی تھی.....!

”کمرہ نمبر 20 میں چلے جاؤ.....!“ مائیکل نے اسے کہا اور واپس مڑ گیا۔

اس نے مقامی کالوں کی طرح ایک چمکدار سی جیکٹ پہن رکھی تھی اور سر کے بال لیس دار سلوشن سے گوندھ کر سلیقے سے سر پر جمار کھے تھے۔ گردن پر جمی میل گوکہ اس کے کالے رنگ کا حصہ بن چکی تھی لیکن الگ سے نظر آ رہی تھی اور اس کی جیکٹ کے کالر پر جم گئی تھی۔

اپنا رین کوٹ اتار کر اس نے بازو پر لٹکایا اور ہوٹل میں داخل ہو گیا۔

استقبالیہ میں موجود لڑکی نے مسکراتے ہوئے اُسے خوش آمدید کہا لیکن ارسلان اس کی

طرف دیکھے بغیر لفٹ کی طرف چل دیا۔

اگلے ہی لمحے وہ لفٹ پر سوار دوسری منزل کی طرف جا رہا تھا۔ 20 نمبر کمرے کے سامنے رک کر اس نے طویل راہداری پر نظریں جمائیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی یہاں موجود نہیں تھا۔

دروازے پر آہستہ دستک دے کر اس نے اندر موجود شخص کو اپنی آمد سے مطلع کیا۔
”لیس.....! اس کی دستک کے جواب میں ایک بھاری بھر کم آواز بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں ایک لمبا تڑنگ گندی رنگ کا آدمی صوفے پر ٹانگ پھیرا بیٹھا تھا۔
”ہوں ہوں.....!“ اس نے ارسلان کی ”ہیلو“ کا جواب یک غراہٹ نما مسکراہٹ سے دیا۔

”نجانے یہ کبخت موسم کب سننے لگا.....؟“ اس نے اپنی دانست میں ماحول بدلنے کو بات کا آغاز کیا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی اسے گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔

”سامان لائے ہو؟“ اس کی بات کا سامان موجود شخص نے ذرا سا بھی نوٹس نہیں لیا

تھا۔

ارسلان کو قدرے بایوسی ہوئی لیکن اس نے اندازہ کر لیا کہ اس کی توقع کے برعکس یہ

شخص پاکستان یا بھارت کا باشندہ نہیں اور اس نے اپنی کھال کا رنگ بھی مصنوعی طریقے سے تبدیل کیا ہوا تھا۔

”یس سر!“ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پلاسٹک کی ایک تھیلی نکال کر سامنے میز پر رکھ دی۔

اندر موجود شخص نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ لمبا کر کے وہ تھیلی اٹھائی اور اس پر لینا کا غذا لگ کر کے تھیلی میں موجود سفید پاؤ ڈر کو لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تھیلی دیکھتے ہی ایک پراسرار چمک جاگ اٹھی تھی۔

اپنے منہ کے قریب لا کر اس نے تھیلی کو سونگھا اور اپنے دائیں ہاتھ رکھے بریف کیس میں منتقل کر دیا۔ اس بریف کیس سے ڈالروں کا ایک بنڈل نکال کر اس نے ارسلان کی طرف پھینک دیا تھا۔

ارسلان نے سامنے کی میز پر جھک کر بنڈل اٹھایا دیکھے اور گئے بغیر جیب میں رکھ لیا۔ ابھی وہ بمشکل سیدھا ہی ہو پایا تھا کہ اچانک ہاتھ روم کا دروازہ کھلا اور ایک قریب انگلی عورت جس نے اپنے سر پر تولیہ لپیٹ رکھا تھا باہر نکل آئی۔

”ہائے.....!“ اس نے ارسلان پر نظر پڑتے ہی امریکی لہجے میں سلام کیا۔

”ہائے.....!“ ارسلان نے اس کی طرف دوبارہ دیکھنے کی ہمت نہیں کی تھی۔

اس کی موجودگی نے اس حرافہ کی صحت پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا اور وہ بدستور اسی حالت میں چلتی اس کی آنکھوں کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر اپنے سر پر موجود تولیہ کھولنے لگی تھی۔

”مجھے اجازت ہے؟“ ارسلان نے دریافت کیا۔

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی کافی نہیں پیو گے؟“

”میں نیچے ہال میں پی لوں گا۔ شکریہ!“ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اپنے تعاقب میں اس نے حرافہ کا قبچہہ سن لیا تھا شاید اس کی حالت پر ہنس رہی تھی بے

چاری!

یا شاید اس کی بے بسی پر قبچہہ لگایا تھا اس نے!

اس مرتبہ لفٹ سے اتر کر وہ باہر جانے کی بجائے ڈائننگ ہال کی طرف چل دیا تھا۔

ڈائننگ ہال قریباً بھرا ہوا تھا۔ ایک کونے کی میز پر ایک عورت شیشے کی دیوار کی طرف منہ کئے بیٹھی تھی۔

○

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرا ہوا اس میز کی طرف گیا۔ میز کے نزدیک موجود بینگر پر اس نے اپنا رین کوٹ لٹکایا اور کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا۔

عورت نے ابھی منہ دیوار کی طرف کیا ہوا تھا۔ شاید سامنے کسی اجنبی کی موجودگی کے احساس نے اس کو ادھر دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔

مسکراتے ہوئے اس نے گردن موڑی اور اپنے سامنے موجود شخص کو دیکھ کر اچانک اسے سکتہ ہو گیا۔

کچھ ہی کیفیت ارسلان پر بھی گزری تھی۔

”ارسلان تم.....!“ عورت کے منہ سے بمشکل نکلا۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان دو الفاظ کی ادائیگی کے لئے اسے بے پناہ قوت صرف کرنی پڑی ہے۔

حیرت اور دکھ ایک ساتھ کی آنکھوں اور چہرے پر جم گئے تھے۔

”ہما.....!“ ارسلان نے بھی بڑی ہمت سے اس کا نام لیا تھا۔

دونوں شاید اس حادثے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہے تھے جب اچانک ہی ویٹرس نے دو مینو بڑے احترام سے ان کے سامنے رکھ دیئے۔

○

دونوں کو جیسے ایک دم سے بھولی ہوئی کہانی یاد آ گئی تھی۔

لیکن یہ کہانی بھولی ہوئی کب تھی.....!

کم از کم ارسلان نے کبھی اس کہانی کو نہیں بھلایا تھا۔

پانچ سال پہلے جب وہ یونیورسٹی میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اس کی ملاقات ہما سے ہی ہوئی تھی۔ ہما اس سے ایک سال سینئر تھی اور دونوں ایم اے انگلش کر رہے تھے۔

”ہیلو.....!“ اس نے ایک طلبہ تنظیم کا سنیکرا اپنے بائیں کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔

ارسلان کے لئے حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس نے دوپٹہ نہیں اوڑھ رکھا تھا اور جس بے باکی سے اس نے ارسلان کو مخاطب کیا تھا اس کا تصور بھی پاکستانی سوسائٹی میں محال تھا۔
 ”خوش آمدید!“ ہمارے سامنے ایک اور نوجوان بھی اس کے قریب آ کر مخاطب ہوا.....!

”شکریہ!“ ارسلان نے کہا..... ”مجھے انگلش ڈیپارٹمنٹ کی طرف جانا ہے۔“

”آئیے میں آپ کو لے چلوں۔“ ہمارے آگے بڑھ کر کہا۔

”چلے.....!“ ارسلان جھجکتا ہوا اس کے تعاقب میں چل دیا۔

اچانک ہی اسے عابد نظر آ گیا تھا۔

عابد اس کے گاؤں کا رہنے والا اور یہاں سال دوم کا طالب علم تھا۔ ارسلان پر نظر پڑتے ہی وہ سیدھا اسی کی طرف آیا تھا۔

”کدھر منہ اٹھائے جا رہے ہو.....؟“ اس نے ارسلان کے کندھے پر بے تکلفی سے

ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”کدھر نہیں میرے ساتھ جا رہے ہیں ڈیپارٹمنٹ کی طرف.....!“ اس کے بجائے

ہمارے عابد سے کہا تھا۔

”دیکھئے مس ہمارے! یہ کوئی تنظیم جھگڑا نہیں۔ یہ میرے گاؤں کا ساتھی ہے اور یہاں پر

صرف تعلیم حاصل کرنے آیا ہے۔ اسے کسی گندی سیاست میں ملوث نہیں ہونا۔“ عابد کا تعلق شاید اس کی مخالف تنظیم سے تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا ہم یہاں گندی سیاست کر رہے ہیں؟ تم خود کو کیا سمجھتے

ہو؟ یہ معصوم شی شکل بنا کر تم کسی کو دھوکہ دینا چاہتے ہو.....؟“

”میں آپ کے منہ لگنا پسند نہیں کرتا۔ یوں بھی مجھے کسی عورت سے بحث کرنا زیب نہیں

دیتا۔ آپ برائے مہربانی میرے ساتھ نہ الجھئے۔“

یہ کہتے ہوئے عابد نے اس کا بازو تھام لیا اور بکے بکے ارسلان کو قریباً کھینچتا ہوا اپنے

ساتھ دوسری طرف لے گیا۔ اس کے تعاقب میں ہمارا لیکچر جاری تھا لیکن عابد نے اس کی طرف

دوبارہ دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔

خیریت گزری کہ وہ یونیورسٹی کے قدرے دیران حصے میں کھڑے تھے ورنہ ابھی یہاں طلباء تنظیمیں آپس میں ٹکرا جاتیں۔

”کون ہے یہ؟“ کینٹین میں پہنچ کر ارسلان نے پہلا سوال کیا۔

”ہمارا کبیر شیروانی۔ ایک بڑی ہوئی رئیس زادی! باپ علاقے کا سب سے بڑا زمیندار

ہے۔ تمام بھائی اعلیٰ سرکاری ملازمتیں کر رہے ہیں۔ احق کہیں کی! نوکروں کی فوج کے ساتھ فلیٹ

کرائے پر لے کر رہتی ہے اور یہاں انقلاب کا پرچار کرتی ہے۔ ذہنی مریض ہے کمخت۔ خیر چھوڑو!

تم بتاؤ ادھر گاؤں میں تو خیریت ہے ناں؟“

نجانے کیوں ہمارا کبیر شیروانی کا تعارف اس طرح کروانا ارسلان کو اچھا نہ لگا۔ ٹھیک ہے

اس کا تعلق عابد کی مخالف طلباء تنظیم سے تھا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ ایک لڑکی کے متعلق

خواہ مخواہ ایسی رائے قائم کرے۔

ارسلان کو خواہ مخواہ ہمارے ہمدردی ہونے لگی تھی..... لیکن وہ عابد کو کچھ کہہ نہ سکا۔ عابد

اس کے بڑے بھائی کا دوست تھا اور گاؤں کے نمبردار کا بیٹا۔ دونوں بچپن کے دوست تھے۔ اس

کے والد سرکاری افسر تھے لیکن انہوں نے کبھی یہاں سے الگ ہونا پسند نہ کیا۔ زمین سے آمدن ہو

جاتی تھی اس لئے ارسلان کے والد کو کبھی رشوت لینے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

تینوں بہن بھائی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ہوٹلوں میں رہتے تھے لیکن ان کی

تر بیت اس نہج پر ہوئی تھی کہ کسی نے کبھی دیہاتی زندگی پر شہری زندگی کو ترجیح نہیں دی تھی۔ ارسلان

کے بڑے بھائی نے اعلیٰ سول سروس کا امتحان دے رکھا تھا اور بہن ایم اے کر رہی تھی۔ وہ خود

انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کا خواب لے کر یہاں آیا تھا۔

طلباء سیاست اس کے لئے کوئی نئی یا چونکا دینے والی چیز نہیں تھی۔ میٹرک کے بعد سے

اسے کالج میں تعلیم سے کم اور طلباء سیاست سے زیادہ سابقہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی مضبوط طلباء

تنظیم سے وابستگی کے بغیر کالج سے گھر تک کا راستہ بھی غیر محفوظ ہو سکتا ہے۔

عابد نے اس سے صرف گاؤں کی باتیں کی تھیں۔ دونوں چائے سے فارغ ہو چکے تھے

اور اب عابد اسے مطلوبہ دفتر تک چھوڑنے گیا تھا۔ اس نے اپنی موجودگی میں ارسلان کے کاغذات

اور فیس وغیرہ کا مرحلہ بھی طے کروا دیا تھا۔

ارسلان نے یونیورسٹی میں داخلے کے فوراً ہی بعد ایک ہوسٹل میں کمرہ حاصل کر لیا تھا اور یہاں سے فارغ ہو کر وہ اپنے ہوسٹل کے کمرے کی طرف ہی جا رہا تھا۔

اسے رہ رہ کر اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ اس کی وجہ سے خواہ مخواہ ہمارا جیسی خوبصورت لڑکی کا موڈ خراب ہوا۔ کاش عابد وہاں نہ آیا ہوتا، اس نے سوچا۔ ہوسٹل پہنچ کر وہ اپنے بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ ہمارا کبر شیروانی اس کے بستر تک اس کے ساتھ چلتی آئی تھی اور اب اس کے ذہن پر برا جہان ہوئی بیٹھی تھی۔

شاید اس کے دل کا کوئی درپچہ اچانک ہمارے لئے کھل کر بند ہو گیا تھا اور اب وہ نہ واپس جانے والے مہمانوں کی طرح اس کے دل میں سما گئی تھی..... وہ خوابوں کی دنیا میں رہنے والا لڑکا نہیں تھا۔

لیکن.....!

جو خواب اس نے اپنی کھلی آنکھوں سے آج یونیورسٹی میں دیکھا تھا، اس سے چھٹکارہ کیسے ممکن ہوگا؟ یہی کچھ سوچتا ہوا وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ ڈائننگ ہال کی طرف جا رہا تھا۔ کھانے کا وقت ختم ہونے والا تھا جس کے بعد اسے ہوسٹل سے کھانا نہ ملتا اور وہ ہوسٹل کے باہر جا کر کھانا اسے بہت عجیب لگتا تھا۔

بوجھل قدموں سے اس نے اپنا کھانا وصول کیا اور جیسے تیسے کچھ لقمے زہر مار کر کے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ جس کی دیواروں، زمین، چھت اور بستر سے ہمارا کبر کے مانوس لہجے کی خوشبو پیش بن کر اس کے دل و دماغ کو معطر کر رہی تھیں۔

”ہیلو..... میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ.....!“

دو فقرے ہی تو اس نے بولے تھے۔

کتنی اپنائیت تھی ان دو فقروں میں! کتنا مودہ لینے والا انداز تھا اس کا! کبھی ہمارا گم کردہ شہزادوں کی مدد کرنے والی خوبصورت پری بن جاتی اور کبھی جنات کے شہنشاہ کی قید میں پھنسی اس شہزادی کا روپ دھار لیتی جس کو آزاد کروانے کی سعادت بالآخر گاؤں کے لکڑہارے کو نصیب ہوئی تھی۔

رات گئے تک ارسلان شام، مصر اور فارس کا شہزادہ اور کبھی گاؤں کا لکڑہارا بنتا رہا۔ خوبصورت شہزادی اور پریوں کی ملکہ اس کے ہاتھ کئی مرتبہ لگی اور چلی گئی۔ اس کی آنکھ تب کھلی جب ہوسٹل کی مسجد کا مؤذن جاگنے والوں کو فلاح کی بشارت دے رہا تھا۔

لیکن فلاح کی راہ پر چلتے چلتے جیسے اچانک ہی کسی پگنڈی نے کوئی موز مڑ لیا ہو۔ جیسے کوئی شارٹ کٹ اپناتے ہوئے اصل راستے سے بھٹک جائے۔ بالکل ایسے ہی وہ بھی اپنی راہ چلتے چلتے زندگی کی پٹری سے اچانک اتر کر کسی طرف لڑھک گیا تھا۔

جب وہ بیدار ہوا تو دھوپ روشن دان سے اس کے منہ پر آ گئی تھی۔ سردیوں کی اس صبح کو سورج کی کوئل کرنوں نے بڑی ملائمت اور نرمی سے بالکل ہمارا کبر شیروانی کی طرح اسے خوش آمدید کہا تھا۔ سر ہانے رکھی گھڑی پر آنکھیں ملے ہوئے اس نے نظر ڈالی تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔

”میں آٹھ بجے تک سوتا رہا.....؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔

اسے اپنے آپ پر پہلے تو غصہ پھر ترس آنے لگا تھا۔ تولیہ اٹھا کر اس نے غسل خانے کا رخ کیا اور جب تیار ہو کر باہر نکلا تو ناشتے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ وہ کبھی چائے کا عادی نہیں رہا تھا لیکن نجانے آج کیوں وہ شدت سے چائے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔

ذہن منتشر تھا۔

اور وہ خود کھاتا تھا کا سا یونیورسٹی کی طرف جا رہا تھا۔

ہوسٹل سے یونیورسٹی کینٹین کا فاصلہ بمشکل پندرہ منٹ کا تھا لیکن آدھ گھنٹے میں وہ وہاں پہنچا۔

کینٹین میں نوجوان طلباء اور طالبات مستقبل میں اپنی زندگیوں پر ٹوٹنے والے قہر سے لالعلق چائے اور کوک کی بوتلوں سے منہ لگائے زور زور سے ہنس رہے تھے۔ ان کی ہر حرکت زندگی کی علامت تھی۔

جیسے وہ مکمل زندگی کے ساتھ جینے کا عزم لئے بیٹھے ہوں۔

ایک خالی کونے میں بیٹھ کر اس نے چائے منگوائی اور ابھی چائے کا کپ اس کے ہونٹوں سے بمشکل چھوا ہی تھا جب اچانک اپنے بغلی دروازے سے اس نے ہما اکبر شیردانی کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے دروازے میں رک کر ایک سرسری نظر ماحول پر ڈالی۔

دو چار شناسا چہروں نے ہوس ناک آنکھوں سے اس کو ”ہیلو ہیلو“ کہا اور فقیروں کی طرح اس کی قربت کی بھیک مانگنے کے لئے اسے مدعو کرنے لگے۔

لیکن..... ہما ان سب سے لاتعلقی اپنے ہونٹوں پر نہ ختم ہونے والی مسکراہٹ لئے سیدھی اسی کی میز کی طرف آئی۔

کسی نادیدہ قوت نے ارسلان کی ٹانگوں میں بجلیاں بھر کر اسے کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا۔

”ہیلو.....!!“ اس نے حسب عادت ارسلان کی طرف ڈس لینے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکراہٹ اچھالی۔

جواب میں وہ بمشکل ”ہیلو“ ہی کہہ سکا تھا۔

”کیسے ہیں آپ؟ کام ٹھیک ہو گیا تھا نا.....؟“ اس نے کل والے واقعے پر بڑی ہمت سے معذرت کرنا چاہی۔

”ارے نہیں بھئی! آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ معافی تو مجھے مانگنی چاہئے۔ میری وجہ سے ہی ساری تلخی ہوئی۔“ اس نے ارسلان کی بات کاٹ کر اس کے دل کو کاٹ کھایا۔

”لیکن آپ کی.....!“

”کوئی بات نہیں۔ میں سمجھتی ہوں انسان کو اپنے نظریات کی خاطر اتنی سی قربانی تو دینا ہی پڑتی ہے۔ اگر آپ سچائی کے راستے پر چلیں گے تو بہت کم لوگوں کو اپنا ہم خیال پائیں گے۔

مجھے عابد صاحب سے کوئی گلہ نہیں۔ صرف اتنی بات کہوں گی کہ وہ اگر اپنے نظریات میں مخلص ہیں تو دوسروں سے خوفزدہ کیوں ہیں؟ محض اس بات سے ڈر جانا کہ میں آپ کو ڈیپارٹمنٹ تک لے

جاؤں گی..... بہت عجیب لگتا ہے۔ بھئی میں کوئی جادوگر نی تو نہیں ہوں کہ آپ پر جادو کر کے آپ کو انسان سے کچھ اور بنادیتی.....“ اتنا کہہ کر اس نے بے تکلفی کے انداز میں تہقہہ لگایا تو ارسلان

بھی مسکرایا۔

اس کا دل چاہا کہ ہما کو کہہ دے اس سے بڑی جادوگر نی اور ہے کہاں.....؟ اس نے تو بنگال کے جادو کو بھی مات دے دی تھی۔ اتنی جلدی تو وہ لوگ بھی آدمی کو گدھا نہیں بناتے جتنی جلدی اس نے ارسلان کے دل میں اپنی محبت کا بھالا اتار دیا تھا۔

”آپ چائے تو پیجئے.....!“ اس نے ارسلان کے سامنے رکھی ٹھنڈی چائے کی طرف اشارہ کیا..... ”لیکن آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہو گئی۔“

اتنا کہہ کر اس نے ویٹر کو اشارہ کر کے وہ چائے اٹھانے اور نئی چائے کے ساتھ کچھ لانے کی ہدایت کر دی۔

قریباً آدھا گھنٹہ وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ اب ارسلان خود میں اتنی ہمت پارہا تھا کہ اس کی باتوں کا کم از کم ”ہوں ہاں“ میں ہی جواب دیتا رہے۔

”اب ہمیں چلنا چاہئے کہیں پھر نہ آپ کے گاؤں کے دوست آ جائیں اور آپ کو میرے ساتھ دیکھ کر برامنائیں۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ارسلان نے بیوقوفوں کی طرح مسکراتے ہوئے دانت نکال دیئے۔

کاؤنٹر پر جب ارسلان نے بل ادا کرنا چاہا تو کینٹین والے نے بل وصول کرنے سے انکار کر دیا۔

”مس صاحبہ کے مہمانوں سے ہم بل وصول نہیں کر سکتے جناب!!“ اس نے سعادت مندی سے ہما کی طرف دیکھ کر گردن جھکالی۔

”یہ تو زیادتی ہے۔“ ارسلان نے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ کبھی آپ یہ زیادتی کر لیجئے، حساب برابر۔“ اس نے ہستے ہوئے جب بے تکلفی سے ارسلان کے کندھے پر ہاتھ مارا تو اس کا سارا بدن جھنجھنا اٹھا۔

دونوں اکٹھے ہی ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا رہے تھے۔

سراب

دن ہفتوں اور مہینوں میں بدلتے گئے۔

وقت کا پیچھی ارسلان کو اپنے پروں پر بٹھائے ہوا کے رخ پر اڑائے چلا جا رہا تھا اور ارسلان بے لگام گھوڑے کی طرح بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

عابد یونیورسٹی میں اپنی تنظیم کا ناظم تھا۔ ایک بھائی کے ناطے اس نے متعدد مرتبہ چاہا کہ اس بے لگام گھوڑے کو لگام دے لے اس کو روک دے۔ اس سے پہلے کہ بھاگتے بھاگتے اس کی ٹانگوں سے زندگی کا رس نچڑ جائے۔ اس سے پہلے کہ اس کے بدن کی ساری توانائیاں اس کی تمام ذہانتیں رنگ آلود ہو جائیں اسے قابو کر لے لیکن یہ اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔

جیسے ارسلان کے بس میں کچھ نہیں رہا تھا۔

ہمارا شہر میں اپنی بڑی کوشی کی انکسی میں رہتی تھی۔ اس کے والدین دوسرے شہر میں تھے۔ ہمارا گھر اس کی پارٹی کا ہیڈ آفس نظر آتا تھا۔ یہاں پارٹی سے منسلک نوجوانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

ہمارے کسی کو ایک حد سے تجاوز نہیں کرنے دیا تھا۔ ارسلان محسوس کر سکتا تھا کہ اس کے علاوہ وہ کسی کے ساتھ اتنی ”فری“ نہیں ہوتی۔ کسی سے اتنی باتیں نہیں کرتی۔ کسی کو منہ نہیں لگاتی۔

ایک وہی تھا جس سے تنہائی میں گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی۔ اس کو سمجھاتی کہ اس ملک کے عوام کی قسمت تب ہی بدل سکتی ہے جب یہاں انقلاب آئے گا۔ ہمارے مسائل کا حل انتخابات نہیں انقلاب ہے۔

وہ حیران تھا کہ اتنے رئیس ماں باپ کی بیٹی سونے کا چچہ لے کر پیدا ہونے والی ہمارا کبر شیردانی غریبوں کی کتنی خیر خواہ ہے۔ اس کی محبت میں اب عقیدت کا رنگ بھی جھلکنے لگا تھا۔ عجیب بات تھی کہ آج تک کھل کر وہ اس کے سامنے اظہار محبت نہ کر سکا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا، کبھی ہم سیاست سے ہٹ کر بھی بات کریں۔ لیکن.....!

ہمارا تو معاشرے کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ بے انصافیاں، ظلم، رشوت، کرپشن سارے روگ جو غریب عوام کو لگے تھے اس نے اپنی جان کو لگا رکھے تھے۔ وہ دونوں راتوں کو جاگ کر بیئر لکھا کرتے۔ ہمارا کبر شیردانی صدارت کی امید دار تھی۔ اس کے مقابلے میں دوسری تنظیم نے عابد کو کھڑا کیا تھا۔

عابد سے اس کے کئی مضبوط حوالے اور رشتے تھے لیکن وہ ہمارے لئے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اس روز جب اچانک عابد اس کے کمرے میں آیا تو وہ گھبرا ہی گیا۔

”گھبراؤ نہیں۔“ عابد نے تسلی دی۔ ”تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ میرے تمہارے ساتھ کئی رشتے ہیں۔ خون سے زیادہ مضبوط رشتے..... اور یہ بھی جان لو کہ اگر تمہارا ایک دوٹ ہمارے حق میں کاسٹ نہ ہوا تو بھی ہمارے والے نہیں جیت تو ہماری ہوگی۔ میں تو تمہیں صرف یہ سمجھانے آیا ہوں کہ تم سراب کے تعاقب میں اندھے ہو جاؤ گے۔ تم میرے نزدیک نہ بچے ہو۔ چھوٹے بھائی کی طرح۔ میں تمہیں آخری مرتبہ سمجھا رہا ہوں کہ محبت اور ہوس کو گڈنڈ نہ کرو۔ تم ہمارے عشق کرتے ہو۔ گدھے! بے وقوف! تم نے ایک سال میں کچھ نہیں دیکھا۔ تمہاری آنکھیں بند ہو گئی ہیں یا تم نے ان پر ہوس کی پٹی باندھ لی ہے۔ دیکھو ارسلان! وہ ہمارے تم جانتے ہو ہمارا ایک پراسرار پرندہ ہے جس کے سر پر بیٹھ جائے اسے بادشاہت تو مل جاتی ہے لیکن ہمارے نہیں ملتا..... وہ اپنی آگ میں جل کر مر جاتا ہے اور اس کی راکھ سے ایک اور ہمارا بھی جنم لیتا ہے۔

یہ روایت تم پر حقیقت بن رہی ہے۔ یہ بڑی تہہ دار لڑکی ہے۔ اس نے اپنے انقلابی

چکر میں جس کو پھانسا، وہ نشے کا مریض ہو گیا۔ تم دیکھو اس کے گھر آنے والے کتنے نوجوان نشہ کرتے ہیں.....!“

عابد نجانے کیا کیا کہتا رہا.....!

وہ سر جھکائے سنتا رہا۔

لیکن.....!

عابد بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس کی باتیں اس چکنے گھڑے سے پھسل رہی ہیں۔

”اچھا بیٹا! اگر تم نے اپنے ماں باپ کی لٹیا ڈبوںے کا تہیہ ہی کر لیا ہے تو میں تمہارے لئے صرف دعا ہی کر سکتا ہوں۔ کسی روز تم بہت پچھتاؤ گے۔“

عابد اسے طعن طعن کر کے واپس چلا گیا۔

○

ارسلان نے بڑھ چڑھ کر ہما کی انتخابی مہم میں حصہ لیا لیکن وہ ہار گئی۔ جس روز الیکشن کے نتائج کا اعلان ہونا تھا دونوں ہما کے گھر اس کے بیڈروم میں بیٹھے تھے۔ فون پر اسے پل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔ جب الیکشن کے حتمی نتائج کا اعلان ہوا وہ پھٹ پڑی۔

”میں نہیں مانتی، دھاندلی کی ہے ان لوگوں نے۔ انتظامیہ ان سے ملی ہوئی ہے۔ میں اس پر احتجاج کرتی ہوں.....!“

اور وہ بچوں کی طرح رودی۔

اسے نے اپنا سر ارسلان کے زانو پر رکھ دیا اور رونے لگی۔ ارسلان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اسے کیسے تسلی دی۔ اس کے جسم کو چھوتے ہوئے اسے اپنے ہاتھوں کے جل جانے کا دھڑکا لگ گیا تھا۔ اپنے زانو پر رکھے ہما کے سر پر سے اٹھنے والی خوشبو کی لپٹوں نے اس کے تن بدن میں انگارے بھر دیئے تھے۔ اسے اپنا دم گھٹا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے بدن پر دھندلے طاری تھا۔

نجانے کس جنونی جذبے کے تحت اس نے ہما کو خود سے چٹا لیا۔ ہما کو جب اس کی ”موجودگی“ کا احساس ہوا تو اس نے آہستہ سے خود کو ارسلان سے الگ کر لیا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور کچھ کچھ بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔ ارسلان کا دل دھک سے رہ گیا۔

”اف میرے خدا! یہ میں نے کیا کر دیا.....!“ اس کو پچھتاوا سا لگ گیا تھا۔

پھر جیسے خود ہی اس نے خود کو تسلی دی وہ اس سے اگر کوئی گناہ بھی سرزد ہو گیا ہے تو اندھے جذبات کے ہاتھوں.....

اور ان جذبات پر اس کا قابو نہیں ہے۔ وہ جب تک اس کا اظہار نہیں کرے گا، یہ منہ زور آندھی اسے کمزور پتے کی طرح اپنے ساتھ ساتھ لئے اڑاتی پھرے گی۔ وہ سنہل کر بیٹھ گیا۔ آج اس نے اپنے دل میں مضبوطی سے ایک عہد باندھا تھا اور اب اس عہد کو پورا کرنا تھا۔

ہما کی واپسی چائے کی ٹرائی کے ساتھ ہوئی۔ اس کے چہرے پر خلاف توقع آج کچھ اور ہی کیفیت دکھائی دے رہی تھی۔ ارسلان کو آج اس کا چہرہ پہلے سے بہت معصوم دکھائی دے رہا تھا۔

○

”سوری! مجھے کچھ دیر ہو گئی۔“ اس نے چائے بناتے ہوئے ارسلان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہما! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے.....! اس نے ہما کی آنکھوں میں تیرے سرخ ڈوروں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”اچھا کمال ہے بھئی۔ اب کیا مجھے کہنے کے لئے تمہیں اجازت بھی لینی پڑے گی۔“ اس نے بڑے جبر سے اپنے لہجے کی شوخی کو لوٹایا تھا۔

”در اصل یہ بات مجھے پہلے ہی روز تم سے کہہ دینا چاہئے تھی لیکن میں بزدل ہوں یا پھر مجھ میں کبھی اتنا حوصلہ ہی نہ آیا کہ اتنی بڑی بات کہہ سکوں۔“

”ارسلان! بہت تمہید باندھ لی۔ اب کہہ بھی ڈالو۔ ایسی کیا خاص بات ہے؟“ بظاہر وہ ارسلان کے جذبات سے بالکل لائق نظر آ رہی تھی۔

”ہما! مجھے کہنا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور آج تک میں نے تمہارے لئے جو کچھ بھی کیا ہے وہ صرف تمہارے حوالے سے کیا۔ مجھے کسی انقلاب سے دلچسپی نہیں۔ میں سیدھا سادا دیہاتی لڑکا ہوں۔ بس مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے۔ ایک جنون ہے، ایک آگ ہے جس نے اندر ہی اندر جل کر مجھے جھلسنا شروع کر دیا ہے۔ اگر میں نے آج بھی تم پر اظہار نہ کیا تو کسی دن کھوکھلے تنے کی طرح میرے جسم کا درخت گر جائے گا اور میں ختم ہو جاؤں گا۔“

وہ خاموش ہو کر ہاکی طرف دیکھنے لگا۔

ہما چپ رہی۔

یہ سنا تا جو اس کی خاموشی نے ماحول پر طاری کر دیا تھا، ارسلان کو ڈسنے لگا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنے فضل پر روئے یا ہنسے۔

”ارسلان.....!“ بالا خرچائے کا گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے ہمارے ہمارے خاموشی کے طلسم کو توڑا..... ”تم بہت اچھے نوجوان ہو، خاندانی لگتے ہو۔ تمہارے والدین نے تم سے بہت سی توقعات وابستہ کی ہوں گی۔ کوئی بھی لڑکی جس سے تم محبت کرو گے، شادی کرو گے، دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی ہوگی۔ میں نے دیکھا ہے دوسرے نوجوانوں کے برعکس تم میں حیا موجود ہے۔ یہی مرد کا زیور ہے..... کاش! تم نے میرے متعلق جو توقعات وابستہ کر لی ہیں ان پر پورا اتر سکتی..... لیکن میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گی۔ میں دھوکہ دے ہی نہیں سکتی۔ میں تمہیں صاف صاف بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں تمہارے پیار کے لائق نہیں۔ میں نے جو راستہ اپنا لیا ہے وہ اب نشے کی طرح میری ضرورت بن گیا ہے۔ میں اپنے نظریات سے ہٹ نہیں سکتی کیونکہ میں اس کی بہت قیمت ادا کر چکی ہوں۔ ہاں ارسلان تمہیں بتا دینے میں کوئی عار نہیں سمجھتی کہ میری پاکیزگی کبھی کی خون ہو چکی ہے۔ میں صرف بدن ہوں۔ بدن..... مجھ میں روح نہیں ہے اور بدن بھی ایسا کہ جو تمہارے لائق نہیں۔ میں تمہیں دھوکہ نہیں دینا چاہتی۔ تمہیں کچھ بھی نہیں دے پاؤں گی..... میرا مشورہ یہی ہے کہ تم ابھی اس رات سے لوٹ جاؤ۔ تمہارا شاندار تعلیمی ریکارڈ ہے۔ تم زندگی میں آگے نکلنا ترقی کرنا مجھے بہت خوشی ہوگی۔“ چہرے لرزے رک کر اس نے کہا۔

”مجھے تم سے محبت ہے۔ تمہاری سادگی، ایمانداری اور حیا سے مجھے بہت محبت ہے۔ میں تمہارے لئے مروتو سکتی ہوں لیکن تمہیں اپنا نہیں سکتی۔“ اپنی بات کے خاتمے پر وہ بچوں کی طرح سک پڑی۔

ارسلان پتھر کا بت بن چکا تھا!

اسے سکنا سا ہو گیا تھا!

○

عابد نے ہمارے سے متعلق روایت کے حوالے سے اسے بتایا تھا کہ ہمارے جس کے سر

پر بیٹھ جائے، اسے بادشاہت عطا ہو جاتی ہے لیکن وہ کسی کو ملتا نہیں! اپنی آگ میں جل کر مر جاتا ہے۔ کوئی اسے پانہیں سکتا، اپنا نہیں سکتا۔ یہی اس کا مقدر.....!

اور یہاں.....!

ہمارا کبر شیروانی جس کی آنکھوں میں زندگی کے سارے رنگ انگڑائیاں لیتے تھے۔ جس کے سانسوں سے زندگی کا ردھم بندھا تھا۔ جو خدا کی اس زمین پر حیات کی علامت تھی۔ اس ہمارا کبر شیروانی نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے لئے مروتو سکتی ہے اسے اپنا نہیں سکتی.....!

یہ تھا اس کی سال بھر کی تپسیا کا نتیجہ!

اس روز بد کے لئے اس نے اپنی آنکھوں میں نیند حرام کر لی تھی۔

اپنے خاندان کی شرافت کو داؤ پر لگایا تھا۔

حافظ عابد نعیم کو ناراض کیا تھا جو اس کے لئے بڑے بھائی اور باپ کا درجہ رکھتا تھا۔ واقعات کا علم ہونے پر جب والدین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی تو باپ کی طرف دیکھے بغیر نظریں جھکا کر اس سے بات کرنے والے ملک ارسلان کنکریٹ کی مضبوط دیوار کی طرح تن کر باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ آنکھیں ڈال کر کہا تھا کہ وہ اپنے اور ہمارے درمیان کسی وجود کو برداشت نہیں کرے گا۔

اس روز سمرات اکبر اعظم کے سامنے جہانگیر نے بغاوت کر دی۔ وہ ”شیخو“ جس کے لئے اکبر اعظم نے زندگی کو تحج دیا وہی شیخو آج نور الدین جہانگیر بن کر اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا تھا.....!

تاریخ اپنے آپ کو یوں ہی دہرایا کرتی ہے.....!

کیا اس دن کے لئے ہوا تھا یہ سب کچھ؟ ارسلان نے اپنے آپ سے پوچھا اور وہ ٹوٹ کر رہ گیا۔

ایک جھکے سے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کوئی معمولی لوٹا نہیں تھا جس کی محبت کو ہمارا کبر شیروانی نے ٹھکرا دیا تھا۔

چھ فٹ لمبا اس کا وجود ریت کے گھر وندے کی طرح زمین میں دھنس گیا۔ اس کی

انائیت کا تناور درخت بوسیدہ شاخ کی طرح ٹوٹ کر گر پڑا۔

”میں اپنی اس حرکت پر شرمندہ نہیں ہوں مس ہما۔ میں نے بہت خلوص سے آپ کو چاہا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس چاہت میں کہیں ہوس نہ در آئے۔ میں نے کبھی غور سے آپ کے جسم کو دیکھا ہی نہیں۔ میں تو آپ کی روح سے..... آپ کی.....!“

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کا گلارندھ گیا۔ وہ کمرے سے قریب ابھاکتا ہوا باہر نکل گیا۔

○

برآمدے میں اس کا سامنا اچانک ہی کچھ لڑکوں سے ہوا جو یونیورسٹی سے اس طرف آ رہے تھے۔

”ارسلان!“ جاوید نے اس کا بازو پکڑ کر کہا..... ”ہوسٹل کی طرف نہ جانا۔ ان لوگوں نے جلوس نکالا تھا۔ گولی چل گئی ہے ان کا ایک لڑکا مارا گیا ہے..... ہمارے دوستی شدید زخمی ہیں۔ بڑی کشیدگی پائی جاتی ہے یونیورسٹی میں! کچھ بھی ممکن ہے، تمہیں تو وہ سب جانتے ہیں۔ اگر تم ان کے قابو میں آ گئے تو وہ چھوڑیں گے نہیں۔“

ارسلان اے ان کی بات سنی ہی کب تھی۔ اس کے دماغ میں تو جھکڑ چل رہے تھے۔ اس کی اتنا تو زخمی پردے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس نے جھٹکے سے جاوید کو الگ کیا اور باہر نکل گیا۔

رکشے میں سوار ہو کر وہ یونیورسٹی میں ہوسٹل کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ذہن پر تو ایک بھوت سوار تھا۔ ہما کے عشق کا بھوت!

رکشہ اس نے سڑک پر ہی چھوڑ دیا اور اب وہ پیدل ہوسٹل کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں سے جیتنے والوں کے زوردار نعروں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں لیکن وہ ان سب آوازوں سے بے نیاز اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

”مار دوسالے کو!“ اچانک ہی کسی نے ہجوم میں پہچان کر نعرہ لگایا۔

”یہ بھی عاشق ہے اس کا۔ مجنوں کی اولاد سالا!“

گالیاں دیتے نوجوان اس پر پل پڑے۔ وہ بے بس جانور کی طرح مار کھاتا رہا۔ اپنی

وانست میں مارنے والے اپنا کام مکمل کر چکے تھے لیکن اس کی خوش قسمتی کہ وہ محفوظ رہا.....!

پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں اس کے ذہن پر تھوڑے برسائے لگی تھیں۔

یہ آخری احساس تھا اس کا..... اس کے بعد اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

○

ارسلان کو ہوش آیا تو وہ پیٹوں میں جکڑا ہوا تھا۔

اس کے دائیں ہاتھ والے شینڈل پر خون کی بوتل لٹکی تھی۔ کسی کا خون قطرہ قطرہ بن کر اس کے جیون کی ٹوٹی ڈور کو سہارا دے رہا تھا۔ جسم کا شاید ہی کوئی ایسا حصہ تھا جس پر چوٹ نہ لگی ہو۔ اس کے بدن کا رواں رواں درد کر رہا تھا۔ کروٹ لینا اس کے اختیار میں ہی نہیں تھا۔ بمشکل اس نے اپنی گردن کو جنبش دی تھی۔

شاید کسی پرائیویٹ ہسپتال کا کمرہ تھا۔

اسے حرکت کرتے دیکھ کر ایک مستعد ڈاکٹر اس کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔

”آپ اطمینان سے لیٹے رہئے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کی جان بچ گئی۔ کوئی گہری چوٹ نہیں آئی۔ بس تھوڑی تکلیف برداشت کر لیجئے۔ انشاء اللہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔“ مہربان آواز سنائی دی۔

ڈاکٹر نے شاید نرس کو اشارہ کیا تھا جو باہر کسی کو اطلاع دینے لگی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ہما اس کے سر ہانے کھڑی تھی۔

”محترمہ! مہربانی ہوگی آپ کی، مختصر بات کیجئے۔ ابھی میں مریض کو زیادہ بولنے کی اجازت نہیں دے سکتا اور براہ کرم باہر موجود کسی بھی شخص کو ابھی اندر نہ آنے دیجئے۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر باہر نکل گیا۔

نرس نے کمرے کے کونے میں کرسی سنبھال لی تھی۔

”ارسلان! یہ تم نے..... یہ تم نے کیا ظلم کیا اپنے ساتھ..... کیوں گئے تھے ان وحشیوں کے چنگل میں پھنسنے کے لئے؟“

اس کی آنکھوں میں آج دوسری مرتبہ وہ آنسو دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے ایک مرتبہ وہ اپنی بے چارگی پر روئی تھی اور آج اس کے لئے رو رہی تھی۔

”خدا نخواستہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو جانتے ہو..... جانتے ہو میں مرجاتی.....!“

ارسلان کے ہونٹ لنگ تھے.....!

درد کا احساس دم توڑ چکا تھا۔

”اچھا یہ تم ہو ہمارا اکبر شیر دانی۔ یہ تم ہو..... جو مجھے اپنا نہیں سکتی.....!“ اس نے دل ہی

دل میں کہا۔ ”اور اب تم میرے لئے رو رہی ہو۔“

ایک مسکراہٹ اس کے زخمی ہونٹوں پر جم گئی۔ پھر اس نے کسی فتح کے جذبے سے

سرشار آنکھیں موند لیں۔

ہما بولتی رہی.....!

اسے ڈاکٹر نے خاموش کروایا..... اس نے ارسلان کو گہری نیند کا انجکشن لگا دیا تھا اور

اب وہ سو گیا تھا۔

○

اگلے روز اس کے والدین بھی پہنچ گئے تھے۔

ان کے ساتھ عابد بھی آیا تھا۔ یونیورسٹی کی یونین کا نو منتخب صدر حافظ عابد نعیم! جس نے

اسے کہا تھا ایک روز تم بہت چھتاؤ گے۔

اس نے ارسلان کو تسلی دی، اس کے والدین کو تسلی دی لیکن ارسلان نے محسوس کر لیا تھا

کہ یہ حافظ عابد نعیم کی نہیں ایک سیاست دان کی طفل تسلی ہے۔

”بھائی صاحب! آپ جانتے ہیں میں سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ محض ایک شخصیت سے

ذہنی یا جذباتی وابستگی کی یہ سزا بالکل نا انصافی ہے۔ میں ان لڑکوں کو پہچانتا ہوں جنہوں نے مجھ پر

حملہ کیا تھا۔ میں پولیس کو کسی کا نام نہیں بتاؤں گا لیکن میں کسی کو معاف نہیں کروں گا۔ آپ جانتے

ہیں ہمارے علاقے کی روایت ہے ہم پہل نہیں کرتے لیکن انتقام نہیں چھوڑتے۔“

آج وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں عابد سے مخاطب تھا۔

”دیکھو عزیز من! میں نے تمہیں بہت سمجھایا اور بتا دیا تھا کہ تم غلط راستے پر چل رہے

ہو۔ اس کا انجام یہی ہوتا تھا۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ تم نے اپنے کئے کی سزا بھگتی ہے اور

دوسری بات یہ کہ میں یہاں تمہارے لئے نہیں بلکہ اپنے بزرگوں کے لئے آیا ہوں اور تم مجھے

دھمکیاں دے رہے ہو.....!“

عابد کا لہجہ بھی بدل رہا تھا۔

”اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے بیٹا۔ اس کلمو ہی نے اس پر جادو کر دیا ہے اور اس کو کچھ

بھائی نہیں دے رہا۔“ اس کی ماں نے بیٹے کی پوزیشن صاف کرنا بہتر جانا۔

اس کے زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو رہے تھے.....!

ہمارے روز اس کی تیمارداری کے لئے آتی۔ اس کا برتاؤ اب قدرے سنجیدہ ہونے لگا تھا۔

سیاست پر وہ کم بات کرتی تھی لیکن ارسلان اب زیادہ گفتگو سیاست پر ہی کرنا پسند کرتا تھا۔



ملک صاحب ارسلان کی خیریت دریافت کر رہے تھے اور اخبار کے لوگ اپنے کام میں مصروف تھے۔ کمرے میں پریس کانفرنس کا ماحول بنا ہوا تھا۔ ملک صاحب نے ارسلان کے حق میں اور حملہ آور تنظیم کے خلاف اچھا خاصا بیان چھاڑتے ہوئے حملہ آوروں کو فوراً گرفتار کرنے اور کڑی سے کڑی سزا دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ انہوں نے اپنی پارٹی کی طرف سے ارسلان کو مکمل تعاون کا یقین دلاتے ہوئے اس کے بہتر مستقبل کے لئے دعا بھی کی۔

اگلے روز کے اخبارات میں اس کی اور ملک صاحب کی تصاویر سے اٹے ہوئے تھے۔ اس نے ایک لفظ نہیں کہا تھا لیکن اس کی طرف سے ایک لمبا چوڑا بیان حملہ آور تنظیم کے خلاف جاری ہو چکا تھا۔ اخبار نویسوں کی جیسیں گرم کر دی گئی تھیں اور ارسلان جانتا تھا کہ اگر اس نے اپنے بیان کی تردید بھی کرنا چاہی تو کوئی اسے قبول نہیں کرے گا۔

لیکن.....!

اس نے سوچا۔ وہ تردید کرے گا ہی کیوں؟ جب اس نے گندی سیاست کی اس دوڑ میں اپنا گھوڑا دوڑانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے، پھر اس میں اتنا ڈیٹینو ہونے کی ضرورت آخر کیا ہے؟ پندرہ بیس روز ہسپتال میں گزارنے کے بعد جب وہ ہوشل پہنچا تو ہیرو کی حیثیت سے اسے خوش آمدید کہا گیا۔

○

اگلے روز وہ گاؤں روانہ ہو گیا لیکن گاؤں میں اس کا دل لگتا کہاں تھا۔ وہ تو جلد از جلد شہر واپس جانا چاہتا تھا۔ زندگی نے اس پر دو طرفہ حملہ کیا تھا۔ اس کی انانیت پر ہمارے ضرب لگائی اور مردانگی کو مخالف طلبہ تنظیم کے لوگوں نے لٹکا رکھا تھا.....!

ایک بے نام سی آگ اسے اندر ہی اندر جھلسا رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اپنی گمشدہ توانائیاں حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب کسی کا انتظار نہیں کرے گا.....!

وقت کا بھی نہیں.....!

اب وہ خود آگے بڑھ کر اپنے حصے کی خوشیاں زندگی سے وصول کرنا چاہتا تھا۔ خواہ اس کی کتنی ہی قیمت ادا کرنی پڑے۔ اگر ہمارا کبر شیروانی نے سیاست کو ہی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا تو وہ

جال

ہسپتال میں آنے کے دوسرے دن ہی سے اسے ملک صاحب کی طرف سے پھولوں کا گلہ ستمنا شروع ہو گیا تھا۔

ملک صاحب ملک کے معتمد سیاست دان تھے۔ اپنی اصولی سیاست کے لئے وہ عموماً اپوزیشن کی سب ہی پارٹیوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ملک صاحب کی ہمدردیاں انقلابی سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ تھیں اور ارسلان کی ایک دو ملاقاتیں ملک صاحب سے ہوئی تھیں لیکن تفصیلی گفتگو کا موقعہ کبھی نہیں ملا تھا۔ ان ملاقاتوں میں انہوں نے طلباء کو امن وامان سے رہنے اور درس گاہوں کے احترام کا درس ہی دیا تھا۔ ارسلان کے لئے ان باتوں کی اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں تھی کہ وہ یہاں ہمارے ساتھ آیا ہے اور ملک صاحب ہمارے بہت عزت کرتے تھے۔

صدارت کے لئے انتخاب لڑنے کا مشورہ بھی انہوں نے ہی ہمارا کو دیا تھا۔

اس روز وہ قدرے بہتر محسوس کر رہا تھا جب اچانک ملک صاحب اپنے سیکرٹری اور ورکرز کی فوج کے ساتھ اس کی ملاقات کو آگئے۔ ان کے تعاقب میں اخبار رپورٹرز اور فوٹو گرافر بھی اس کے کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔

سیاست میں بھی اہم مقام حاصل کر سکتا تھا۔

اس کے پاس ذہن تھا.....!

قابلیت تھی.....!

اور سب سے بڑھ کر ایک مضبوط جسم تھا۔ جس سے وہ مرضی کے مطابق کام لینے پر قادر تھا۔ والدین کے روکنے کی پروا کئے بغیر چار پانچ روز بعد ہی وہ گاؤں سے لوٹ آیا۔

اس مرتبہ جب وہ اپنے نئے ہوٹل میں پہنچا تو ملک صاحب کا سیکرٹری اس کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کی کار میں ملک صاحب کی کوٹھی کی طرف جارہا تھا.....!

ملک صاحب نے اس کا استقبال اس طرح کیا جیسے وہ ملک کا منتخب وزیراعظم رہا ہو۔ اس کے اعزاز میں اچھی خاصی پارٹی کا اہتمام کیا گیا جس میں چیدہ چیدہ نوجوان مدعو تھے۔ یہ لوگ آپس میں خاصے بے تکلف تھے۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس پارٹی میں ہمارا موجود نہیں تھی۔

ملک صاحب کا خاص مہمان ہونے کے ناطے ہر نوجوان لڑکی اور لڑکا اس کی طرف متوجہ تھے۔ ہر کوئی اس سے بے تکلف ہونے میں لگا تھا۔

مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے لیکن ملک صاحب نے اسے علیحدگی میں گفتگو کے بہانے روکے رکھا اور رات دیر گئے تک وہ تنہائی میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے ارسلان کو باور کروادیا تھا کہ اس میں ایک بڑا سیاستدان بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ اگر وہ ذرا ہمت کرے تو زندگی اس کے قدموں تلے بچھ جائے گی.....!

ارسلان یہی تو چاہتا تھا.....!

اس روز جب وہ رات گئے ملک صاحب کی گاڑی میں ہوٹل کی طرف جارہا تھا تو اس کا دماغ ساتویں آسمان پر اڑ رہا تھا۔

جب کبھی اسے احساس ہوتا کہ ہمارا کبر نے اس کی محبت کو ٹھکرایا ہے تو اس کا خون کھولنے لگتا.....!

وہ ہر صورت ہمارا کبر کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ خود میں کوئی ایسی خوبی پیدا کرے کہ پھر ہمارے لئے سوائے اس کی طرف کھینچے چلے آنے کے اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہ جائے۔

قریباً ایک مہینے کے بعد ایک روز افتخار اس کے ہتھے چڑھ گیا۔

افتخار نے ہی سب سے پہلے وار کیا تھا۔ ارسلان نے اسے یونیورسٹی کے باہر دیوانہ وار پیٹ ڈالا۔ اس نے افتخار کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور ارسلان کے ساتھی اس کا ہاتھ روک لیتے تو شاید وہ افتخار کو جان سے ہی مار ڈالتا۔

بے ہوش افتخار کو کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر پھینکنے کے بعد وہ اپنے دوست کی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ موٹر سائیکل کا رخ شہر کی ماڈرن آبادی کے ایک بنگلے کی طرف تھا۔ موٹر سائیکل پر نظر پڑتے ہی چوکیدار نے مین گیٹ کھول دیا۔

موٹر سائیکل ایک کونے میں کھڑی کر کے دونوں برآمدے کی طرف چلے گئے۔ پھر ارسلان اپنے ساتھی کے تعاقب میں ڈرائیونگ روم میں داخل ہو گیا جہاں ایک آرام دہ صوفے پر ملک صاحب آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔

”ویل ڈن مائی بوائے! ویل ڈن! میں نے کہا تھا کہ تم آگے نکلو گے۔ تم میں بہت کچھ کر گزرنے کی سکت ہے۔“ انہوں نے بے تکلفی سے ارسلان کو گلے لگاتے ہوئے اس کے ماتھے کو بوسہ دیا۔

”ونڈر فل! بہت اچھا کیا تم نے۔ یاد رکھو اس ملک میں شریف آدمی کو بزدل اور..... کہتے ہیں۔ یہاں خود کو منوانا پڑتا ہے۔ بالی ہک یا بالی کرک..... جیسے بھی۔ یہ لوگ شرافت کی زبان نہیں سمجھتے۔ مجھے دیکھو میں بیس سال سے بکواس کر رہا ہوں۔ کوئی میری بات پر کان دھرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا۔ میری زبان ہی کسی کو سمجھ نہیں آتی۔ ٹھیک ہے اسمبلی کے الیکشن میں جیت جاتا ہوں لیکن مفت نہیں..... لاکھوں خرچ کرنے کے بعد..... اور یہ کوئی ”کرائی ٹیریا“ بھی نہیں۔ تم میری جگہ کسی عام آدمی کو لاکھوں روپے کی مدد سے اس ملک کا وزیر بنا سکتے ہو..... بہت اچھا کیا تم نے..... ان لوگوں کو جواب ملنا ہی چاہئے۔ ارے کوئی تو مائی کالا لایا ہو.....!“ وہ خاموش ہو گیا۔

”سرجی! ابھی تم ہم نے ارسلان صاحب کے اور بہت سے بدلے چکانے ہیں۔“ اس کے ہمراہی نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں؟ کیوں نہیں۔ ارے جب تک میں زندہ ہوں۔ کوئی تمہاری ہوا کی طرف نہیں دیکھ سکتا۔ جو تمہارا دل چاہے کرو میں سنبھال لوں گا۔ چیف منسٹر میری جیب میں پڑا ہے۔۔۔۔۔ اس بات کا علم آئی جی کو بھی ہے اور اس شہر کے ایس ایس پی کو بھی۔۔۔۔۔ اچھا ابھی میں چلتا ہوں۔ پولیس کے معاملات بھی سنبھالنے ہیں۔ تم لوگ آج رات یہیں رکنا رات تک میں پولیس کو سنبھال لوں گا۔۔۔۔۔ اور ہاں۔۔۔۔۔ ارسلان بیٹا! تم یہ رکھ لو۔“ اس نے اپنے بریف کیس سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر ارسلان کی طرف پھینک دیا۔ ”اور تم اختر میاں یہ رکھ لو۔“ اس نے چھوٹا ایک بنڈل اختر کی طرف پھینکا۔

ارسلان نے کچھ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا لیکن اختر نے جھپٹ کر بنڈل اٹھایا اور اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

”بھئی ہمارے مہمان کا خاص خیال رکھنا۔ اسے احساس ہونا چاہئے کہ ملک کا مہمان ہے۔“ اس نے اختر کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

”سرجی! آپ فکر ہی نہ کریں۔ ارسلان صاحب کو خوش کر دیں گے۔“ اختر نے بے حیائی سے دانت نکال دیئے۔

”عارفہ گھر پر موجود ہے۔ کھانا وغیرہ اس سے تیار کروا لینا۔“ جاتے جاتے اس نے رک کر اختر کی طرف دیکھا۔

”او کے سرجی!“

○

”یار! یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ پیسوں کی کیا ضرورت تھی؟“

ملک صاحب کے جاتے ہی ارسلان نے اختر سے کہا۔

”جان دے پاپے۔ جان دے۔ کیوں ہم غریبوں کے پیٹ پر بھی لات مروائے گا۔

پیارے تم تو انسان ہو۔ یہاں تو کتے بھی پیسے کے بغیر ڈھنگ کی زندگی نہیں جی سکتے۔ ارسلان صاحب! یہ سارا کھیل ہی مایا کا ہے۔۔۔۔۔ مایا کا۔۔۔۔۔ اب تم بڑے ”جوڑوں“ میں آ گئے ہو۔ چھوٹی چھوٹی باتیں سوچ کر ذہن کو پریشان نہ کیا کرو۔ ابھی آگے آگے دیکھو کیا کیا نظارے دکھاتا ہوں۔“

اس نے دوسرے کمرے میں رکھے فریج سے ایک بوتل نکالی اور گلاس اٹھا کر وہیں چلا آیا۔

”یہ کیا؟“ ارسلان نے کہا۔

”اس کے بہت سے نام ہیں پیارے اور کام بھی بڑے کرتی ہے۔ بڑا آدمی بننے کے لئے تو اس سے دوستی ناگزیر ہے۔“

اختر نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

”میں شراب نہیں پیوں گا۔“

ارسلان نے اپنی دانست میں بڑا مضبوط فیصلہ کیا تھا۔ یہ فیصلہ بھی ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ نہ نہ کرتے ہوئے بھی اس نے ایک گلاس چڑھا لیا۔

اس کے بعد اختر نے دی سی آر کا سوچ آن کر دیا اور اب جو فلم ٹی وی پر چل رہی تھی اس نے ارسلان کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ فلم کے خاتمے پر عارفہ کھانا لے کر آئی تو ارسلان کے ذہن کو شیطان نے اپنی مکمل گرفت میں لے لیا تھا۔

اسے احساس ہی نہ ہوسکا کہ کب کھانے کے بعد ان لوگوں نے سونے کا پروگرام بنالیا اور وہ عارفہ سمیت بیدروم میں پہنچ گیا۔ ساری رات شیطان اپنی فتح پر قہقہے لگا رہا۔ عارفہ تجربہ کار شکاری تھی۔ اسے تنخواہ ہی شاید اس بات کی دی جاتی تھی۔ صبح ہونے تک ارسلان کی پاکیزگی بھی خون ہو چکی تھی۔ آج اس نے وہ کھیل کھیل لیا جس کا عام حالت میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

صبح جب وہ اپنے کمرے میں اوندھے منہ سو رہا تھا تو اختر ملک صاحب کو یہ خوشخبری فون پر سنارہا تھا کہ شکاری پوری طرح جال میں پھنس چکا ہے۔

”مشن او۔ کے ہو گیا سرجی!“ اس نے فون پر کہا۔

”ونڈرفل! شاباش! بیچ کر نہ جائے بندہ بڑے کام کا ہے۔ اب آ گیا ہے تو اسے ہاتھ

سے نکلے نہیں دینا۔“

اس نے فون پر اختر کو ہدایت دی۔

”سرجی! آپ فکر ہی نہ کریں جی!“ اختر نے بے حیائی سے دانت نکالے۔ فون کا

سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ارسلان غسل خانے میں موجود تھا۔ جب وہ نہا کر باہر نکلا تو اس کا استقبال سب سے پہلے عارفہ نے کیا تھا۔ وہ بے تکلفی سے ارسلان سے لپٹ گئی تھی۔

ارسلان نے تو جیسے مکمل سرنڈر کر دیا تھا.....!

اختر کام کا بہانہ کر کے چلا گیا۔ اس کے بعد تمام معاملات عارفہ نے سنبھال لئے اور ارسلان دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر وہیں کا ہو رہا۔

یہی ملک چاہتا تھا۔

اس نے شام تک پولیس کے تمام معاملات پورے کر دیئے۔ وہ رات بھی اس نے ملک کے گھر بسر کی اور اگلے روز جب وہ صبح کے وقت وہاں سے رخصت ہو رہا تھا تو ملک کی طرف سے ملنے والی آدھی سے زیادہ رقم اس نے عارفہ کو انعام میں دے دی۔

یہاں سے وہ اس نصیحت کے ساتھ رخصت ہوا تھا کہ کبھی بھول کر بھی کسی سے یہ تذکرہ نہیں کرے گا کہ اس نے رات ملک صاحب کے کسی بنگلے پر بسر کی تھی یا ملک صاحب سے اس کی کوئی ملاقات بھی کبھی ہوئی تھی۔

○

یہ آغاز تھا.....!

ارسلان نے اس راستے پر اپنا سفر اتنی تیزی سے شروع کیا کہ کبھی اسے خود بھی شک نہ لگتا کہ وہ واقعی وہی ارسلان ہے.....!

اس نے پانچ چھ ماہ کے عرصے میں تھانے، پکھری، جیل سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ ہر جگہ اس کے اور قانون کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اخبارات چیختے چلاتے رہے کہ ارسلان کو ملک کی پشت پناہی حاصل ہے لیکن اخبارات کی ان خبروں کا رد عمل سوائے چند مذمتی بات کے اور کچھ نہ ہوتا۔

شراب اور شباب نے اسے اپنا اسیر بنا لیا تھا کہ اب اس کی رہائی مشکل نظر آتی تھی۔ درمیان وہ ہمارے لائق یا بے خبر نہیں رہا تھا۔ ہمارے پھانس کی طرح اس کے دل میں اٹک کر رہی تھی۔

یونیورسٹی اس کا جانا کبھی کبھی ہوتا تھا۔ اس دوران اس نے خاص طور پر یہ نوٹ کیا کہ ہمارے

نے سٹوڈنٹس پالیٹکس سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ اب ارسلان انقلابی سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری تھا۔ کبھی کبھی دونوں کا آپس میں ٹکراؤ ہوتا تو دونوں ہی ٹکڑ ٹکڑ ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔

اس روز تو ارسلان حیران ہی رہ گیا جب ہمارے کیرئیر دان اس کے ہوٹل میں ملنے آئی۔

”میں یونیورسٹی چھوڑ رہی ہوں۔“ اس نے ارسلان سے کہا۔

”اس اطلاع کا شکریہ لیکن آپ مجھ سے کس رد عمل کی توقع رکھتی ہیں؟“ ارسلان کا لہجہ

خاصا طنزیہ تھا۔

”تم بہت اونچے اڑ رہے ہو ارسلان! چھوٹی کشتیوں کو سمندر کے درمیان جانا زیب نہیں دیتا۔ اب بھی وقت ہے کنارے کی طرف لوٹ آؤ..... ہاں یہ بھی سن لو کہ اب تم کوئی بھی رد عمل ظاہر کرو گے تو اس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ اب تم میں موجود معصومیت اور حیا مرجی ہے۔ اب تم ہماری صف میں کھڑے ہو گئے ہو ارسلان۔ کاش تمہاری اور میری ملاقات کبھی نہ ہوئی ہوتی۔ میرے ضمیر کو یہی ایک خلش تڑپاتی رہے گی اس راستے پر تمہیں گامزن کرنے میں کہیں نہ کہیں میرا حصہ ہے..... ارسلان خدا کے لئے اب بھی وقت ہے لوٹ جاؤ۔ یہ سب فراڈ ہے۔ مجھے سب کچھ گنوا کر احساس ہوا ہے کہ یہ دھوکہ ہے دھوکہ..... تم دھوکے کی نگری کے مسافر بن چکے ہو..... یہ راستہ صرف ایک سمت کو جاتا ہے..... تباہی کی سمت.....“

اس کا گلارندہ گیا تھا۔ اس کے لئے بولنا محال ہو رہا تھا۔ بڑے صبر سے اس نے اپنے آنسو روک رکھے تھے.....!

”ارسلان! میں نے کوشش کی تھی کہ اپنا فرض نبھاتے ہوئے تمہیں تباہی کے اس گڑھے کی طرف بڑھنے سے روک لوں جس کی طرف تم برق رفتاری سے بڑھ رہے ہو لیکن..... افسوس میں نے دیر کر دی۔ خدا تمہاری حالت پر رحم فرمائے۔“ یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی باہر نکل گئی۔

”حاسد..... جل گئی سالی!“ اختر نے ارسلان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا۔

وہ اسے خبر دینے آیا تھا ملک صاحب نے اس کوئی موٹر سائیکل تحفے میں دی ہے اور اختر

اس کی چابیاں ہی اسے دینے آیا تھا۔

”تمہاری شہرت اس کو ہضم نہیں ہو رہی۔ تم نہیں جانتے اس عورت کو۔ آج تک کوئی

جھکا نہیں سکا۔ تم نے اسے نچا دکھا دیا ہے اور یہ معمولی بات نہیں۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے ارسلان کہ تمہاری کیا پوزیشن بن چکی ہے۔ اگلے الیکشن میں تمہیں کوئی بھی پارٹی ہاتھ باندھ کر ٹکٹ دے سکتی ہے۔ تم بس آگے کی سمت دیکھو۔ آگے دیکھو۔ آگے بڑھو۔ آگے نکلو۔ زندگی پلٹ کر دیکھنے والوں کو اندھا کر دیا کرتی ہے ارسلان.....!“ اختر نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا.....“ اور ہاں یار تم نے اس پر کیا جادو کر دیا ہے۔ ہر وقت تمہارا ذکر کرتی رہتی ہے۔ آج اس سے مل لینا ورنہ عارفہ مجھے معاف نہیں کرے گی۔“

دونوں اکٹھے ہی باہر آئے تھے.....!

نئی موٹر سائیکل اور عارفہ کے ساتھ شب ب سری.....!

ملک کا شکبہ اس کے گرد تنگ ہو رہا تھا! اس کی گرفت ارسلان کے حلقوم پر سخت ہو رہی تھی اور اسے احساس نہیں ہو رہا تھا۔

○

ملک کے گھر سے نکل کر وہ اپنی نئی موٹر سائیکل پر ہوٹل کی طرف آ رہا تھا۔ کالج روڈ کا چوک مڑتے ہی ایک سفید رنگ کی دیگن نے اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ اس تعاقب کا احساس ارسلان کو اس وقت ہوا جب اچانک ہوٹل کی سڑک گھومتے ہوئے دیگن اس کے بالکل سامنے آ گئی۔

موٹر سائیکل کو بریک لگاتے لگاتے وہ دیگن سے ٹکرا کر گر پڑا..... گرنے سے اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ اس نے غصے سے اٹھ کر کھڑا ہونا چاہا لیکن اچانک ہی سر پر لگنے والی ہانکی کی ضرب نے اس کو دن میں تارے دکھادیئے۔

اندھیرے میں ڈوبتے اس کے ذہن پر جو آخری منظر نقش ہوا وہ ان اجنبی اور شناسا چہروں کا تھا جو دیگن سے اتر کر ہاتھوں میں ہاکیاں تھامے اس پر حملہ آور ہوئے تھے۔

شاید ان میں سے ایک نے اپنے ہاتھ میں پتول بھی تھام رکھا تھا۔

ارسلان کو ہوش آیا تو وہ کسی زمین دوز کمرے میں فرش پر پڑا تھا۔

کسی نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تھے۔ اس کے سامنے پانچ نقاب پوش کھڑے تھے۔

”کون ہو تم؟“ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن پنڈلی پر پڑنے والی ضرب نے اسے دوبارہ زمین پر گرادیا۔

اس کے ساتھ ہی چاروں اس پر پل پڑے۔

انہوں نے ارسلان کو زیرِ تفتیش مجرموں کی طرح کمرے کی چھت سے لٹکتی دو لوہے کی زنجیروں میں باندھ لیا تھا۔ اس کی دونوں کلاںیاں زنجیروں سے بندھی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پاؤں میں ایسی ہی زنجیر ڈال دی گئی۔

اس دوران اغوا کنندگان نے اس سے اپنا تعارف کروا دیا۔

”تم کیا سمجھتے تھے کہ وہ حرامی کی اولاد ملک ہر جگہ تجھے بچالے گا۔ اسے کہو گورنر چیف منسٹر یا آئی جی سے کہہ کر تمہیں سزا سے بچالے۔ کتے کے پلے اتم نے افتخار کو مار ڈالا۔ ہم تمہارے ہاتھ تمہارے جسم سے الگ کر دیں گے۔“

ایک غصیلی آواز نے اسے گالیاں بکتے ہوئے کہا۔

ارسلان سمجھ گیا کہ وہ مخالف تنظیم کے قابو میں آ چکا ہے اور معافی مانگنے یا گڑ گڑانے پر بھی خیر کی کوئی توقع نہیں تھی۔

اس نے دیوانہ وار انہیں گالیاں دینا شروع کر دیں جس کے ساتھ ہی چاروں حسبِ توفیق اس پر ستم آزمائی کرنے لگے۔

اس درمیان میں وہ دوسرے بے ہوش ہوا لیکن ہر دفعہ ہوش میں لانے کے بعد وہ لوگ باقاعدہ ماہر ڈاکٹروں کی طرح اس کی نبض اور بلڈ پریشر چیک کرتے۔

ان کا لیڈر اس کے بعد جیل کے ڈاکٹروں کی طرح انہیں دوبارہ مار کٹائی کا سگنل دیتا اور

وہ اس پر تشدد کرنے لگتے۔

شام گئے تک یہ عمل جاری رہا۔

اس درمیان وہاں مختلف تنظیموں کے لوگ آتے جاتے رہے۔ وہ ارسلان سے ایک سفید کاغذ پر دستخط کروانا چاہتے تھے لیکن شام گئے انہیں یقین ہو چلا تھا کہ وہ مرتا مرنے لگا لیکن جیتے جی دستخط نہیں کرے گا۔

”ٹھیک ہے“ مہر“ لگا کر رہا کر دو۔ اگر یہ ہمارا مہمان بنا ہے تو ہماری نشانی لے کر ہی

واپس جائے۔“ ان کے لیڈر نے احکامات جاری کئے۔

کسی نے اس درمیان استری کا پلگ لگا دیا تھا۔ جب استری آگ کی طرح دہکنے لگی تو پلگ اتار کر اسے الگ کر لیا گیا۔

تشدد سے نیم بے ہوش ارسلان کی گالیوں پر کان دھرے بغیر ان میں سے ایک نے اس کی کمر سے قمیص پھاڑ کر الگ کر دی۔ دوسرے لڑکوں نے اس کی بے بسی پر ہتھکڑیاں لگایا۔

اس کے ساتھ ہی آگ کی طرح دہکنی استری اس کی کمر سے چپاں کر دی گئی۔ اس کے جسم سے کھال جلنے لگی تھی۔ اس کے منہ سے ذبح ہونے والے بکرے کی طرح زوردار آوازیں نکل رہی تھیں۔ بمشکل ایک منٹ کی اذیت وہ برداشت کر سکا۔ پھر بے ہوش ہو گیا۔

بے ہوش ارسلان کو ان لوگوں نے سٹریچر پر ڈالا اور اندھیرے میں کھڑی ایک ایسولینس تک لے آئے۔ سٹریچر ایسولینس میں منتقل کرنے کے بعد انہوں نے ایسولینس سٹارٹ کی جس کا رخ نزدیکی ویران سڑک کی طرف تھا۔ ارسلان کو نہ تو آتے ہوئے اور نہ ہی یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے علم ہوا کہ اسے کہاں لایا گیا ہے اور کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ سڑک کے ایک ویران گوشے میں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کے نزدیک انہوں نے ارسلان کو گندگی کی طرح پھینکا اور رفو چکر ہو گئے۔



شکار اور شکاری

ملک پائپ منہ سے لگائے ٹیلی فون کے نزدیک ہی بیٹھا تھا۔ جب اچانک فون کی گھنٹی بجی۔

”ہیلو.....!“ دوسری طرف اختر مخاطب تھا۔

”سر جی! کام ہو گیا۔ بالکل آپ کے حکم کے مطابق میں نے ان کے خاص آدمی کو فون پر مطلع کر دیا تھا کہ ارسلان کدھر جا رہا ہے۔ انہوں نے اسے کالج روڈ کے قریب ہی قابو کر لیا۔ موٹر سائیکل وہیں پڑی رہی اور وہ اسے اپنے ”انٹیر وگیشن سنٹر“ میں لے گئے تھے۔“

”تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا بکواس کر رہے ہو؟“

ملک آج بالکل بد لے ہوئے لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

”خدا کی قسم سر جی! میں نے ان لوگوں کو اپنی آنکھوں سے ارسلان کو اغوا کرتے دیکھا

تھا۔“

اختر پالتو کتے کی طرح مالک کی وفاداری میں دم ہلا رہا تھا۔

”ویل ڈن! شاباش۔ خوش کر دیا۔ اب میں دیکھوں گا۔ اب کھیل کا مزہ آئے گا۔“

کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے سٹڈی روم میں موجود تھا جہاں ایک مقامی اخبار کارپورٹر اس سے طلباء سیاست میں تشدد کے رجحان پر انٹرویو لے رہا تھا اور ملک بڑھ چڑھ کر اس تشدد کے رجحان کی نفی میں دلائل پیش کر رہا تھا۔ اس کے کہنا تھا اگر جلدی ہی اس عفریت پر قابو نہ پایا گیا تو یہ درسگاہوں کے سکون کو نگل جائے گی پھر کالجوں کو جانے والے بچوں کی زندگیوں کی ضمانت کوئی نہیں دے سکے گا۔

اس نے مروجہ تشدد کی ساری ذمہ داری مقامی انتظامیہ اور ایک طلباء تنظیم پر عائد کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان لوگوں نے درسگاہوں کو بد معاشی کے اکھاڑے بنا کر ان کے تقدس کو نگل لیا ہے۔

انٹرویو کے خاتمے پر جب متعلقہ رپورٹر باہر نکلا تو ملک کا سیکرٹری بھی اس کے ساتھ ہی باہر تک آیا تھا۔ وہ رپورٹر کو اپنی گاڑی میں اس کے اخبار کے دفتر چھوڑنے جا رہا تھا۔

”سرجی یہ رکھ لیں۔“ اس نے تھوڑی دور جا کر ڈیش بورڈ میں رکھا ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ کیا.....؟ ارے اس کی کیا ضرورت تھی۔“ رپورٹر نے بے شرمی سے دانت نکالتے ہوئے لفافہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

”اوجی! یہ تو جناب آپ لوگوں کا حق ہے۔ دیکھئے نا! اگر آپ مہربانی نہ کریں تو ہم لوگوں کو کون پوچھے گا.....!“

سیکرٹری اس سے بھی زیادہ بے شرم دکھائی دے رہا تھا۔

○

ملک اپنے کمرے میں ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔

”ہیلو.....!“ اس نے معمول کے مطابق نہایت مہذب قسم کی آواز نکالی۔

”اپنے ہاتھ کو میس روڈ کے کوڑے کرکٹ والے ڈرم سے وصول کر لو اور ہاں خیال

رکھنا ایک روز ہم تمہارا بھی یہی حشر کریں گے۔“ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے مغلظات کا طوفان ابلنے لگا۔

کیا مجال جو گالیاں سن کر ملک کے ماتھے پر شکن بھی آئی ہو۔ ایک مکارانہ ہی مسکراہٹ

البتہ اس کے ہونٹوں سے چپک گئی۔

”بیٹے! تم کون ہو؟ کیا بات کر رہے ہو؟ بھیج مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ ارے دیکھو برخوردار بزرگوں کو گالیاں نہیں دی جاتیں.....!“

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی رابطہ کٹ گیا۔

ملک کی آنکھوں میں شیطانی چمک بیدار ہو گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی دوسرا فون اٹھایا۔

اب وہ کسی اخبار کے دفتر میں سلامی صاحب کو تلاش کر رہا تھا۔

”جی سلامی صاحب! آپ کا خادم بول رہا ہوں۔“

”جناب خادم تو ہم ہیں آپ کے بلکہ ہم تو ساری قوم کے خادم ہیں۔“ سلامی کی مریل

سی آواز سنائی دی۔

”بھی فوراً اپنا فون نوگرافر اور رپورٹر میسن روڈ کے کارز پر جو کوڑا کرکٹ پھینکے والا ڈرم

ہے وہاں بھیج دو۔ ایک اہم خبر تمہاری منتظر ہے اور ہاں تصاویر سمیت زوردار سرخیاں لگا کر خبر دینا۔

بس دکھا دو اپنی صحافت کا کرشمہ!“

ملک کی آواز سے خوشی ٹپک ٹپک پڑتی تھی۔

”جناب فکر ہی نہ کریں۔ نوکر کیا اور خرچہ کیا! وہ میرا پلاٹ والا معاملہ.....!“ سلامی نے

ٹیلی فون کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

”سلامی صاحب آج تک آپ کا کون سا کام رکا ہے۔ ارے ہم تو یاروں کے یار

ہیں۔“ ملک نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر فون بند کر دیا۔

اس نوعیت کا فون ملک نے ایک اور اخبار کے دفتر میں بھی کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے

اختر سے کہا کہ اپنے دوستوں کے ساتھ جا کر ارسلان کو اٹھالائے۔

لیکن.....!

ان لوگوں کو بھی خاص ہدایت دی گئی تھی کہ وہ فون نوگرافروں کے کام میں رکاوٹ نہ

ڈالیں، بھلے طبی امداد لیٹ ہو جائے۔

پولیس، طلباء اور اخبار والے اکٹھے ہی جائے حادثہ پر پہنچے تھے اور سب تن من سے اپنے

اپنے کام میں مصروف تھے۔

ارسلان کو اس کے ساتھی فوراً نزدیکی ہسپتال لے گئے۔ اخبارات والوں نے اپنا کام شروع کر دیا اور پھر پولیس نے انقلابی سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سیکرٹری اطلاعات ملک اختر نواز کا بیان قلمبند کرنا شروع کر دیا۔ جس نے اس حملے کی ساری ذمہ داری مخالف تنظیم پر ڈال کر اس کے چار پانچ متحرک کارکنوں کے نام ایف آئی آر میں بطور ملزمان لکھوا دیئے تھے۔

صبح کے اخبارات نے یہ خبر نمایاں طور پر شائع کی تھی۔ طلباء برادری میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ ملک کی ہدایت پر ایک جلوس آئی جی کے دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ آئی جی تک جلوس پہنچے ان کے فون کی کھنٹی بجی۔

آئی جی صاحب نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف مشہور اور معتبر سیاسی رہنما ملک صاحب لائن پر آ گئے۔

”آئی جی صاحب! بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ کی تشریف آوری کے بعد محض ایک ہفتے میں یہ چوتھا واقعہ ہے۔ اگر آپ لوگوں کو میری نکو اس پر کان دھرے ہوتے اور پہلے ہی حادثے پر ملزمان کو کیفر کردار تک پہنچایا ہوتا تو یہ نوبت ہرگز نہ آتی.....!“

”ملک صاحب ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اگر سختی کریں تو بھی آپ لوگ ہمارے خلاف بیان بازی شروع کر دیں گے۔ میرے پاس کوئی جادو کی چمڑی نہیں ہے نہ والدین کا چراغ ہے.....!“

”آئی جی صاحب! ذرا سنبھل کر بات کیجئے۔ ٹھیک ہے ہوم منسٹر سے آپ کی رشتہ داری ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ عوامی نمائندوں کی بے عزتی شروع کر دیں۔ میں کچھ نہیں جانتا! آپ کو آج شام تک بہر صورت ملزمان کو گرفتار کرنا ہوگا اور ہاں اگر شام تک آپ کوئی کرشمہ نہ دکھا سکے تو یہ معاملہ یہاں نہیں رکے گا۔ میں چیف منسٹر سے بات کروں گا۔ آئی جی صاحب! آپ نے جمہوریت کو مذاق سمجھ رکھا ہے کیا؟“

اس نے آئی جی کی بات کاٹ کر غصے سے کہا۔

”دیکھئے ملک صاحب! میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں اور اس میں رشتہ داری کا کیا

معاملہ آن پڑا۔ میں نے انکار نہیں کیا۔ اگر پولیس امن وامان نہیں چاہے گی تو کون امن وامان سے زندہ رہ سکے گا؟ آپ مطمئن رہئے، میں انشاء اللہ کوشش کر رہا ہوں۔“

آئی جی کا دل تو چاہتا تھا کہ اس کا منہ نوچ لے لیکن مصلحت نے اس کی زبان پر تالا لگا دیا تھا۔

آئی جی صاحب ایمان دار آدمی تھے لیکن بد قسمتی سے ہوم منسٹر کے رشتہ دار بھی تھے جن کا تعلق ملک صاحب کی مخالف پارٹی سے تھا اور آئی جی صاحب اندازہ لگا سکتے تھے اس ”ایٹو“ پر ملک جیسے سیاست دان کیا طوفان نہیں کھڑا کر سکتے۔

ملک کا فون ابھی بند ہی ہوا تھا جب آئی جی صاحب کا دفتر طلباء کے نعروں سے گونجنے لگا۔ ایک مرتبہ پھر ان کے امتحان کا وقت آ گیا تھا۔ انہوں نے اپنی ٹوپی سنبھالی، طلباء کے نمائندوں کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔

پھرے ہوئے طلباء کا مطالبہ تھا کہ آئی جی ان سے باہر آ کر مذاکرات کرے۔ بادل خواستہ آئی جی کو باہر آ کر بات کرنا پڑی۔ ان کی قوت برداشت کا ہر طرح سے امتحان لیا گیا لیکن ان کے پاس سوائے ضبط کے اور چارہ بھی کیا تھا۔ آئی جی صاحب نے ہجوم کو یقین دلایا کہ شام تک وہ ملزموں کو گرفتار کر لیں گے۔ ہجوم کی طرف سے شام تک گرفتاری نہ ہونے کی صورت میں دوبارہ ہنگامہ آرائی کی دھمکیاں دی گئیں۔

شام تک انتظامیہ کے دباؤ پر آئی جی نے پرچے میں نامزد بے گناہ ملزمان کو گرفتار کر ہی لیا۔

اگلے روز جب انہیں ریمانڈ لینے کے لئے عدالت میں پیش کیا گیا تو چاروں ملزمان کے وکیلوں نے حادثے کے وقت ان کی مصروفیات اور جگہ ثابت کر دی۔ دو چار روز جیل میں رہنے کے بعد ان کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

ارسلان کے زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو رہے تھے۔

اس کے والد نے اس کی گھٹیا حرکتوں کے پیش نظر اس کی شکل دیکھنے سے بھی انکار کر دیا

تھا۔

ایک ماں کی ذات تھی یا پھر بھائی اور بہن جو اس روگ کے خود بھی روگی بن رہے تھے اور ان سب سے بڑھ کر ہمارا کبر شیر وانی تھی جس نے ارسلان کی خدمت جی جان سے کی۔ وہ رورو کر ہاتھ باندھ کر اس کی منتیں کرتی رہی کہ وہ اس راستے سے لوٹ جائے۔

لیکن.....!

ارسلان نے لوٹ جانے کے لئے یہ راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ تو زندگی کی دوڑ میں دیوانہ وار آگے نکلتا چاہتا تھا۔ خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنا پڑے۔

ملک اور اس کا شیطانی گردہ اس سے چمٹا رہا۔ وہ لوگ تیمارداری کے ساتھ ساتھ انتقام کے جراثیم اس کے خون میں انجیکٹ کرتے رہے اور جب وہ صحت مند ہو کر واپس آیا تو ملک نے اس کو ہوشل جانے سے منع کر دیا۔ اس کی رہائش کا خصوصی بندوبست کیا گیا تھا۔

کلاشکوف اس کے ہاتھوں میں تھادی گئی تھی!

اس کے ذہن میں انتقام کا لاوا پک رہا تھا!

عارف اس کے الاؤ کی پیش بڑھانے کے لئے اس کے پہلو سے چمٹادی گئی تھی۔

○

اس روز وہ ملک کے گھر ایک اہم میٹنگ کے لئے اکٹھے ہو رہے تھے۔ وہ پانچ تھے۔ ارسلان، اختر رفیق اور دو ملک کے فراہم کردہ غنڈے! انہیں ایک اہم مشن سونپا جا رہا تھا۔

”حافظ عابد اس شرارت کی جڑ ہے۔ جب تک یہ شخص زندہ ہے تمہیں چین کی زندگی نہیں جینے دے گا۔ اس کے جیتے جی یونیورسٹی کا کوئی ایکشن تم نہیں جیت سکتے۔ اسے مار ڈالو.....“

ملک کا لہجہ خونخوار ہو رہا تھا۔

”بالکل ٹھیک کہہ سرجی! بالکل ٹھیک۔ میں تو آپ سے ہمیشہ یہی کہتا آیا ہوں کہ پاگل کو نہیں اس کی ماں کو مارو۔“ اختر مکاری کی تصویر بنا بیٹھا تھا.....!

”درخت کی جڑوں کو کاٹ ڈالو بیٹا! ٹھنڈیاں سوکھ کر گر جائیں گی اور یہ جو پتے ہیں ناں..... یہ تو ہوا کا جھونکا برداشت نہیں کر پائیں گے، خشک ہو جائیں گے اور تم جانتے ہو خشک پتے

معمولی ہوا میں بکھر جاتے ہیں۔“

ملک کسی عفریت کی زبان میں پھنکار رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ ارسلان ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”جذباتی نہیں بننا بیٹا! ذرا سنبھل کے۔ پلاننگ کے ساتھ اور ہاں خطرہ مول لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کام مکمل ہوتے ہی نکل جاؤ۔ اگر گرفتاری ناگزیر ہوگی تو یہ دونوں گرفتاری دیں گے۔“

اس نے قربانی کے دونوں بکروں کی طرف اشارہ کیا جنہوں نے اطاعت میں گردن جھکا دی۔

چند روز بعد وہ عابد کی ایک جگہ موجودگی کی اطلاع پر ایک ویگن میں مسلح ہو کر عازم سفر تھے۔ وہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے صدر حافظ عابد کو قتل کرنے جا رہے تھے تاکہ خوف دہشت اور غنڈہ گردی کے ذریعے اگلے ایکشن میں کامیابی حاصل کر سکیں۔

○

مقامی کالج میں ایکشن قریب آ رہے تھے۔ حافظ عابد طلباء تنظیم کا صدر تھا اور اس کالج میں اپنی تنظیم سے متعلق انتخابات میں حصہ لینے والے پینل کی انتخابی مہم کے سلسلے میں ایک جلسہ سے خطاب کرنے آیا تھا۔ ان لوگوں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں اور جانتے تھے کہ ارسلان اپنی پیٹھ پر لگے گھاؤ کو دیکھ کر اکثر تلملاتا ہوگا۔

انہیں علم تھا کہ ارسلان جیسے نوجوان جب ملک صاحب جیسے لیڈروں کے ہتھے چڑھ جائیں تو پھر ان کی سوچ اپنی سوچ رہتی ہے نہ ان کا جسم اپنا جسم رہتا ہے۔ ان کو پھر ملک جیسے گھاگ اور شاطر کھلاڑی اپنی انگلیوں کے اشارے پر نچاتے ہیں۔

کالج کی گراؤنڈ مین گیٹ کے سامنے نظر آ رہی تھی جہاں حافظ عابد کی تنظیم کا انتخابی جلسہ ہو رہا تھا لیکن اس بات کا علم بہت کم لوگوں کو تھا کہ ان کے ساتھیوں نے کالج کی چھت پر مورچے قائم کر رکھے تھے اور وہ کسی بھی ناگہانی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔

جلسے کے آغاز سے پہلے ہی انہوں نے کالج کی چھت پر مورچے باندھ لئے تھے.....!!

○

وہ کسی ناگہانی آفت کی طرح نازل ہوئے تھے۔ سب سے پہلے ڈرائیور کے ساتھ والی

سیٹ پر موجود ارسلان باہر نکلا اور حافظ عابد کو گالیاں دیتا ہوا سٹیج کی طرف لپکا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ساتھیوں نے دین سے نکل کر اندھا دھند ہوا میں گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ حملہ آور شاید اس ”کاؤنٹر حملے“ کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ انہیں لینے کے دینے پڑ گئے کیونکہ بلندی سے گولیاں برسائے والوں کو ان پر ہر لحاظ سے برتری حاصل تھی۔

ملک صاحب کے فراہم کردہ دونوں غنڈے تو پہلی ہی بوچھاڑ پر دم دبا کر بھاگ نکلے یوں بھی ان کا کام اب ختم ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ لڑائی کا آغاز کروانا تھا۔ اس کے بعد دونوں پارٹیاں آپس میں غشیں۔ ان کا دوسرہ نہ تھا۔

ملک بڑا گھاگ سیاست دان تھا۔ معمولی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر وہ اس مقام تک پہنچا تھا۔ اسے علم تھا کہ طلباء کی کسی ہنگامہ آرائی میں کسی غیر طالب علم کی گرفتاری کیا گل کھلا سکتی ہے۔

عین ممکن تھا گرفتار ہونے والے دوسری پارٹی کے ہاتھوں پکڑے جاتے یا پولیس تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے اصلیت بک دیں اور اس کا سارا سیاسی کیریئر داؤ پر لگ جائے۔ اس نے تو ان دونوں کو صرف ارسلان کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ساتھ کیا تھا ورنہ تو اصل کام ارسلان نے ہی کرنا تھا۔

طالب علموں میں بھگدڑ مچ گئی.....!

اپنی جانیں بچانے کے لئے جس کا منہ جدھر اٹھا وہ بھاگ نکلا۔ خوفزدہ اور سہمے ہوئے بے چارے شریف اساتذہ مختلف کمروں میں اپنی جانیں چھپائے ہوئے تھے۔ کسی کو اتنا ہوش نہیں تھا کہ وہ پولیس کو ٹیلی فون ہی کر دیتا۔

شاید ان لوگوں کو علم تھا کہ کالج سے بمشکل پندرہ بیس گز دور موجود پولیس کے ٹرک اگر اپنی جگہ سے اس ہنگامہ آرائی کے باوجود جنبش نہیں کر سکے تو ان کے ٹیلی فون سے ان کی ٹانگوں میں حرکت آنے سے رہی۔

ارسلان کی نظریں حافظ پر جمی تھیں اور وہ پستول تھاے اس کے تعاقب میں لپکا۔ عین اس مرحلے پر جب حافظ عابد اس کی ریخ میں تھا اس نے پستول سیدھا کیا تو ارسلان کی ماں ایک سوال بن کر سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”بیٹا! عابد نے تمہیں اور تمہاری بہن کو قرآن پڑھایا ہے۔ ہم ساری زندگی صرف ایک احسان کا بدلہ نہیں اتار سکتے۔ اگر خدا نخواستہ تم نے کبھی اس کی بے عزتی کی تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔“

اس نے ہسپتال میں اس وقت ارسلان کو کہا تھا جب وہ اپنی عیادت کو آئے حافظ عابد صاحب سے الجھنے لگا تھا۔

’نجانے کیوں چاہتے ہوئے بھی وہ حافظ عابد پر فائر نہ کر سکا۔

لیکن.....!

یہ کیا.....؟

حافظ عابد تو اپنا پہلو تھامے زمین پر گر پڑا تھا۔ اس نے تو گولی نہیں چلائی، پھر یہ گولی کس نے چلائی؟ ارسلان گڑبڑا کر رہ گیا۔ اس کے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ شاید چھت پر موجود حافظ عابد کے ساتھیوں نے اسے گولی کھا کر گرتے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے دیوانہ وار فائرنگ شروع کر دی تھی۔ وہ راستے میں آنے والی ہر شے کو تباہ کرنے پر تل گئے تھے۔

”بھاگو.....!“

اچانک ہی کسی طرف سے نکل کر نواز نے اس کا بازو تھاما اور جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچا۔

ارسلان جیسے خواب غفلت سے اچانک ہی بیدار ہوا تھا۔ یہ احساس کہ اس سے چند گز پر حافظ عابد کی لاش خون میں لت پت پڑی ہے اس کے لئے بہت جان لیوا تھا۔

یہ وہی حافظ عابد تھا جس نے انگلی پکڑ کر مسجد کا راستہ دکھایا تھا۔ حافظ عابد اس سے عمر میں تو زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن اس کے گھر میں حافظ عابد کا احترام بزرگوں کی طرح کیا جاتا تھا۔ اسے قرآن پڑھانے والا محترم نوجوان آج گھناؤنی سیاست کی بھیبت چڑھ گیا تھا۔ یہ خلش تو اسے مار ڈالے گی۔ اس نے سوچا۔

دین تک نواز اسے قریباً کھینچتا ہوا لایا تھا۔ دونوں کسی طرح اوپر سے ہونے والی فائرنگ سے بچتے بچاتے بمشکل دین تک پہنچے تھے جس کی ڈرائیونگ سیٹ اختر نے سنبھالی تھی۔ گولیوں سے دین چھلٹی ہو رہی تھی۔

انہیں حیرت ہو رہی تھی کہ ابھی تک اختر زندہ کیسے رہا؟

دین کا انجن سٹارٹ تھا۔ دونوں بھاگ کر دین میں سوار ہوئے تھے۔ ٹریفک سڑک پر گولیوں کی آواز سے بند ہو چکی تھی۔ سڑک کے دوسری طرف پولیس کے جوان ہاتھوں میں رائفلیں پکڑے ٹرکوں پر سوار محو تماشہ تھے۔ ارسلان کے لئے حیرانگی کی بات تو یہ تھی کہ کسی نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

اختر دین کو دیوانہ وار چلاتا ہوا مطلوبہ جگہ تک لے آیا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق انہیں دین اسی جگہ چھوڑ دینی تھی جہاں وہ پہنچے تھے۔ یہاں سے دو موٹر سائیکلوں پر انہیں الگ الگ راہ فرار اختیار کرنی تھی۔

ایک موٹر سائیکل پر اختر اور ارسلان اور دوسری پر نواز۔ دونوں الگ الگ سمتوں میں فرار ہو رہے تھے۔ اپنا اسلحہ انہوں نے یہیں چھوڑ دیا تھا۔ احتیاطاً پستول اختر نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

موٹر سائیکل کا رخ اسی جنگل کی طرف تھا جہاں وہ اکثر عارفہ کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ نواز ان سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکا تھا۔

”ویل ڈن مائی ڈیر بوائز ویل ڈن.....! یہاں آتے ہی فون پر انہیں ملک صاحب کی طرف سے اس ”کارنامے“ پر مبارکباد مل گئی۔

شام کی خبروں سے انہیں حافظ عابد کی موت کا علم بھی ہو گیا تھا۔

ارسلان کے دل و دماغ کو اس خبر سے ایک دھچکا سا لگا۔ اسے اپنا دل بیٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں جیسے آہستہ آہستہ کوئی اسے مٹھی میں لے کر دبا رہا ہو۔ اپنی ٹانگوں سے اسے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

ایک بے نام سا چچھتاوا اس کی جان کو آ گیا تھا۔

اس نے حافظ عابد پر گولی نہیں چلائی تھی لیکن وہ خود کو اس کا قاتل تصور کر رہا تھا۔

ساری رات عارفہ اور شراب اس کا غم غلط کرتے رہے۔ اس مرتبہ ملک صاحب نے ان کے لئے عارفہ جیسی اور فاحشاؤں کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔

شراب اور شباب کے نشے نے ارسلان کو مدہوش کر دیا تھا۔ جلد ہی وہ نیند کی آغوش

میں سا گیا۔ جہاں ایک مرتبہ پھر حافظ عابد کی بے گناہ لاش ایک سوال بن کر اس کے لاشعور کو ڈسنے لگی۔

دو تین مرتبہ وہ ہڑبڑا کر اٹھا لیکن عارفہ نے اسے سنبھال لیا۔

○

حافظ عابد کی شکل میں مخالف تنظیم کو اس سال کا سب سے بڑا شہید اور سب سے اہم ”ایشو“ مل گیا تھا۔

انہوں نے حملہ آور تنظیم کے چھ اہم لیڈروں کے نام طرمان کی فہرست میں درج کروا کر یہ الزام بھی دہرا دیا تھا کہ حملہ آوروں کو ملک صاحب کی سیاسی جماعت کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ اس کا جواب ملک صاحب کی بجائے ان کی سیاسی جماعت کے پراپیگنڈہ میکر ٹری نے شام کو ایک ہنگامی پریس کانفرنس میں دیا۔ اس پریس کانفرنس میں قریباً ہر قابل ذکر اخبار کارپورٹر اور کیمرہ مین موجود تھا اور پریس کانفرنس کے خاتمے پر ”حصہ بقدر جش“ کے مصداق ہر کسی کو اس کی حیثیت کے مطابق نذرانہ دے دیا گیا تھا۔

ملک صاحب اس ملک میں سیاست کرنے کے تمام ”آداب“ سے آگاہ تھے۔ وہ معمولی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر اس مقام تک یونہی نہیں پہنچ گئے تھے۔

پریس سے بہترین تعلقات..... ان کا نصب العین تھا اور اس کی ہر ممکن قیمت وہ ادا کرنے کو تیار رہتے تھے۔

ان کی جماعت کی طرف سے جاری وضاحت اگلے ہی روز قریباً تمام اخبارات کے صفحہ اول پر نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی جب کہ مخالف تنظیم کے مقتول نوجوان کی خبر کہیں اندر کے صفحات میں لگا دی گئی تھی۔

یہ تو نوجوانوں کے جذبات کو بھڑکانے والی بات تھی۔

دو پہر تک شہر کی سڑکوں پر ہزاروں طالب علم جمع ہو کر ”عابد شہید کا راستہ ہمارا راستہ“ کے نعرے بلند کرتے پہلے تو آئی جی صاحب کے دفتر کی طرف بڑھے۔ آئی جی صاحب اس سے پہلے ہی وزیر اعلیٰ کے طلب کرنے پر ان کے ہاں ایک ہنگامی اجلاس میں شرکت کرنے تشریف لے جا چکے تھے۔ یہاں ان لوگوں نے جی بھر کے پولیس اور انتظامیہ کا ماتم کیا۔ جب کسی طرح ان کے

سیاست اور.....

ان کا رخ شہر کے سب سے بڑے اخبار کے دفتر کی طرف تھا۔ دفتر کے سامنے بسیں روک کر انہوں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ڈنڈے اور ہاکیاں سنبھالیں اور اخبار کے دفتر میں جا گھسے جب کہ ان کے چند ساتھیوں نے دفتر کے باہر کھڑے ہو کر ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ ڈنڈا بردار فورس نے اخبار کے دفتر میں گھس کر ہر قابل ذکر شخص کو توڑنا شروع کر دیا۔ اس اثناء میں جو کوئی اخباری ملازم ان کے ہتھے چڑھا اس کی بھی انہوں نے اچھی طرح دھنائی کر دی۔ وہ جنونیوں کی طرح اخبار کے مالکان کو گالیاں بکتے اپنے کام میں مصروف تھے۔ عملے کے ہر قابل ذکر رکن نے ہاتھ روم یا میزوں کے نیچے چھپ کر جان بچائی تھی۔ اخبار والوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ کم از کم اخبار پر حملے کی اطلاع سن کر پولیس ضرور حرکت میں آ جائے گی لیکن آدھ گھنٹے تک پولیس کی طرف سے صرف تسلیاں ہی ملتی رہیں۔

جب حملہ آور اپنا کام مکمل کر کے اطمینان سے فرار ہو گئے تو پولیس کے مشہد جوان ٹرکوں میں سوار موقعہ واردات پر پہنچ گئے۔ شاید وہ اس موقع کے منتظر تھے کہ کب حملہ آور فارغ ہوں اور وہ ان کی جگہ سنبھالیں۔

پولیس فورس کی کمان ایس پی صاحب فرما رہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی پولیس کے

طیش دلانے پر بھی صورت حال جوں کی توں رہی تو جلوس کی طرف سے پولیس پر پتھراؤ شروع ہو گیا۔ جواب میں مجبوراً پولیس نے اشک آدرگس استعمال کی۔ جب معاملہ اس پر بھی کنٹرول نہ ہوا تو ہوائی فائرنگ کی نوبت آ گئی۔

عین ان لمحات میں جب پولیس اور طلباء کے درمیان شہر کی سڑکوں پر آنکھ بھولی ہو رہی تھی یونیورسٹی اور کالج کی یونیوں کی چار بسوں پر سوار کچھ طلباء اپنے مشن پر الگ سے چل پڑے تھے۔



نوں کو عمارت گھیرے میں لینے کا حکم دیا۔ پولیس کے مسلح دستوں نے تباہ شدہ عمارت کو گھیرے لے کر اس میں چھپے ہوئے خوفزدہ اور زخمی لوگوں کو مقید کر دیا۔

اخبار کے مالک خوش قسمتی سے اپنے دولت خانے پر تشریف فرما تھے۔ جب ان کو اس دات کی خبر کی گئی تو وہ بھی بھاگ بھاگ دفتر پہنچے۔ ان کے چیتنے چلانے پر پولیس والوں نے کل زخمیوں کو ہسپتال پہنچانے کی اجازت دی ورنہ وہ تو موقعہ واردات سے کسی بھی ”کارآمد کلیو“ دھرا دھر کرنے کی اجازت دینے پر تیار ہی نہیں ہو رہے تھے۔

”اب آپ لوگ کیا جھک مارنے آئے ہیں؟ حملہ آور تو اپنا کام کر کے چلے گئے!“ اخبار کے مالک نے ایس پی کے منہ کے سامنے ہاتھ نہاتے ہوئے کہا۔
”دیکھیے جناب! ٹھیک ہے آپ بڑے لوگ ہیں۔ آپ کے تعلقات اعلیٰ حکام سے ہوں گے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ سرکاری ملازمین کی بے عزتی شروع کر دیں۔“ ایس پی کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ دبنے والا نہیں ہے۔

اخبار کے مالک نے ”چھوٹے ملازم“ کے منہ لگنا پسند نہیں کیا اور منہ دوسری طرف پھیر

تھوڑی دیر میں پولیس اور اعلیٰ حکام بھی موقعہ واردات پر پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ اس ن پولیس نے حملہ آوروں کے ڈنڈوں اور ہاکیوں سے فوج جانے والے اخباری کارکنوں کی ریح انکوائری شروع کر دی کہ گویا یہ کارنامہ انہوں نے ہی انجام دیا۔ اخباری ملازمین نے اس دودھ روپے کے خلاف بطور احتجاج پولیس کو بیان دینے سے انکار کر دیا تھا۔

”جناب والا! جب آپ پولیس سے تعاون نہیں کریں گے تو ہم ملزموں کو گرفتار کیسے کر گے.....!“ ایس پی صاحب نے ملازمین کے اس رویے پر شاکی لہجے میں اخبار کے مالک سے کہا۔

اخبار کے مالک کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس کا ٹینٹو آبادے۔ وہ لوگ بجائے ہمدردی ان کے زخموں پر نمک چھڑک رہے تھے۔ بس ایک ملک صاحب تھے جنہوں نے دل و جان اس حادثے پر صدمے کا اظہار کیا تھا اور ایک ایک کارکن کے پاس جا کر اپنے دلی رنج و غم کا نمونہ پیش کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی حملہ آور تنظیم کے خلاف ڈٹ کر بیان دیا تھا اور

یہ بھی کہا تھا کہ سیاست میں تشدد کا جو سیلاب اٹھا چلا آ رہا ہے اس کی واحد وجہ اس جماعت کے لوگوں کی غیر اخلاقی اور غیر قانونی کارروائیاں ہیں۔

ملک صاحب نے ہسپتال میں داخل اس اخبار کے چاروں زخمی کارکنوں کی خود عیادت کی تھی اور چاروں کے لئے اپنی جیب سے دو لاکھ روپے کی امداد کا اعلان بھی کیا تھا۔
ان کے ایسے ہی ”انتہائی اقدامات“ نے کارکنوں کے دل موہ لئے۔ اگر کسی کے دل میں ملک صاحب کے خلاف کچھ بغض تھا تو وہ بھی اب ختم ہو چکا تھا۔

حملہ آوروں نے جاتے ہوئے اخبار کی انتظامیہ کو وارننگ دے دی تھی کہ اگر انہوں نے آئندہ بھی اپنی اصلاح نہ کی تو وہ اس سے بھی زیادہ سخت قدم اٹھانے پر مجبور ہوں گے۔ شہر کے دوسرے اخبارات کے ملازمین اور مالکان کو فون کر کے انہوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ اس ایک مثال سے ہی سبق حاصل کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہوگا بصورت دیگر ان کے ساتھ بھی یہی تاریخ دہرائی جاسکتی ہے۔

○

اخبار کے مالک کی اٹک شوٹی کے لئے صوبے کی متعدد شخصیات گاڑیوں کے جلوسوں میں آ جا رہی تھیں لیکن کوئی بھی حملہ آوروں کو فوری سزا دینے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔
اخبار کے مالک نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ سیاسی لوگ ہیں اور مفادات کی جنگ میں کسی تیسرے فریق کا بوجھ اٹھانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ وہ کسی نہ کسی سطح پر مفادات پر سمجھوتہ کر سکتے تھے اور اخبار کی حیثیت گندی سیاست کے اس بازار میں نہ ہونے کے برابر تھی۔

اگلے روز اخبار کے مالک صاحب اپنے عملے کے سینئر ارکان سمیت اس سیاسی تنظیم کے دفتر تشریف لے جا رہے تھے جس کی پروردہ طلباء تنظیم نے ان کا یہ حال کیا تھا۔ سیاسی تنظیم کے لیڈروں نے اخبار کے مالک کے خوب لٹے لئے اور اسے وارننگ دینے کے انداز میں کہا کہ اگر انہوں نے خبروں میں اپنی ایک طرفہ پالیسی ترک نہ کی تو طلباء مشتعل ہو کر کچھ بھی کر گزریں گے اور اس صورت میں وہ ان کے لئے کچھ نہیں کر پائیں گے۔

انہوں نے بے چارے مالک سے اس طرح سلوک کیا تھا جیسے یہ ساری جاہی اس کے اپنے ہاتھوں انجام پائی ہو۔ مالک صاحب بھی بڑے کانیاں آدمی تھے۔ وہ بیگی ملی بنے زخمی لیکن

مجبور شیر کی طرح سر جھکائے سب کچھ سنتے رہے۔ بالا خرہ فریقین کے درمیان طے پایا کہ آئندہ اخبار حملہ آور پارٹی کے کارکنوں کی خبریں بھی نمایاں شائع کرے گا اور حملہ کی اس خبر کو زیادہ نہیں اچھالے گا۔

سیاسی جماعت کے گرگ جہاندیدہ نے اخبار کے مالک کی آمد کی خبر فوراً ہی تمام اخبارات کو جاری کر دی تھی جس میں اخبار مالک کی طرف سے اپنے سابقہ رویے پر ”معذرت کا اظہار“ کرنے کا تذکرہ بھی موجود تھا۔ یہ خبر متاثرہ اخبار کے کاروباری حریف نے مع تصاویر اپنے اگلے روز کی اشاعت میں صفحہ اول پر شائع کرتے ہوئے ادارتی نوٹ میں اسے ”خوش آئند قدم“ قرار دیتے ہوئے اس امر کی ضرورت پر قارئین کو دھیان دلایا تھا کہ سیاسی جماعتوں کے قائدین اور اخبارات کے درمیان ”خوشگوار تعلقات“ سے اسن وامن کی صورت حال کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔

متاثرہ اخبار کا مالک حالات کی اس ستم ظریفی پر اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر کسی نے بھوکے بھیریوں کے سامنے پھینک دیا ہو۔

○

ارسلان کی ضمانت قبل از گرفتاری ملک صاحب کے کارندوں نے احتیاطاً کروالی تھی لیکن ارسلان کے لئے چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ اس کا نام مخالف تنظیم نے طرمان کی فہرست میں نہیں لکھوایا تھا حالانکہ اسے سب نے بیچنا تھا اور یوں بھی اس نے اب خاصی شہرت کمائی تھی۔ یہ بات اس کے لئے حیران کن تھی۔

حافظ عابد کا جنازہ اٹھا تو ایک کھرام مچ گیا۔ ارسلان کا نام ایف آئی آر میں نہ سہی مگر اس کے والدین تک یہ بات پہنچ چکی تھی کہ حملہ آوروں کی کمان ان کا صاحبزادہ ہی کر رہا تھا۔

بوڑھے اور معزز والدین کے لئے یہ لرزادینے والی اطلاع تھی۔ اس حادثے نے ان کے اوسان ہی خطا کر دیئے تھے۔

”ارسلان میں تمہیں دودھ کی دھاریں نہیں بخشوں گی۔ تم پر خدا کا عذاب ٹوٹے، تم نے حافظ قرآن کو مار ڈالا۔ خبردار! کبھی اس طرف کا رخ نہ کرنا۔ آج سے تم ہمارے لئے مر گئے

ہو۔“ والدہ نے روتے ہوئے سینکڑوں عورتوں کی موجودگی میں زندگی کے سب سے بڑے اور جان لیوا فیصلے کا اعلان کر دیا۔

جس روز اخبارات میں لاقطعی کا یہ اشتہار شائع ہوا۔ ہمارے آپ اٹھی۔ وہ خود کو ضمیر کی ملامت سے کبھی چھٹکارہ نہ دلا سکی۔ ارسلان کی تباہی میں اسے کہیں نہ کہیں اپنا ہاتھ بھی نظر آتا تھا۔

○

ارسلان ملک صاحب کی طرف سے فراہم کردہ فلیٹ میں پہنچا ہی تھا جب اس نے دروازے پر مانوس سی آہٹ سنی اور ہمارے دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

”ارسلان خدا کے لئے اس راستے سے ہٹ جاؤ۔ تم ملک کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہو وہ تمہیں تباہ کر دے گا۔ اب بھی وقت ہے ارسلان تم چاہو تو اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر کے دوبارہ شریفانہ زندگی میں لوٹ سکتے ہو۔“

اس نے رو دینے والی آواز میں ارسلان سے کہا۔

”مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہمارا کبر شیر وانی۔ میں کوئی راستے میں گر پڑا اپناچ نہیں ہوں کہ لوگ مجھ پر ترس کھاتے پھریں..... اور جب میرے والدین نے ہی مجھے عاق کر دیا ہے۔ محض ایک غلط اطلاع کی بنیاد پر تو تم کون ہوتی ہو مجھ سے ہمدردی جتانے والی.....! جاؤ چلی جاؤ.....! مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ میں نے زندگی کا جو راستہ چنا ہے، خوب سوچ سمجھ کر چنا ہے۔ میں کوئی بچ نہیں ہوں نہ مجھے انگلی پکڑ کر چلانے کی کوشش کرنا..... اور یہ جو تم ہر قدم پر مجھے میری کم مائیگی کا احساس دلاتی رہتی ہو، میں اس رویے کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔ نہیں چاہئے مجھے یہ جھوٹی ہمدردی..... اگر تمہیں اتنی ہی محبت تھی مجھ سے تو میری محبت کو ٹھکرایا کیوں تھا؟ کیا سمجھا تھا تم نے مجھے اور کیا سمجھتی ہو تم اپنے آپ کو؟“ ابھی تک شراب کا نشہ نہیں لہڑا تھا۔

”مجھے سمجھنے کی کوشش کرو ارسلان۔ خدا ار مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں تمہاری بہت عزت کرتی ہوں۔ میں تمہیں تباہ ہونا نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے تم سے بہت محبت ہے ارسلان۔ میں مرجاؤں گی..... مرجاؤں گی.....“ وہ بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رونے لگی۔

لیکن.....!

وہ پتھر کا بت بنا اسے دیکھتا رہا.....!!

ہمدردی کا ایک لفظ بھی ہما اکبر شیروانی کے لئے اس کے پتھر لیے ہونٹوں سے ادا نہ ہوا۔
شاید ہما کے رونے سے اس کی کسی حس کی تسکین ہو رہی تھی۔

کتنا اذیت پسند ہو گیا تھا وہ.....!

ہما نے خود ہی ضبط کیا، خود کو نارمل کیا۔ اپنے آنسو پونچھے اور ارسلان کی طرف دیکھ کر انتہائی سنجیدگی اور حوصلے سے کہا..... ”ارسلان تم مجھ سے شادی کرو گے؟“

ارسلان کے لئے یہ سوال ہی چونکا دینے والا تھا۔ اسے اپنا نشانہ اترتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ تو سانٹے میں آ گیا۔

○

اس سے پہلے کہ وہ سوال کا کوئی جواب دے، اچانک ہی دروازہ پر آہٹ ہوئی اور جاوید اندر آ گیا۔

”اوہو! بھئی میں غلط ایڈریس پر تو نہیں پہنچ گیا.....!“ اس نے ہما کی طرف دیکھ کر لٹریہ لہجے میں کہا۔

”ارسلان مجھے اپنے سوال کا جواب چاہئے.....!“ ہما نے جاوید کو نظر انداز کرتے ہوئے ارسلان کی آنکھوں میں جھانکا۔

ارسلان کو صورت حال نے گڑبڑا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے والدین اسے عاق کر چکے تھے۔ کئی مقدمات میں وہ پولیس کو مطلوب تھا اور ضمانت پر رہا تھا۔ اس کا واحد سہارا ان حالات میں سب کہ وہ مخالف تنظیم کی ”ہٹ لسٹ“ پر بھی آچکا ہو، سوائے ملک صاحب کے اور کون تھا۔

جب اسے خبر ملی تھی کہ حملہ آوروں میں اس کا نام درج نہیں کر دیا گیا تو ملک صاحب نے انتہائی رازدارانہ لہجے میں کہا تھا.....!

”برخوردار! ذرا ہوشیار رہا کرو۔ خدا نہ کرے دشمن کے عزائم خطرناک ہیں۔ تمہارا نام بے آئی آر میں نہ دے کر ایک طرح سے انہوں نے تمہارے متعلق اپنے بھیا تک ارادے کا نسل خود ہی دے دیا ہے۔ وہ لوگ اب حافظ عابد کے خون کا بدلہ تمہیں مار کر لینا چاہیں گے اور اب انہوں نے حملہ آوروں میں تمہارا نام ہی پولیس کو نہیں دیا تو اپنی دانست میں بھی سوچا ہے کہ

خدا خواستہ تمہارے قتل کی صورت میں ان پر شک کرنے کا جواز ہی ختم ہو جاتا ہے۔“

یہ لرزادہ بے والی حقیقت تھی جس سے وہ ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بھی اس تک مخالف تنظیم کی وارننگ پہنچ چکی تھی کہ وہ اپنی اور اس کی دشمنی میں کسی تیسرے کو لا کر کھیل کا مزہ کر کر کرنا نہیں چاہتے۔

وہ قدم قدم پر ملک صاحب کا دست نگر تھا۔ اگر اس کے سر سے دست شفقت اٹھالیتا تو وہ خارش زدہ کتے کی موت مارا جاتا اور کوئی اس کی لاش بھی وصول کرنے کی جرأت نہ کرتا۔

اور.....!

دوسری طرف ملک صاحب اس لڑکی ہما اکبر شیروانی کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے جس نے عین انتخابات کے موقع پر تنظیم کو دھوکہ دیا تھا۔ انہوں نے باقاعدہ اعلان کر دیا تھا کہ ہما اکبر شیروانی کو انقلابی طلباء فیڈریشن سے خارج کر دیا تھا۔

”اگر انہیں علم ہو گیا کہ وہ ہما اکبر سے ابھی تک ملتا ہے تو.....!“ یہ سوچ ہی اس کے لئے بہت اذیت ناک تھی۔

”ہما میں پھر کبھی اس مسئلے پر بات کروں گا۔“ اس نے ہما کو ملک کے چچے جاوید کی موجودگی کا احساس دلانا چاہا۔

”مجھے ابھی اور اسی وقت اپنی بات کا جواب چاہئے۔“ ہما کے لہجے میں چھپی سنجیدگی اور چٹنگی نے ارسلان کے ہاتھ پیر پھلا دیئے تھے۔

”میں نے کہا تھا کہ ابھی میں بات نہیں کر سکتا۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”ارسلان اگر تم نے کتے کی موت مرنے کی ٹھان ہی لی ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ خدا

حافظ!“

وہ دروازہ زور سے بند کر کے باہر نکل گئی۔

”کمال ہے بھئی!“ جاوید نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”آئی تھی بے چاری مجھ سے مدد مانگنے۔ شاید کوئی نیا بلاک کھڑا کرنے جا رہی ہے۔

بڑی خطرناک عورت ہے یا میں نے تو کہہ دیا کہ میں کم از کم اس کے چنگل میں پھنسنے کو تیار نہیں ہوں۔“

ارسلان کو بھی حالات نے سیاست سکھا دی تھی۔ اس نے بڑی مکاری سے مسکراتے ہوئے جاوید کے سامنے اپنی صفائی پیش کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جاوید کے ذریعے بات اور طرح ملک صاحب کو پہنچے حالانکہ یہ اس کا دل ہی جانتا تھا کہ اس حادثے نے اس پر کیا ستم ڈھایا ہے۔ اس کو اپنے اعصاب تو ختمے محسوس ہو رہے تھے۔

”دیکھو یار! تم اپنے بھائی ہو۔ میں تمہیں صاف صاف بتا دوں کہ ملک صاحب اس کو اب بالکل پسند نہیں کرتے اور جس کسی سے یہ ملے گی اس کے خلاف بھی ان کے دل میں بدگمانی پیدا ہوگی.....!“ جاوید نے لگی پٹی رکھے بغیر کہہ دیا۔

”جاوید! مجھے اس بات کا علم ہے اور تم بھی اس کا خیال رکھنا کہ میرے متعلق ملک صاحب کو کوئی غلط اطلاع نہیں پہنچنی چاہئے۔ میری زندگی تو داؤ پر لگی ہی ہے اپنا برا چاہنے والوں کو میں پھولوں کے ہار نہیں ڈالوں گا۔ یہ تو ظاہر ہے.....!“

اس کے لہجے میں چھپی دھمکی کا ادراک جاوید کو ہو گیا تھا۔
”یار لغت بھیجو! مجھے کیا ضرورت ہے۔ ہم تو یاروں کے یار ہیں۔“ اس نے بڑی مسیسی ہنسی ہنستے ہوئے ارسلان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

اس کے بعد دونوں اگلے روز شام کو ہونے والی میننگ میں زیر بحث آنے والے مسائل پر بحث کرنے لگے۔

○

جاوید کی روانگی کے بعد سے ایک مستقل پچھتاوا اس کی جان کو آ گیا تھا۔ جاوید کے جاتے ہی وہ بھاگم بھاگ نزدیکی پی سی او تک گیا۔ وہ فون پر اپنی مجبوری کو ہما کے گوش گزار کر کے اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا.....! وہ ہما کو یہ کہنے جا رہا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو وہ اس سے شادی کر کے اس ماحول سے جان چھڑانے کے لئے تیار ہے۔ اس نے سوچا تھا جب ہما کو بتائے گا کہ وہ آج تک اس کے منہ سے یہی الفاظ سننے کے لئے ترس رہا تھا تو وہ کتنی خوش ہوگی..... وہ اسے معاف کر کے اس کے تمام گناہوں سمیت اسے سینے سے لگا لے گی۔

لیکن.....!

قسمت اس پر اتنی مہربان کب رہی تھی جواب اس کو زندگی کی خوشیوں سے اپنا حصہ

وصول کرنے کا حق مل جاتا۔ اسے تو حالات نے ستم ڈھانے کے لئے جانے کب سے منتخب کر لیا تھا۔

قہر کی دیوی کو نجانے اس کی کون سی ادا بھاگتی تھی کہ اب وہ اپنا دست ستم اس کے سر سے اٹھانے پر تیار ہی نہ ہوتی تھی۔

”بی بی جی گھر پر نہیں ہیں!“ دوسری طرف سے غیر مانوس سی آواز سنائی دی۔

رات تک وہ دیوانہ وار فون کرتا رہا لیکن ہر دفعہ اسے یہی جواب ملا۔ رات کو ہما کے نوکر نے جو ارسلان کو جانتا تھا اطلاع دی کہ وہ اپنے والدین کو ملنے گئی ہے جو ملک کے دوسرے بڑے شہر میں رہتے تھے۔ بہت کوشش کے باوجود اسے ان کا فون نمبر نہ مل سکا۔ پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو رہا کہ ہما کی واپسی پر اس سے معافی مانگ کر اسے منالے گا۔

اس دوران وہ ملک صاحب کے چلائے چکروں میں پھنسا رہا۔ اپنی جان کی حفاظت کے لئے وہ یوں بھی ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھاتا تھا۔

یونیورسٹی تو اس کا جانا برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ سات آٹھ روز بعد جب وہ ایک دن اتمام حجت کے لئے یونیورسٹی گیا تو اسے علم ہوا کہ ہما نے یونیورسٹی چھوڑ دی ہے۔ اسے شاید امریکہ کے کسی کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ اگلے روز وہ یہاں اپنے دوستوں سے تھوڑی دیر کے لئے الوداعی ملاقات کرنے آئی تھی.....!

اس کے ہم جماعتوں نے بتایا کہ ہما اب پہلے والی ہما کبیر شیروانی نظر نہیں آتی تھی۔
”یار وہ تو بالکل بدلی ہوئی لڑکی تھی۔ ایک دم خاموش۔ جیسے کسی نے اس کا سب کچھ چھین لیا۔“

ایک ہم جماعت نے بڑی ہمدردی سے اس کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔
”ہاں تمہارا پوچھ رہی تھی کہ تم کبھی یونیورسٹی آتے بھی ہو یا نہیں؟“ ہم نے کہا ”بی بی شہزادہ ہے شہزادہ۔ یہ کالج یونیورسٹیاں تو ہم جیسے..... فقیروں کے لئے بنی ہیں۔ ارسلان جیسے شہزادوں کے فشی ضرور یہاں پڑھنے آتے ہیں انہیں کیا ضرورت ہے بھی اپنی انرجی ضائع کرنے کی؟ ڈگری تو چل کر ان کے قدموں کو بوسہ دیتی ہے۔ امتحان دینے کو ہم کیا کم ہیں!“

جانے اس کا دوست کیا کیا طر کے نشتر چلاتا رہا لیکن ارسلان یہاں تھا ہی کب؟

وہ تو کسی اور ہی دنیا میں کھو گیا تھا.....!

جیسے اس اطلاع نے اس کا دل کچل ڈالا ہو۔ کچھ سوچتا وہ چپ چاپ موٹر سائیکل سٹینڈ کی طرف آیا اور اب وہ تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر موٹر سائیکل اڑاتا ہوا ہما کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

”سرجی! وہ تو واپس ہی نہیں آئیں۔ ایسی گئیں کہ دوبارہ پلٹ کر ادھر دیکھا بھی نہیں۔ پرسوں تھوڑی دیر کے لئے آئی تھیں۔ مجھے اور خانساں کو خاصے پیسے دیئے اور کہا کہ وہ باہر جا رہی ہیں۔ اب لمبے عرصے تک نہیں لوٹیں گی۔ سرجی! بہت اداس تھیں بی بی جی۔ کار سے اتر کر وہ چند منٹ کے لئے انیکسی میں گئیں پھر روتی ہوئی کار میں بیٹھ کر چلی گئی.....! اب تو وہ شاید ملک سے باہر ہی جا چکی ہوں گی.....!“ باغ میں کام کرنے والے مالی نے بڑے دھکی لہجے میں اسے بتایا۔

ارسلان کے دل پر الم کا پہاڑ آن گرا..... اس نے بڑی ہمت سے اپنی بکھری توانائیوں کو مجتمع کیا اور لرزتی ہوئی آواز میں مالی سے اس کے والدین کا فون نمبر دریافت کیا۔

”ہم تو ان پڑھ لوگ ہیں بابو جی! کیا بتا سکتے ہیں.....! مالی نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

بعد از خرابی بسیار اس نے ہما کے گھر کا فون رات تک حاصل کر ہی لیا اور جب رات گئے اس نے ملک کے اس بڑے شہر میں مقامی پی سی او سے فون کر کے ٹرنک کال پر ہما سے بات کرنا چاہی تو دوسری طرف کسی سیکرٹری قسم کی چیز نے جواب دیا..... ”جناب وہ تو کل کی لندن جا چکی ہیں!“

جب اس نے ہما کے والدین سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو دوسری طرف سے ڈانٹ کر فون بند کر دیا گیا۔

○

ارسلان ٹوٹ کر رہ گیا.....!

وہ کئی ٹکڑوں میں بکھر گیا تھا۔ اپنے منتشر وجود اور دل و دماغ کے سارے ٹکڑے سینٹا اسے اپنے بس سے باہر دکھائی دے رہا تھا۔ ٹیلی فون اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے پچا تھا۔ بمشکل دیوار کے سہارے وہ لگ کر بیٹھا اپنے اوسان بحال کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کی اندھیری زندگی سے امید کی کرن بھی رخصت ہو گئی تھی۔ اب وہ تھا اور ظلمتوں میں گم راستے..... جن پر اس نے اندھوں کی طرف ٹانگ ٹوئیاں مارتے ہوئے حیات کے اس سفر کو پائنا تھا۔

”کیسے چل سکوں گا میں ہما؟ تم نے یہ کیا کیا؟ تم تو بہت ہمت والی تھیں۔ تم تو مجھے ہمت دلا کر گناہوں کی اس دلدل سے باہر نکالنے جا رہی تھیں..... اب میرا کیا ہوگا؟ کیا ہوگا میرا.....؟“

وہ پاگلوں کی طرح خود سے باتیں کرتا رہا۔

اپنے کسی سوال کا جواب اب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ حالات کے آکٹوپس کے شکنجے میں جکڑ چکا تھا۔ کسی ہزار ہاتھ پاؤں والی بلانے اسے دبوچ لیا تھا اور وہ مرضی سے اپنے جسم کا کوئی بھی عضو ہلانے پر قادر نہیں رہا تھا۔

اب اسے بے بسی سے اپنی آنکھوں کے ساتھ اپنی بربادی کا تماشا دیکھنا تھا۔

جس سمت کا سفر اس نے اختیار کیا تھا وہاں قدم قدم پر مصائب و آلام کی دیوایاں بائیں پھیلائے اس کی منتظر تھیں۔

وہ بہت بد قسمت تھا!

خوش بختی نے دبے قدموں اس کے دروازے پر آہٹ نہیں کی تھی.....!!

اس نے تو دھکے دے دے کر خوش نصیبی کو اپنے گھر سے نکالا تھا اور ایسا نکالا تھا کہ اب اس نے دیس نکالا ہی لے لیا تھا۔

کیا کروں؟

کدھر جاؤں؟

کس کے پاس جاؤں؟

اس نے خود سے پوچھا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اختر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اختر کل ہی ضمانت پر رہا ہو کر گھر آیا تھا۔

فریب نگری

”خیریت.....؟“ اس نے رات کے بارہ بجے ارسلان کو اپنے دروازے پر کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

”میں بہت دکھی ہو گیا ہوں اختر! چلو عارفہ کے ہاں چلتے ہیں۔“ اس نے غیر ارادی طور پر ہی عارفہ کا نام لے لیا تھا۔

”لغت بھیجو اس پر۔ پیارے ہم تمہارا غم غلط نہیں کروائیں گے تو کون کروائے گا۔ آؤ آج تمہیں ایسے جہان سے آشنائی کروانا ہوں کہ پھر سب کچھ بھول کر وہیں کے ہو رہو گے۔“ اختر نے بے حیائی سے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

اور وہ اس کو شراب و شباب کے اس نئے جہان میں لے آیا جہاں ایک مرتبہ آ کر کوئی قسمت والا ہی بھرے ہاتھوں لوٹتا ہے۔

نازنین تھا اس طوائف کا نام جس کے کوٹھے پر اختر اسے لے کر آیا تھا۔

”میرا دوست بہت اداس ہے بہت بڑا آدمی ہے یہ۔ اس کا بہت خیال رکھنا۔“

اس نے بوڑھی نائیکہ کی طرف دیکھ کر آنکھ دبا لی۔

”حضور! یہ خاندانی طوائفوں کا کوٹھا ہے۔ یہاں بڑے لوگ ہی آتے ہیں ہم چھوٹے

لوگوں کو منہ نہیں لگایا کرتے۔“

جہان دیدہ نائیکہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ارسلان کو تول لیا تھا۔

نازنین نے اپنے ناز و ادا کے وہ کمالات دکھائے کہ ارسلان مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اس نے ثابت کر دکھایا تھا کہ وہ عارفہ کی طرح کوئی معمولی جسم فروش لڑکی نہیں ہے۔

یہاں آ کر ارسلان کو شدت سے احساس ہوا تھا کہ آج تک وہ جھک ہی مارتا رہا تھا..... اصل میں تو نازنین ہی وہ لڑکی ہے جو اس کے دکھوں کا مداوا کر سکتی ہے۔

پہلی ہی ملاقات میں وہ نازنین کے ناز و خروں پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اس نے پہلی ہی ملاقات پر نازنین کو اپنا لینے کا عہد کر لیا تھا، خواہ اس کی کچھ ہی قیمت ادا کرنی پڑے۔

اس بات کا احساس اسے نہ ہوسکا کہ پہلی ہی رات دو ہزار اس نے نازنین کی نذر کر دیئے تھے اور اس کے عوض حاصل کی تھی چند گھنٹوں کی رفاقت۔

صبح کی اذان ہو رہی تھی جب دونوں گھر لوٹے۔ گھر لوٹتے ہوئے اسے پھر اپنے کھوکھلے پن کا احساس ہونے لگا تھا۔ اسے پھر ہمایا آگئی تھی۔

کوئی ایسی بات اس میں ضرورت تھی جس نے ایک مرتبہ تو ارسلان کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کو ہما کا قرب کبھی حاصل نہیں رہا تھا، حالانکہ ہما کو اپنی شرافت کا بھی کوئی دعویٰ نہیں تھا لیکن نجانے وہ کیوں چاہتی تھی کہ ارسلان اپنی اس دنیا میں لوٹ جائے جہاں سے وہ بھٹک کر ادھر آ نکلا تھا۔

دو پہر تک وہ لمبی تان کر سوتا رہا.....!

نیند میں بھی ہما کا اداس اور سوالیہ چہرہ اس کے لاشعور پر مسلط رہا۔

○

شراب اس کی زندگی کا حصہ بن گئی تھی.....!

اسے روزانہ شراب کی طلب محسوس ہونے لگتی تھی۔ نازنین کے ہاں اس کا آنا جانا معمول کی بات بن گئی تھی۔ جتنے پیسے اسے ملک صاحب کی طرف سے ملتے تھے وہ نازنین کے ہاں لٹا آتا تھا۔

اسی دوران ملک کے حکم پر اس نے چار پانچ مرتبہ مخالف تنظیم کے مختلف جلسوں پر

فائرنگ کی تھی۔

جس قسم کی تفتیش کا سامنا اس نے مخالف تنظیم کے عقوبت خانے میں کیا تھا اس قسم کی تفتیش سے وہ مخالفوں کو بھی گزار چکا تھا۔ ایسا ہی ایک عقوبت خانہ ان لوگوں نے کھول رکھا تھا.....!!

جو مہر اس کے جسم پر لگائی گئی تھی.....!

وہ مہر اس نے اپنے بیشتر مخالفین کے جسموں پر لگا دی تھی۔ کبھی وہ اس اذیت کے تصور سے بھی لرزاں تھا جو اس کو دی گئی تھی۔ اب وہی اذیت دشمنوں کو پہنچا کر وہ لذت محسوس کرتا تھا۔ اس کا نام مخالفین میں دہشت کی علامت بن گیا تھا۔ اب ملک صاحب نے اس کو جیپ لے دی تھی اور جب بھی وہ گھر سے نکلتا مسلح نوجوان اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ وہ لوگ شہر کی ماڈرن آبادیوں میں دندناتے پھرتے..... خواتین کو تنگ کرنا ان کا معمول تھا لیکن کوئی آنکھ اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

پولیس والے ان کی شکل دیکھتے ہی اپنی شکل دوسری طرف پھیر لیتے۔ جیسے انہوں نے انہیں کبھی دیکھا ہی نہیں۔

کبھی کبھی تو اس صورت حال پر ارسلان کو ہنسی آ جاتی تھی۔

اخبارات ان کے خلاف خبر چھاپنے سے احتراز برتتے تھے۔ پولیس والے ان کے نہ لگنا پسند نہیں کرتے تھے۔

انتظامیہ ان جیسے نوجوانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے ان کے سامنے دم ہلاتی رہتی تھی کیونکہ ان کی رسائی اقتدار کے ایوانوں تک تھی ان لوگوں تک تھی جن کے قلم سے نکلی چند سطریں ملازمین کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیتی کبھی آسمان سے زمین پر بیٹھ سکتی تھیں۔

سیاست دان اپنے جلوسوں کی رونق بڑھانے اور مخالفین کے جلوسوں کی رونق گھٹانے کے لئے ان کے دست بازو کے محتاج تھے۔

پھر انہیں لگام کون دیتا؟

کس کو پڑی تھی جو اپنی عزت اور نوکری خطرے میں ڈال کر محض قانون کی بالادستی کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈالتا۔

○

ارسلان کی حیثیت گینگ لیڈر کی تھی..... اس کے ساتھی چھوٹی موٹی وارداتیں کرتے رہتے تھے۔ کبھی کسی راہ چلتی خاتون کا پرس چھین لیا۔ کبھی کسی دیگن والے کو ڈرا دھمکا کر پیسے چھین لئے۔ کبھی کسی دکاندار کو دھمکیاں دے کر وہاں ہاتھ مار لیا۔

لیکن.....!

ارسلان ایسی چھوٹی موٹی اور گھٹیا حرکتوں کا قائل نہیں تھا۔ وہ تو کوئی لمبا ہاتھ مارنے کا قائل تھا جس کی ضرورت بھی آج کل بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

نازنین کی ماں کے تھامے روز بروز بڑھتے جا رہے تھے اور ملک صاحب کی طرف سے اتنی زیادہ رقم ابھی نہیں ملتی تھی کہ وہ اس کی ماں کا منہ بند کر سکے۔ اس روز جب وہ دن میں ایک دوست کی کار پر نازنین کے ہاں گیا تو اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی نازنین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟“ وہ گھبرا کر رہ گیا تھا۔

”ارسلان تم اس بازار گناہ کے اصول کبھی نہیں سمجھ پاؤ گے۔ تم بہت بھولے ہو

ارسلان۔ تم کچھ نہیں جانتے۔“ اس نے ٹسوے بہاتے ہوئے کہا۔

”اوہو نازنین پہیلیاں نہ بھجواؤ۔ کچھ بتاؤ گی بھی.....؟“ ارسلان نے اس کو اپنی سمت کھینچتے ہوئے کہا۔

”ارسلان ہماری دنیا کے کچھ اصول ہیں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے جس کے لئے میری ماں نے مجھے پال پوس کر جو ان کیا تھا۔ اب وہ میری قیمت وصول کرنا چاہتی ہے ارسلان!“

نازنین نے روتے ہوئے اپنا سر اس کے سینے پر ٹکا دیا۔

”یہ ناممکن ہے میں تمہاری ماں کو.....!“

”نہ ارسلان خدا کے لئے ایسی بات نہ کرو۔ کبھی بھول کر بھی ایسا خیال دل میں نہ لانا..... ارسلان تمہارے لئے یہ ممکن نہیں ہوگا۔ تم نہیں جانتے کہ ملک صاحب تک رسائی میری ماں کے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ تمہارے اور ان کے تعلقات کی نوعیت کچھ مختلف ہو سکتی ہے لیکن میری ماں سے بگاڑ کو وہ اپنے ہاتھوں اپنی قبر نہیں کھودیں گے..... جب انہیں کسی لڑکی کی ضرورت ہوتی

ہے تو میری ماں ہی کے مستقل گاہک ہیں۔ ارسلان! مجھے یہ بات تمہیں بہت پہلے بتا دینی چاہئے تھی لیکن جب تک مجھے علم ہوا کہ تم ملک صاحب کے آدمی ہو، میں تمہاری محبت میں بری طرح گرفتار ہو چکی تھی..... ارسلان میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ خدارا! مجھے بچا لو ارسلان.....! میری ماں نے میرا گاہک تلاش کر لیا ہے اور وہ ملک صاحب کا خاص آدمی ہے۔“

آخری فقرہ اس نے کچھ اس انداز سے کہا تھا کہ ارسلان کو چھت گھومتی نظر آنے لگی۔

”چلو ہم بھاگ چلیں.....!“ اس نے اپنی دانست میں تمام مسائل کا حل تلاش کر لیا تھا۔

”لیکن کہاں؟ ارسلان تم ابھی بچے ہو۔ تم دنیا کو نہیں سمجھتے ارسلان۔ تمہیں علم نہیں کہ ملک نے اگر تم پر سے ہاتھ اٹھالیا تو تم.....!“ وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر باقاعدہ ٹسوے بہانے لگی۔

ارسلان نے بڑی مشکل سے اس کا ردنا دھونا بند کروایا۔

”خدا کے لئے تین چار دن کے اندر کہیں سے بچیں ہزار روپیہ لاکر میری ماں کے منہ پر مارو اور مجھے اس موذی سے بچا لو ورنہ میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔“

یہ کہتے ہوئے وہ بھاں بھاں کرتی ہوئی پھر ارسلان کے سینے سے لگ گئی۔

”تم بے فکر ہو جاؤ میری جان! اگر تمہیں دولت دے کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے تو میں

ماری دنیا کے خزانے تمہاری ماں کے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔“

ارسلان تو ”دریام“ بننے پر تلا ہوا نظر آتا تھا۔

”اوہ ارسلان! کتنے عظیم ہو تم..... اور کتنے ذلیل ہیں یہ دنیا والے۔ ارسلان دراصل

دنیا پیار کے قابل ہی نہیں ہے۔ میں نے تو اپنی زندگی میں کبھی پیار کا تصور ہی نہیں کیا تھا۔

ارسلان! لیکن تم نجانے کہاں سے میری زندگی میں چلے آئے۔ تم نے تو پتھر میں شکاف ڈال دیا

ہے ارسلان!“ اس نے ارسلان پر اپنا بوجھ ڈالتے ہوئے اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔

اس سے پہلے دو پانچ..... ہزار کی فرمائشیں ہوا کرتی تھیں لیکن نازنین کی ماں بکرا ذبح

رنے پر تل گئی تھی۔

جانے یہ سونے کی مرغی پھر اٹھ اڑے یا نہ دے۔

یہی سوچ کر اس نے اپنی بیٹی کے ساتھ لمبا ہاتھ مارنے کا پلان تیار کیا تھا اور ارسلان کے جانے کے بعد وہ اپنی بیٹی کا سر منہ دیوانہ وار چوم رہی تھی، جس نے اپنے اسلاف کی روایات کا بھرم قائم رکھا تھا اور کمال ہوشیاری سے ارسلان کے سامنے ”ملک صاحب“ کا پیہ کھیل گئی تھی۔ اس طرح انہوں نے ارسلان کو یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ اگر اس نے کوئی ”ایڈونچر“ کرنے کی کوشش کی تو وہی ملک جس کا وہ پروردہ ہے اس کے خون کا پیاسا ہو جائے گا۔

یوں بھی ارسلان نے جس درخت پر پناہ لے رکھی تھی اس کی جڑوں پر کلہاڑا چلانے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا.....!

○

ارسلان یہاں سے سیدھا اختر کے پاس پہنچا تھا۔

”یار کچھ کرنا ہی ہو گا۔ تم نہیں جانتے یہ لوگ صرف پیسے کی زبان سمجھتے ہیں۔“ اختر نے

اس کی بات سن کر کہا۔

”لیکن ملک صاحب سے اتنی رقم کیسے مانگی جائے؟“ ارسلان نے کہا۔

”نہ نہ یہ غضب نہ کرنا۔ ملک صاحب کو اس بات کی ہوا نہیں لگنی چاہئے کہ تم نازنین

کے کوٹھے پر جاتے ہو۔ انہیں یہ تو علم ہے کہ تم اس بازار میں جاتے ہو لیکن میں نے اس بات کی ہوا

تک نہیں لگنے دی کہ تم..... نازنین کے پاس جاتے ہو..... اور ہاں جاوید سے خبردار رہنا۔ وہ آج

کل ملک صاحب کا کچھ زیادہ ہی چہیتا ہو رہا ہے۔“

اختر نے اس کو خبردار کیا اس نے آخری فقرہ جان بوجھ کر ادا کیا تھا۔

واقعی جاوید اس کا رقیب بن رہا تھا۔ کبھی وہ ملک صاحب کا سب سے زیادہ چہیتا تھا اور

پیسوں کی تقسیم اسی کے ذریعے ہوتی تھی لیکن اب آہستہ آہستہ اپنی چرب زبانی کے سہارے جاوید

نے وہ مقام حاصل کر لیا تھا اور بہت سے کام جو پہلے اختر کے ہاتھوں انجام پاتے تھے اب جاوید

کے ہاتھوں انجام پانے لگے تھے۔ خاص طور سے مختلف مواقعوں پر عورتوں کا حصول اور شراب کی

خریداری کا ذمہ تو ملک صاحب نے مستقل جاوید کو سونپ دیا تھا۔

اختر کے شاطر ذہن نے ایک تیر سے دو شکار کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ

ارسلان بہر صورت اس کی ہاں میں ہاں ملائے گا۔

دوسری طرف ارسلان کا جی چاہتا تھا کہ وہ اختر کا منہ نوچ لے کیونکہ اس نے ہی سب سے پہلے اسے نازنین کے کوٹھے کا راستہ دکھایا تھا۔ اگر اسے علم تھا کہ یہ کوشا ملک صاحب کی نظر میں ہے تو وہ اسے وہاں لے کر ہی کیوں گیا؟

لیکن.....!

وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ کر نہیں کر سکتا۔ اسے قدم قدم پر سہاروں کی ضرورت تھی۔ کبھی وہ اختر کو اپنی بیساکھیاں بناتا، کبھی نواز کو اور کبھی جاوید کو۔ جس راستے پر وہ چل نکلتا تھا وہاں سامنے سے آنے والی گولی سے بچنے کے لئے اسے ہر وقت کسی نقاب کی، کسی ڈھال کی ضرورت تھی۔ اب اس اکیلے کے بس میں کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

سوائے اس کے کہ وہ اپنا الگ گروپ بنا کر ملک سے ہی نکل جائے لیکن اتنی ہمت کا مالک نہیں تھا وہ۔

اسے تو حالات نے موم کی گڑیا کی طرح اچانک کان سے پکڑ کر اس طرف گھمادیا تھا ورنہ تو شاید اس نے زندگی میں کبھی ایسے بھیانک تجربات سے گزرنے کا تصور ہی نہیں کیا تھا۔ حالات کی جس بھٹی کا ایندھن وہ بن چکا تھا اس میں اسے آخری لمحات تک جلنا ہی تھا۔

کبھی کبھی اسے بڑی شدت سے اپنا گھر باز والدین، بہن بھائی، ساتھی سگی، گاؤں، سکول، کالج اور وہ راستے یاد آتے جن پر وہ آوارہ ہر نوں کی طرح گھات میں لگے شکاریوں سے بے پروا چھلانگیں لگایا کرتا تھا۔

جانے صیاد کب سے اس کی گھات لگائے بیٹھا تھا۔

دو تین مرتبہ اس نے والدین کو سمجھانے اور منانے کی کوشش کی تھی لیکن توبہ کا دروازہ شاید اس پر بند ہو چکا تھا۔

کوئی اسے معافیہ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اگر وہ اس بات کا یقین بھی کر لیتے کہ اس نے عابد پر گولی نہیں چلائی تب بھی وہ یہ کبھی ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ دین میں مسلح غنڈوں کے ساتھ عابد سے صلح کے مذاکرات کرنے وہاں گیا تھا۔

ہا.....!

خوش بختی کا پرندہ.....!

اس کے سر پر بیٹھ کر اڑ چکا تھا۔

اسے بادشاہت مل گئی تھی۔

وہ جرائم کی دنیا کا چھوٹا موٹا بادشاہ بن گیا تھا لیکن خوش نصیبی اس سے منہ موڑ چکی تھی۔

○

”میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔ بڑا شاندار منصوبہ ہے۔ ہمیں اچھا خاصا مال بھی مل جائے گا اور اپنے دشمن جاوید سے نجات بھی مل جائے گی۔“ اختر کے شیطانی ذہن نے منصوبہ تیار کر لیا تھا۔

”کیا.....؟“ ارسلان نے بے چینی سے دریافت کیا۔

جواب میں اختر نے اسے منصوبے کی جزئیات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ انہیں چھوٹے شہر میں بینک کی ایک ویگن پر حملہ کرنا ہے۔ ویگن میں موجود بینک کا مسلح گارڈ ان کا ساتھی ہوگا۔ وہ لوگ رقم حاصل کر لیں گے لیکن بینک کے گارڈ فائرنگ سے ان میں سے ایک کو مرنا ہوگا اور مرنے والا سوائے جاوید کے اور کون ہو سکتا ہے۔ یہی ایک صورت تھی اس سے نجات حاصل کرنے کی۔ اس رقم کی تقسیم میں بھی ایک حصہ دار کم ہو جائے گا۔ ان کی جوابی فائرنگ سے ایک گولی گارڈ کی ٹانگ وغیرہ میں بھی لگنی ضروری ہے۔

”یہ کارنامہ بھی میں ہی انجام دوں گا..... ہم تو یاروں کے لئے جان قربان کر دیا کرتے

ہیں۔“

”کوئی بات نہیں بیٹا! اب میں بے وقوف نہیں بنوں گا.....!“ ارسلان نے دل ہی دل

میں کہا۔

ایک شیطانی منصوبہ اس کے ذہن میں بھی ترتیب پا گیا تھا.....!

”کتنی رقم ہوگی اندازاً؟“ اس نے اختر سے پوچھا۔

”یہی کوئی تین چار لاکھ! یا روہ مضافاتی علاقے کا بینک ہے وہاں اس سے زیادہ کیا

ملے گا؟“

”اور حصے دار کتنے ہوں گے.....؟“ ارسلان نے اگلا سوال کیا۔

”تین.....!“

”ہونہ..... فرض کیا تین لاکھ رقم ہے تو ایک ایک لاکھ کے لئے ہم اپنی جان داؤ پر لگائیں گے۔“ ارسلان نے بیزاری کے لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ اختر کو سمجھ تو آگئی تھی لیکن وہ اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

”ایک حصے دار اور کم ہو جائے تو ہم دونوں کو قابل ذکر رقم مل جائے گی۔“ اس نے اختر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”یا تمہاری بات تو دل کو لگتی ہے لیکن.....؟“

”لیکن ویکن کچھ نہیں.....!“ اس نے اختر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”بھئی دیکھو ناں جاوید سے تم نجات حاصل کرنا چاہتے ہو۔ ظاہر ہے وہ چوکیدار کی گولی سے مرے گا..... اور تم اس کی ٹانگ میں گولی مارو گے لیکن ٹانگ ہی میں کیوں؟ سر میں کیوں نہیں؟“ اس کا لہجہ بڑا خونخوار تھا..... ”میرے برادر! یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ دوران تفتیش بھاڑ پھوڑ دے..... اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ چھوٹا آدمی ہے پیسہ ہی ہضم نہ کر سکے..... سوچو! ذرا سوچو..... اور ہاں!! گاڑو ہمارے ساتھی کو مارے گا۔ جو ہمارے دوست کو قتل کر دے اسے بھی قتل تو ہونا چاہئے..... خون کا بدلہ خون۔“

آج ارسلان کو اختر آئے۔ بدلے ہوئے انسان کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ بالکل ایسے جیسے کوئی زخمی چیتا شکاریوں کے زرخے میں پھنسا ہو۔

”ڈن.....!“ اختر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

”ڈن.....!“

○

اسی روز شام کو اختر اپنے ساتھ جاوید کو لے کر ارسلان کی طرف گیا۔ تینوں نے اس امر کو ملحوظ خاطر رکھا کہ ان کی آپس میں ملاقات کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ خاص طور سے انہوں نے ملک صاحب کو اس میننگ کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ ان کی خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ ملک اس روز رات کی فلائٹ سے دوسرے شہر چلے میں تقریر کرنے جا رہا تھا۔

رات کو ہی اختر بینک کے گاڑے کے معاملہ اٹھانے چلا گیا اور رات کے دوسرے پہر واپس آ گیا۔ اس نے دوسرے دن کا پروگرام طے کر لیا تھا۔

تینوں مطمئن ہو کر لیٹ رہے۔

واردات کے دن تینوں الگ الگ موقعہ واردات کے قریب اکٹھے ہوئے تھے۔ اختر بس کے ذریعے وہاں پہنچا تھا جب کہ جاوید اور ارسلان موٹر سائیکلوں پر آئے گا۔ یہ دونوں موٹر سائیکلوں کی نمبر پلیٹیں بدلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے واردات میں یہی موٹر سائیکل استعمال کرنے تھے۔ جاوید کے چور ساتھی کو قطعاً علم نہیں تھا کہ اس کے دوست کسی جرم کا ارتکاب کرنے جا رہا ہے..... نہ ہی اس نے کسی اور کی شکل دیکھی تھی۔

ارسلان اور اختر کے پاس پستول تھے جبکہ جاوید نے ناؤ ذرہام رکھا تھا۔ اس کے ذمے رقم کا تھیلا اٹھا کر بھاگنا تھا۔ فرار کے لئے ایک موٹر سائیکل ارسلان اور اختر نے جب کہ دوسری جاوید نے استعمال کرنی تھی اور دوسرے پہر کے بعد انہوں نے شہر میں ایک جگہ اکٹھے ہو کر رقم تقسیم کرنا اور پھر الگ ہو جانا تھا۔

○

تینوں طے شدہ منصوبے کے مطابق مضامقات سے شہر کو آنے والی اس ذیلی سڑک کے کنارے چھپے بیٹھے تھے جہاں سے دین کو رقم لے کر اس سے ملحقہ بڑی سڑک پر پہنچ کر شہر جانا تھا۔ اس کچی سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ یوں بھی شدید سردی اور اس پر دور دراز سے ہونے والی بارش نے لوگوں کو گھروں میں دبکے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

انہوں نے موٹر سائیکل جھاڑیوں میں چھپا رکھے تھے اور خود راستے پر نظرین گاڑنے بیٹھے تھے۔ جیسے ہی گھڑی کی سوئیاں مقررہ وقت پر پہنچیں ان کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

دور سے انہوں نے دین اس طرف آتے دیکھ لی تھی اور اب منصوبے کے مطابق انہوں نے ہاتھوں میں پکڑے پتھر سڑک پر لڑھکا دیے تھے۔ دین کے ڈرائیور کے تو دھم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ یوں بھی دھند کی وجہ سے دوز کی چیزیں صاف دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ اچانک ہی جب اسے سڑک پر پتھر نظر آئے تو انہوں نے پوری قوت سے بریک لگائی۔ شاید اس کی چھٹی حس نے پیش آمدہ خطرے کی نشاندہی کر دی تھی کیونکہ اس نے

اچانک ہی گاڑی کو ریورس کر کے بھاگنے کا ارادہ کیا تھا۔

لیکن.....!

اس کے دل کی دل میں رہ گئی کیونکہ اختر نے وین کے دونوں ٹائروں کو فائرنگ کر کے پھاڑ دیا تھا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق ماؤزر ہاتھ میں تھا جے جاوید وین کے کھلے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے تو یہی علم تھا کہ اندر سے کوئی مزاحمت نہیں ہوگی اور وہ تھیلا اٹھا کر موٹر سائیکل کی طرف بھاگے گا۔

لیکن.....!

جیسے ہی وہ وین کے دروازے کے نزدیک پہنچا۔ اندر مسلح گارڈ جسے اختر نے منصوبے کی جزئیات سے آگاہ کر رکھا تھا۔ اچانک اٹھا اور اس نے اپنی بارہ بور کی بندوق جاوید کی طرف سیدھی کر لی۔ جاوید اپنی دھن میں رقم والے تھیلے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کی سنگین کا اندازہ کر کے خود کو تیار کرے۔ گارڈ کی رائفل نے شعلہ اگلا اور کارتوس سیدھا اس کے سینے میں داخل ہو گیا۔

جاوید کو اگلا سانس لینے کی مہلت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ بارہ بور کے کارتوس سے اس کا زندہ بچ نکلنا ناممکن تھا.....!

منصوبہ بڑا شاندار تھا.....!

کیونکہ گارڈ کے دوبارہ بندوق لوڈ کرنے تک دوسرے لٹیرے اس پر قابو پا لیتے اور وہ ”بے چارہ“ کچھ نہ کر پاتا۔ انگوٹری میں بھی اسے بہادری پر انعام ملتا۔

منصوبے کی دوسری کڑی کے مطابق دونوں نے گارڈ ڈرائیور اور کیشیئر کو باہر نکال کر تھیلا اٹھا لیا اور اختر کے پیچھے کھڑے ہو کر اسے اگلا اشارہ کر دیا۔

اختر نے مردہ جاوید کا موزر اٹھایا اور اوندھے منہ زمین پر لیٹے گارڈ کے سر میں گولیاں اتار دیں۔ اسے بھی جاوید کی طرح اگلا سانس لینے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ وہ جس پوزیشن میں زمین پر لیٹا تھا اسی حالت میں زمین کا رزق بن گیا۔

بظاہر منصوبہ مکمل تھا اور اب دونوں نے موٹر سائیکلوں پر فرار ہونا تھا۔

لیکن.....!

ابھی ڈراپ سین باقی تھا۔

اس سے آگے کا منصوبہ ارسلان نے خود طے کیا تھا۔ جاوید سے تو اسے گارڈ نے نجات دلا دی تھی۔ گارڈ کو اختر نے مار ڈالا لیکن اختر اب اس کے بہت سے گناہوں میں شریک تھا۔ یوں بھی اس نے ارسلان کو ساری زندگی بلیک میل کرتے رہنے کے لئے ملک صاحب کی داشتہ سے ٹکرا دیا تھا۔

یہ بھی تو ممکن تھا مستقبل میں اختر ہی اس کے لئے پھانسی کا پھندہ بن جائے.....؟

اس نے اچانک ہی پستول اختر کی کپٹی پر رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ صورت حال کے اچانک بدل جانے پر حواس باختہ اختر کچھ سمجھ پائے۔ یکے بعد دیگرے تین گولیوں نے اس کا بھیجا اڑا کر رکھ دیا۔

زمین پر لیٹے دونوں دہشت زدہ انسانوں کو سمجھ ہی نہ آ سکی کہ ان کے نزدیک ہوس اور درندگی کا کیسا ہولناک کھیل جاری ہے..... کیشیئر جو کمزور دل کا آدمی تھا اسی لمحے بے ہوش ہو گیا.....!

ارسلان نے پھرتی سے تھیلا سنبھالا۔ اسے موٹر سائیکل پر موجود دوسرے تھیلے میں منتقل کیا۔ دوسری موٹر سائیکل کا پٹرول پائپ کھینچ کر اس نے پٹرول باہر گرنے دیا پھر کچھ فاصلے سے پٹرول پر مارجس کی جلتی ہوئی تیلی پھینک دی۔

موٹر سائیکل جلنے لگی تھی.....!

دوسرے ہی لمحے وہ اپنی موٹر سائیکل کو سڑک کی طرف اڑائے چلا جا رہا تھا۔ اسے منصوبے کے باقی حصوں پر خود ہی عمل کرنا تھا۔ چہرے سے لگی نقاب اس نے اتار کر پھینک دی تھی۔ جب تک دونوں کو ہوش آتا وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

منصوبے کے مطابق وہ بڑی سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دریا کے پل تک پہنچ گیا۔ یہ پل یہاں ہنگامی طور پر بنایا گیا تھا۔ پل پر کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور موٹر سائیکل سے تھیلا اتار کر اسے دریا برد کر دیا۔

اب وہ دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ اس درخت کی طرف بھاگ رہا تھا جہاں ان

لوگوں نے موقعہ واردات پر جانے سے پہلے بیک چھپا دیا تھا جسے انہوں نے بعد میں استعمال کرنا تھا۔

○

گھنے درخت کی آڑ میں چھپ کر اس نے بیک سے کپڑے نکال کر تبدیل کئے۔ اپنے جسم پر موجود کپڑے جو اس کے سائز سے کم از کم دو گنا بڑے تھے اور اس نے اس واردات میں استعمال کرنے کے لئے غریب بازار سے خریدے تھے بیک کے تھیلے میں ڈال دیئے۔ تھیلے والی رقم اس نے بیک میں منتقل کر لی تھی اور بیک میں موجود کپڑوں کے دو جوڑوں میں سے ایک جوڑا خود پہن لیا تھا۔ گرم چادر اس نے مقامی لوگوں کی طرح اوڑھ لی تھی اور اب بڑے اطمینان سے چلتا ہوا سڑک کی طرف جا رہا تھا۔

تین چار منٹ بعد ہی اسے ایک مسافر بس اس طرف آتی دکھائی دی اور وہ بس کے ذریعے اپنے شہر کی بجائے دوسرے شہر کی طرف عازم سفر تھا۔ دو گھنٹے بعد وہ اس شہر میں اتر گیا۔ یہ شہر اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہاں کے سکول میں اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنے سکول کے زمانے کا اکاؤنٹ اس نے کبھی ختم نہیں ہونے دیا تھا اور ملک صاحب یا اس کے کسی دوست کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ کسی اور شہر میں بھی اس کا کوئی اکاؤنٹ ہے۔

○

رات اس نے یہاں بسری اور صبح بینک میں کچھ رقم اپنے نام سے جمع کروا کے اپنے شہر کی طرف چل دیا۔ اخبار میں اس نے ڈاکے کی خبر تو پڑھ لی لیکن ابھی تک پولیس مرنے والے ڈاکوؤں کی شناخت کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

وہ جانتا تھا شناخت میں بھی دو تین روز لگ جائیں گے۔ اس دوران اس نے باقی معاملات سے نمٹنا تھا۔ اپنے شہر پہنچ کر اس نے آدھی سے زیادہ رقم یہاں تین بینکوں میں موجود اپنے اکاؤنٹس میں منتقل کر دی اور باقی رقم کے ساتھ اطمینان سے گھر واپس آ گیا۔

ابھی تک کسی کو اس کے رات بھر غائب رہنے کا علم نہیں ہوا تھا۔ رات کو وہ معمول کے مطابق اپنی چنڈال چوکڑی کے ساتھ معمول کی سیر کو نکل گیا۔ انہوں نے اختر اور جاوید کی کمی کو

محسوس تو کیا تھا لیکن کسی نے خاص ذکر نہیں کیا۔

رات دیر گئے وہ نازنین کے پاس پہنچ گیا۔ مطلوبہ رقم اس نے نازنین کی نائیکہ ماں کی جھولی میں ڈال دی اور رات بھر اس کے ساتھ اپنا غم غلط کرتا رہا۔ دوپہر کے بعد اپنے گھر پہنچ گیا کیونکہ ملک صاحب نے شام کی فلائٹ سے واپس آنا تھا اور اس نے پارٹی کارکنوں کے ساتھ انہیں ایئر پورٹ پر لینے جانا تھا۔

☆☆☆

شطرنج کے مہرے

ملک صاحب کو وہ لوگ حسب روایت پھولوں کے ہار سے لاد کر جلوس کی شکل میں ہوائی اڈے سے ان کے گھر تک لے کر آئے تھے۔

اس درمیان ملک صاحب نے خاص طور پر اختر اور جاوید کی غیر حاضری محسوس کی تھی جس کا ذکر انہوں نے گھر پہنچتے ہی ارسلان سے کیا۔

”سناؤ کیسے رہے تین چار دن حالات؟“

”سرجی! مزہ آ گیا۔ ہم نے اپنے چاروں ساتھیوں کا بدلہ لے لیا ہے۔ وہ جو کالج والا لڑکا ہے نا اس کی دونوں ٹانگیں توڑ دی ہیں اور اس جزل سیکرٹری کی اولاد کو بھی ٹھپہ لگا دیا ہے۔ سارے لے کیا د کریں گے۔“ اس نے ملک صاحب کو اپنی کارگزاریوں سے آگاہ کیا۔

”وہ دونوں اختر اور جاوید نظر نہیں آ رہے۔!“ ملک صاحب نے پوچھا۔

ایک لمحے کے لئے تو ارسلان کا دل زور سے دھڑکا لیکن اب اس کے لئے یہ سب کچھ ایسی غیر معمولی بات نہیں رہی تھی۔ اس نے انسانی اذیت کی انتہا کر بھی دی تھی اور دیکھ بھی لی تھی اس لئے اب کوئی قتل اس کے سرچڑھ کر بول نہیں سکتا تھا۔

”جاوید کو دیکھتے تو مجھے بھی سات آٹھ روز ہونے کو آئے ہیں اختر البتہ تین چار روز پہلے

تک ہمارے ساتھ تھا۔ بلکہ کل پرسوں دوسرے لوگوں نے بھی اس کی کمی محسوس کی۔۔۔۔۔ ملک صاحب! برا مت مانیے۔ یہ لوگ آپ سے کچھ زیادہ ہی لفت لے رہے ہیں اور دوسرے کا رکن اس بات کو بہت محسوس کرنے لگے ہیں۔۔۔۔۔ اب یہی لے لیجئے ان لوگوں کا خیال تھا کہ جاوید آپ کے ساتھ ہے۔“

ارسلان نے الٹا چور کو تو ال کو ڈانٹنے والی حکمت عملی سے کام لیا۔

”نہیں بیٹا! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میرے لئے سب کا رکن قابل عزت ہیں۔۔۔۔۔ تم جانتے ہو کہ میں سب سے زیادہ تمہیں چاہتا ہوں لیکن اب مجھے ان دونوں کے متعلق تشویش ہونے لگی ہے، کہیں وہ مخالفوں کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئے؟“

ملک نے عندیہ ظاہر کیا۔

”ملک جی اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو ہمیں خبر ہو جاتی۔ آپ جانتے ہیں اس وقت بھی ان کے ہیڈ کوارٹر میں اپنے تین آدمی کام کر رہے ہیں۔ ان کی طرف سے ایسی کوئی اطلاع تو نہیں ملی۔ پرسوں ان لوگوں نے خاور پر حملہ کیا تھا۔ اس کا بازو ٹوٹ گیا ہے۔ اگر ان دونوں۔۔۔۔۔“ تھوڑی دیر کے لئے وہ رک گیا، پھر اچانک کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”پھر بھی میں یہ نہ کروالیتا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ملک کے فون سے ہی مخالف تنظیم کے ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملایا۔

”میرا نام سلیم ہے جی! ذرا مشتاق صاحب کو بلا دیں۔ بہت ضروری کام ہے۔“ اس نے دوسری طرف سے استفسار پر کہا۔

تھوڑی دیر بعد مشتاق لائن پر تھا۔ اس نے ہوں ہاں کرتے ہوئے ارسلان کی بات سنی۔

”نہیں بھائی جان سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وہ یہاں آتے تو مجھے ضرور ملتے۔ میں تو یہاں چار روز سے کہیں گیا ہی نہیں۔ امتحانات کی تیاری کر رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے جواب ملا۔

”ٹھیک ہے پھر تو اور پریشانی والی بات ہو گئی ناں۔“ اس نے کہا۔

”آپ خود تکلیف نہ کیا کریں۔ میں بتا دوں گا جب بھی ادھر آئے۔“ دوسری طرف

سے کہا گیا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

نہ، لاج۔ ”ملک صیاجب! کمال ہے۔ آخر انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔“ ارسلان نے پریشانی کا اظہار کیا۔

”ان کے سارے ٹھکانے چیک کرو۔ سمجھ نہیں آتی اس طرح بتائے بغیر وہ جانے والے نہیں۔۔۔۔۔ ایک بات تو ظاہر ہے وہ دونوں اکٹھے ہی غائب ہوئے ہوں گے۔“ ملک صاحب نے خود بخود ایک اندازہ قائم کرتے ہوئے کہا۔

”ابھی دیکھ لیتے ہیں۔۔۔۔۔“ کہتے ہوئے ارسلان نے دو تین ٹیلی فون نمبر ملائے لیکن جواب میں ہر طرف مایوسی کا اظہار کیا گیا۔ آدھ گھنٹہ تک دونوں کوشش کرتے رہے لیکن انہیں نہ ملنا تھا نہ ملے۔

ملک کے چہرے پر اب کچھ پریشانی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ ”یہ لوگ کچھ زیادہ ہی لفٹ لینے لگے ہیں۔ میں نے کہہ رکھا ہے کہ مجھے بتائے بغیر کوئی واردات نہیں کرنی لیکن۔۔۔۔۔!“ اتنا کہہ کر ملک خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

”ارسلان! تم خود ایک کام کرو۔ جاوید کا ایک سکوتر چور دوست ہے۔ میں جانتا ہوں اسے۔ ایک دو مرتبہ اس نے سفارش کروائی ہے اس کی۔ مجھے شک ہوتا ہے کہ وہ کہیں اس کے ساتھ مل کر تو کوئی چکر نہیں چلا رہا۔۔۔۔۔ کہیں پھنس نہ گیا ہو۔۔۔۔۔ لیکن اختر۔۔۔۔۔“ ملک کو اچانک ہی کچھ یاد آ گیا تھا۔

”آپ اطمینان رکھئے جناب میں ابھی نکلتا ہوں اس مشن پر۔“ ارسلان نے ملک سے کسی سکوتر چور دوست کا ایڈریس سمجھتے ہوئے کہا۔

○

اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ وہی ہوگا جس سے جاوید نے موٹر سائیکلیں اس واردات کے لئے حاصل کی تھیں۔ اپنے دو تین ساتھیوں کے ساتھ وہ اس کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان لوگوں نے اس چور دوست کو رات تک قابو کر لیا تھا اور اب اپنے تفتیشی سینٹر میں لے آئے تھے۔

پہلے تو وہ جاوید سے ملاقات ہی سے انکار کرتا رہا لیکن دو تین منٹ کے بعد ہی اس نے انہیں بتایا کہ کچھ روز پہلے جاوید اس سے دو موٹر سائیکلیں مستعار لے گیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ وہ

کوئی واردات کرنے جا رہا ہے۔ واردات کی نوعیت سے وہ بے خبر تھا۔

ارسلان کے ساتھیوں نے ٹھونک بجا کر تسلی کر لی تھی کہ اس کا بیان حرف بحرف درست ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ٹیلی فون پر ملک صاحب کو تفتیش کے نتائج سے آگاہ کر رہے تھے۔ ملک صاحب کے حکم پر جس طرح اس چور کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہاں لائے تھے اسی طرح اس کے ٹھکانے پر چھوڑ آئے۔

رات گئے تک وہ لوگ اندازے قائم کرتے رہے کہ جاوید نے موٹر سائیکلیں کس لئے حاصل کی تھیں۔ اچانک سکندر کو چند روز پہلے والی واردات یاد آ گئی۔ ڈکیتی کی یہ خبر اخبارات میں دو تین روز تک زیر بحث رہی تھی۔ اس نے سب کا دھیان اس خبر کی طرف دلایا۔

”لیکن وہاں تو لکھا تھا کہ ڈاکو تین تھے اور تیسرا فرار ہو گیا ہے۔ بھاگنے سے پہلے وہ اپنے ایک ساتھی کو بھی گولی مار گیا تھا۔“ اکبر بولا۔

”کچھ بھی ہو“ آخر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ ابھی تک لاشوں کی شناخت تو نہیں ہو سکی۔“ ارسلان نے رائے دی۔

”ارسلان بیٹا! تم سکندر کو لے کر اس ہم پر نکلو۔ کوشش کرنا کہ پولیس کو لا علم رکھ کر اس کی شناخت کر سکو۔ اگر خدا خواستہ وہ اپنے ہی بندے ہوئے تو چپ چاپ نکل آتا۔ ابھی ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ایکشن سر پر کھڑا ہے اور مجھے پارٹی ٹکٹ مل چکا ہے۔۔۔۔۔!“ ملک صاحب نے کہا۔

”آپ بے فکر ہیں ملک صاحب! اگر تو لاشیں ابھی مردہ خانے میں ہیں تو پولیس کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ اگر انہوں نے لاشیں ضائع کر دی ہیں پھر تصاویر تو ظاہر ہے پولیس کے قبضے میں ہی ہوں گی۔“ سکندر بولا۔

میرے خیال سے ابھی تک لاشیں سنبھالی ہوئی ہیں۔ بصورت دیگر اخبارات میں تصاویر ضرور شائع کی جاتیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ پولیس نے اس ڈکیتی میں مرنے والوں کی تصاویر شائع نہیں ہونے دیں۔“ ارسلان بولا۔

”شاید انہیں تیسرے آدمی کی تلاش ہو۔ وہ سمجھتے ہوں کہ تصویروں کے شائع ہونے سے تیسرا ڈاکو ہشیاز نہ ہو جائے۔“ سکندر نے اپنی رائے دی۔

خوف کی ایک لہر ارسلان کی ہڈیوں میں سرایت کر گئی۔
اگلے روز وہ سکندر کے ساتھ واردات والے شہر کے سرکاری مردہ خانے کی طرف چا رہے تھے۔

مردہ خانے کے باہر پولیس گارڈ مستعد بیٹھی تھی لیکن ارسلان نے انہیں ”رام“ کر لیا۔
اس نے حوالدار سے کہا تھا کہ ان کا ایک ساتھی کچھ دنوں سے غائب ہے اور اپنا شک دور کرنے کے لئے ہر نامعلوم لوٹ کو دیکھنے چلے آئے ہیں۔

”لیکن باؤجی یہ تو ڈاکو تھے!“ حوالدار نے گہری نظروں سے دونوں کا جائزہ لیا۔
”یار وہ بھی کوئی شریف آدمی نہیں تھا.....!“ ارسلان نے سو کا ایک نوٹ حوالدار کی مٹھی میں دیتے ہوئے کہا۔

”کم ہے جناب، تین آدمی ہیں۔“ اس نے سو کے نوٹ پر نظر ڈال کر بے حیائی سے دانت نکال دیئے۔

”اچھا یار ہم بھی کوئی امیر آدمی نہیں ہیں، بس اور بات نہ کرنا۔“ اتنا کہتے ہوئے سکندر نے پچاس کا ایک نوٹ اس کا تھا دیا۔

”ایسا ایک اور نکالیں باؤجی!“ حوالدار نے ڈھٹائی سے دانت نکال دیئے۔
”یار تم تو حد کر رہے ہو۔“ ارسلان نے بیس روپے اس کی طرف بڑھا کر مردہ خانے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”جیسی مرضی جناب کی.....!“ حوالدار نے نوٹ اپنی جیب میں ٹھونٹے ہوئے کہا۔
ارسلان کے لئے تو یہاں کچھ بھی خلاف توقع نہیں تھا لیکن سکندر تو سنانے میں آ گیا۔
”اف میرے خدا یا تمہارا شک صحیح ثابت ہوا.....!“ ارسلان نے سکندر کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

”یار میں نے تو اندازہ ہی لگایا تھا۔ تم جانتے ہی ہو مبینہ میں ایک آدھ بار کارروائی تو پٹرول پمپ وغیرہ لوٹنے کی جاوید ڈال ہی دیا کرتا تھا، لیکن اختر! اور پھر وہ تیسرا کون تھا؟“ سکندر خاموش ہو کر دیوار کو گھورنے لگا۔

”اختر بھی چھپا رہا تھا۔ میرا خیال ہے انہوں نے کسی پیشہ ور کھلاڑی کے ساتھ ہمیں

لا علم رکھ کر کارروائی ڈالنے کی کوشش کی ہوگی۔ تم تو جانتے ہو یا آج کل جاوید کا باز احسن میں جانا کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا..... بہانہ تو ملک صاحب کا ہی ہوتا تھا۔ شاید وہاں کوئی معاشقہ چل رہا تھا اور یار جی نے اپنی محبوبہ پر رعب گانٹنے کے لئے لمبا ہاتھ مارنے کی سوچی ہوگی..... میرے ذہن میں تو یہی بات آتی ہے لیکن یہ اختر کہاں سے پھنس گیا؟“

ارسلان کا چہرہ بالکل نارمل تھا۔
وہ اتنا پرسکون نظر آ رہا تھا جتنا کوئی عادی مجرم بھی نہ آ سکے۔
جرائم مار دھاڑ، تشدد اور جنسیات کے سیلاب میں بہہ کر شاید اس کے اندر موجود ضمیر نام کی چڑیا اڑ گئی تھی یا چہرے پر احساس ملامت کو چھپائے رکھنے میں اس نے کمال حاصل کر لیا تھا۔

○

دونوں نے ملک صاحب کو رپورٹ دی تو ایک لمحے کے لئے ملک صاحب کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

اگر یہ خبر مخالف تنظیم کی ہو جاتی کہ انقلابی تنظیم کے دو اہم رکن ڈاکو زنی کی واردات میں مارے گئے ہیں تو وہ ملک صاحب کا سیاسی حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتے۔

شام تک وہ فکر میں غلطان رہا کہ اب کیا کیا جائے؟ ارسلان اور سکندر واپس آ چکے تھے۔

”جس طرح بھی ممکن ہو اس خبر کو چھپانا ہے عوام کی نظروں سے اور سب سے بڑھ کر دشمنوں کی نظروں سے۔ اگر کسی کو علم ہو گیا تو قیامت آ جائے گی۔“

ملک صاحب کو ان لوگوں نے آج پہلی مرتبہ اتنا پریشان دیکھا تھا۔
”کیا طریقہ ہو سکتا ہے سر؟“ سکندر نے پوچھا۔

”لاشوں کو لاوارث قرار دے کر دفن کروادو۔ جتنی جلدی ممکن ہو۔“ ملک نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”لیکن سر.....!“

”کیا لیکن.....؟“ سکندر نے کچھ کہنا چاہا لیکن ملک صاحب نے اس طرح پھاڑ کھانے والے لہجے میں اس کی بات کاٹی کہ وہ لرز کر رہ گیا۔

اس کے فیصلے بڑے سفاکانہ ہوتے تھے۔

اس نے ایسی ہی چال بازیوں کے سہارے سیاست کے جانے کتنے خاردار پاٹ لئے تھے۔ مخالفین کو ملک نے کبھی بھونکنے والے کتوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کا اصول تھا کہ کانٹے والے کتے بھونکا نہیں کرتے، جیسا کہ بھونکنے والے کتے کاٹا نہیں کرتے۔..... ملک کے ہمراہی جانتے تھے کہ کبھی وہ کچھ نہیں کہتا جو اس نے کرنے کی ٹھانی ہو اور جو کرنے کی ٹھان لے اس سے کبھی نہیں رکتا، خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔

○

اگلے روز علی الصبح دونوں اپنی منزل کی طرف عازم سفر تھے۔ ان کی آمد سے پہلے ڈی ایس پی کے ساتھ ”مک مکا“ ہو چکا تھا۔ اس کی حیثیت کے مطابق اس کی قیمت چکادی گئی تھی اور اب ان دونوں نے اپنی موجودگی میں باقی معاملے طے کر دئے تھے تاکہ ملک صاحب کو ”سب اچھا“ کی حتمی رپورٹ دے سکیں۔

مقتولین کی لاشیں ناقابل شناخت قرار پا چکی تھیں۔ پولیس کے مستعد اہلکاروں نے راتوں رات کاغذات مکمل کر کے صبح مقامی مجسٹریٹ کے حضور پیش کر دیئے تھے۔ ضابطے کی کارروائی مکمل تھی۔

ریٹائرنگ روم میں تشریف فرما مجسٹریٹ صاحب بہادر نے کاغذات پر سرکاری مہر کے ساتھ دستخط ثبت کر دیئے اور اب لاشوں کو کفن دفن کے معاملات سے گزارا جا رہا تھا، لاشیں دفن کر دی گئیں۔

لیکن.....!

دونوں جانتے تھے کہ راتوں رات ان لاشوں کو بھی لیبارٹریوں میں پہنچا دیا جائے گا جہاں میڈیکل کے طلباء ان پر تجربات کریں گے اور اس کی الگ قیمت وصول کی جائے گی۔ دوپہر تک تمام مراحل بخیر و خوبی طے پا گئے اور دونوں ہونہار و رکروں نے ملک صاحب کو مقامی ٹیلی فون ایجنسی سے ہی ”سب اچھا“ کی رپورٹ دے دی۔

عین ان لمحات میں جب وہ دونوں اس قصبے میں ایک غیر انسانی اور وحشیانہ کام میں مصروف تھے ان کے ساتھی اپنے وکیل کے ساتھ شہر کے ایس پی صاحب کے دفتر میں جھگھٹا لگائے

”م..... میرا مطلب.....“ اس نے گھگھیاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔

”تمہارا مطلب تھا کہ ان دونوں شہیدوں کے جنازے بڑی شان و شوکت کے ساتھ اٹھائے جاتے کیونکہ انہوں نے بڑا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے یا پھر وہ دشمن تنظیم کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔“ ملک صاحب نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”سکندر پاگل مت بنو..... سر کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرو اور یہ مت بھولو کہ تم بھی تین مقدمات میں پولیس کو مطلوب ہو۔ میرے متعلق بھی تم جانتے ہو۔ اگر ان لاشوں کی شناخت ہوگئی تو کھاتہ کھل جائے گا اور مخالف تنظیم ہمارے خلاف اتنا پراپیگنڈہ کرے گی کہ لوگ ہمارے منہ پر تھوکتا پسند نہیں کریں گے۔“ اس مرتبہ ملک کی بجائے ارسلان نے سکندر کی طرف دیکھ کر آنکھ دباتے ہوئے اسے ”موقعے کی نزاکت“ کا احساس دلایا۔

سکندر اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ارسلان نے اسے احساس دلایا تھا کہ وہ ملک صاحب کو اپنے باغیانہ خیالات کا احساس نہ ہونے دیں بصورت دیگر ان کے لئے مسائل کا ناقابل عبور پہاڑ کھڑا ہو جائے گا جس سے سرنگر انکرا کر وہ پاش پاش ہو جائیں گے۔

سکندر نے معذرت خواہانہ انداز میں اپنی گردن جھکا کر ملک صاحب کی اطاعت پر صا در دیا تھا۔

”اس علاقے کے ڈی ایس پی صاحب سے مل لینا۔ میں اس دوران اسے قابو کرنا ہوں۔ لاشوں کو لاوارث قرار دے کر دفن کرنے کا بندوبست کرنا ہوگا اور تمہیں ہر مرحلے پر ان لوگوں کی مدد کرنا ہے۔ نیچے والے عملے کو قابو میں رکھنا پیسوں کی پروا نہ کرنا..... اور ہاں مشتاق سے کہنا کہ آج شام ہی دونوں کے اغوا کی رپورٹ پولیس کو لکھوا دے۔ اس اغوا میں مخالف تنظیم کے مقامی صدر اور جنرل سیکرٹری کے علاوہ کم از کم آٹھ دس ایسے ورکروں کو ملوث کر دو جن کا آزار ہنا ہمارے لئے خطرناک ہوگا۔ وکیل سے مل لینا۔ وہ تمہیں ساری کہانی سمجھا دے گا اور پرچہ درج کروانے تمہارے ساتھ بھی جائے گا۔

خبردار موقعے کے گواہ ذرا مضبوط تیار کرنا۔ میں نہیں چاہتا کہ اگلے الیکشن سے پہلے ان لوگوں کی ضمانتیں ہوں اور یہ باہر آ کر ہمارے لئے مسائل کھڑے کریں۔“

ملک نے ایک تیر سے کئی شکار کھینے کا فیصلہ کیا تھا۔

کھڑے تھے۔ اس ہجوم کی قیادت انقلابی طلباء تنظیم کا صدر مشتاق کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو زخمی طالب علم موجود تھے۔ ایک کے بقول اس کے ہاتھ پر گولی لگی تھی اور دوسرے کی ران میں خنجر سے زخم لگایا گیا تھا۔

ان لوگوں نے حلفیہ بیان دیا کہ وہ اختر اور جاوید کے ساتھ بس سٹاپ پر دیگیں کے منتظر تھے کہ وہیں اچانک ایک دین آ کر رکی جس میں موجود پندرہ بیس لڑکے ان پر پل پڑے۔ حملہ آوروں کی قیادت مخالف طلباء تنظیم کا صدر اور سیکرٹری جنرل کر رہے تھے۔ انہوں نے ریوالتوروں، خنجروں اور ڈنڈوں سے حملہ کیا۔ صدر نے نذیر پر گولی چلائی جو اس کے ہاتھ پر لگی جب کہ جنرل سیکرٹری کے خنجر کا دار دوسرے طالب علم حیات کی ران پر ہوا۔ وہ دونوں گر پڑے۔ حملہ آوران کے دونوں ساتھیوں اختر اور نواز کو اغوا کر کے لے گئے۔

وکیل نے اپنی موجودگی میں پرچہ درج کروایا اور ایف آئی آر ی نقل بھی حاصل کر لی تھی۔ ضابطے کی کارروائی مکمل ہوتے ہی مسز دہلو کو سرکاری ہسپتال پہنچا کر وہاں سے اپنی مرضی کی ”میڈیکل رپورٹ“ حاصل کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ہنگامی پریس کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں ملک صاحب کے مختلف اخبارات میں پروردہ رپورٹرز اس طرح پہنچے جیسے انہیں نجانے کب سے اس پریس کانفرنس کا انتظار تھا یا پھر جیسے یہ پریس کانفرنس کسی نازک ترین قومی مسئلے پر طلب کی گئی ہو۔

○

انقلابی طلباء تنظیم کے صدر مشتاق نے تمام ”تیار شدہ“ واقعات کی تفصیلات مزید مرجح مصالح لگا کر بیان کیں۔ مخالف تنظیم کی غنڈہ گردی، دہشت گردی کا جی بھر کے رونا دہنایا اور پولیس کو وارنٹ دی کہ اگر 24 گھنٹے کے اندر ان کے اغوا شدہ ساتھی برآمد نہ ہوئے اور حملہ آوروں کو گرفتار نہ کیا گیا تو اس کے لئے طلباء برادری کے جذبات پر قابو رکھنا ممکن نہیں رہے گا اور حالات بگڑنے کی تمام تر ذمہ داری پھر پولیس پر عائد ہوگی۔

اس دھمکی کے ساتھ ہی پریس کانفرنس اپنے اختتام کو پہنچی۔ اخبار نویسوں نے اپنے سامنے موجود پیسٹریوں اور پیٹیز کے ڈھیر پر حملہ کر دیا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اس وقت تک کھاتے رہے جب تک کسی پلیٹ میں کوئی ایک کھانے والی شے بھی موجود رہی۔ چائے کی

چمکیاں لیتے ہوئے ”حصہ بقدر جست“ کے مصداق سب اس پریس کانفرنس کے کرتا دھرتا کی طرف سے فراہم کردہ لفافے اپنی جیبوں میں منتقل کرنے لگے۔

پریس اور اخبارات ایک ساتھ حرکت میں آئے.....!

نمایاں سرخیوں کے ساتھ خبریں پھیں جبکہ راتوں رات پولیس کے مسلح جوانوں نے ایف آئی آر میں نامزد ملزمان میں سے آدھے سے زیادہ اپنے قابو میں کر لئے۔ ان میں وہ بے چارے بے گناہ نوجوان شامل تھے جو امتحانات کی تیاری کر رہے تھے یا پھر جن کے صبح پیر ہونے والے تھے۔

بعد از خرابی بسیار پولیس ملزمان کے سر کردہ لیڈروں یعنی مقامی صدر اور جنرل سیکرٹری کو گرفتار نہیں کر سکی تھی نہ ہی ابھی تک اغوا کنندگان کو برآمد کیا جاسکا تھا۔

اگلے روز شام کو مقامی پولیس کی طرف سے پریس کانفرنس میں کہا گیا کہ پولیس نے سارے شہر کی ناکہ بندی کی ہوئی ہے اور ملزمان پک کر نہیں جاسکتے خواہ وہ کتنے ہی بااثر ہوں قانون کی گرفت سے نہیں نکل پائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی انقلابی طلباء تنظیم کے کارکنوں کو پراسن رہنے کی اپیل کی گئی تھی۔

پولیس کی اس اپیل کے جواب میں انقلابی طلباء تنظیم کے صدر مشتاق نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ وہ پولیس کی طرف سے یقین دہانی کے بعد اپنے الٹی میٹم میں 48 گھنٹے کا اضافہ کر رہے ہیں اور مزید دو دن کے اندر اگر ان کے ساتھیوں کو برآمد نہ کیا گیا تو وہ سڑکوں پر نکل آئیں گے۔

”بے خبر“ اور ”بانجھ“ دونوں طرح کے اخبارات نے اپنی استعداد کے مطابق اس سانحے پر ادارتی نوٹ بھی اگلے روز شائع کئے تھے۔ ہوشیار اخبار نویسوں نے کسی پر الزام دھرے بغیر کسی کا نام لئے بغیر اس قبیح فعل کی زبردست مذمت کی تھی اور صوبائی حکومت کے لئے اس واقعے کو ایک چیلنج قرار دے کر کہا تھا کہ جلد از جلد اغوا کنندگان کو برآمد کروایا جائے۔ اخبارات نے اپنا عندیہ ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ طلباء کی سیاست میں اس حد تک تشدد خطرے کی گھنٹی ہے اور اس کا ختمی سے قلع قمع کرنا ناگزیر ہو چکا ہے۔

بعض مبصر تو بہت دور کی کوڑی لائے تھے اور انہوں نے اس واردات کے پس پردہ

”غیر ملکی ہاتھ“ کی کارستانی کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کیونکہ دشمن طاقتیں ایک عرصے سے ملکی سالمیت کو تہہ بالا کرنے پر تلی ہوئی تھیں اور انہوں نے اب طلباء برادری میں بھی اپنے ایجنٹ داخل کر دیئے تھے۔

اخبارات کی خبروں سے سارے صوبے کی فضا مغموم اور مسموم ہو گئی تھی۔ لوگ حالات کی اصلیت کو جانے بغیر اپنے اندازے قائم کر کے مفروضوں کی بنیاد پر رائے قائم کر رہے تھے۔ ایک بات پر اتفاق رائے تھا کہ یہ گھناؤنا جرم ہے اور اس کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کر کے ملزموں کو کیفر کردار تک ضرور پہنچایا جائے۔

ملک صاحب کے سامنے اخبارات کے ڈھیر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان کے شیطانی ذہن نے کئی منصوبے تخلیق کئے تھے جن پر وہ ایک ایک کر کے عمل کرنا چاہتے تھے۔ وہ اگلا الیکشن صرف جیتنا ہی نہیں بلکہ سرکار میں کوئی اہم منصب حاصل کرنا چاہتے تھے اور تقدیر نے سیاست کی ترپ چال ان کے ہاتھ میں دے دی تھی۔

ملک ایک بازی میں سب کوشش مات دینے کے لئے باولا ہوا جاتا تھا۔ اس نے بڑے جبر سے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ ملکی سیاست میں بھونچال آ گیا تھا۔ نئے الیکشن شیڈول کا اعلان کسی بھی دم ہوا چاہتا تھا اور ملک کوئی نیا داؤ کھیلنا چاہتا تھا۔

اس کی شیطانی مسکراہٹ روز بروز گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے سیاست کی گندی شطرنج پر اپنے مہرے ترتیب دے لئے تھے اور بڑی سمجھداری سے اب ایک ایک چال چل رہا تھا۔

○

طلباء تنظیموں کے درمیان جنگ کی سی فضا پیدا کر دی گئی تھی۔ ملک کے مختلف کالجوں میں جہاں جہاں، جس جس تنظیم کا زور چلتا تھا وہ لوگ اپنی طاقت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ درس گاہیں میدان جنگ کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

ملک کے سب سے بڑے صوبے میں اس طرح کے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ حکومت کو اپنا اقتدار خطرے میں پڑنا دکھائی دے رہا تھا۔ صوبے کے وزیر اعلیٰ کی طرف سے آئی جی پر دباؤ بڑھ رہا تھا اور آئی جی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟

سیکورٹی والوں کی طرف سے اس بات کی یقین دہانی کروادی گئی تھی کہ لڑکے اغوا نہیں ہوئے نہ ہی ایسا کوئی واقعہ ہوا ہے جس کی رپورٹ لکھائی گئی ہے۔ یہ سب من گھڑت کہانی تھی اور رپورٹ درج کروانے والوں نے خود ہی اپنے ساتھیوں کو زخمی کر کے یہ ڈھونگ رچایا تھا۔

آئی جی نے مخالف تنظیم کے مرکزی صدر سے مذاکرات کر کے منت سماجت بھی کی تھی کہ وہ اپنے ضلعی مفرد صدر اور جنرل سیکرٹری کو پیش کر دیں۔ انہوں نے یقین دلایا تھا کہ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر انتظامی تنظیم کی من گھڑت کہانی کو غلط ثابت کر دیں گے لیکن اس کے لئے نامزد ملزمان کی گرفتاری ضروری تھی۔

”اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر بتائیے کہ یہ رپورٹ سچ ہے؟“ مخالف تنظیم کے صدر نے آئی جی کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

”میرے یقین کی حد تک غلط ہے لیکن فی الوقت حالات کا تقاضا یہی ہے کہ ہم طلباء کے جذبات ٹھنڈے رکھنے کے لئے ان لوگوں کو گرفتار کریں۔“

”میری زبان زیب نہیں دیتی کہ آپ کو کوئی غلط بات کہوں لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ جب آپ خود جانتے ہیں کہ ان لوگوں نے جھوٹ بولا ہے تو ایک جھوٹ کی بنیاد پر آپ کا ردوائی کیوں کر رہے ہیں؟ آپ عوام کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ یہ ہمیں بدنام کرنے کی اوجھی حرکت ہے اور سب سے بڑھ کر حیرت کی بات تو یہ ہے کہ آپ ایک غلط کام کے لئے ہمیں قربانی کا بکر بھی بنانا چاہتے ہیں۔“

صدر کا لہجہ خاصا تلخ تھا.....!

”کاش تمہیں میری مجبوریوں کا احساس ہوتا!“ آئی جی نے بے بسی سے کہا۔

”مجھے احساس ہے آئی جی صاحب کہ آپ پر کتنا دباؤ ہے لیکن آپ اس روایت کو توڑتے کیوں نہیں؟ آپ غلط دباؤ کو قبول کیوں کرتے ہیں؟ کسی غلط بات کے سامنے محض اپنی نوکری کے لئے سر کیوں جھکاتے ہیں؟ آئی جی صاحب! یاد رکھئے ہم کبھی اپنے ساتھیوں کو قربانی کا بکر نہیں بنائیں گے کیونکہ ہمیں اور آپ کو بھی ایک روز خدا کے حضور پیش ہونا ہے جہاں کوئی مصلحت اور مجبوری معافی نہیں دلا سکے گی۔“ صدر کا لہجہ بڑا پر اعتماد اور جان لیوا تھا۔

آئی جی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے؟

زمین نہیں پھٹتی تھی کہ وہ اس میں سما جائے۔
لیکن.....!

اچانک ہی وہ اپنی جگہ پر تن کر کھڑے ہو گئے۔
”شکریہ بیٹا! تم نے مجھے میرے فرض کا احساس دلادیا۔“

○

وہ تیزی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر آ گئے۔ ان کا رخ چیف منسٹر ہاؤس کی طرف تھا جہاں ایک خصوصی اجلاس امن و امان کے مسئلے پر طلب کیا گیا تھا۔

”جناب والا! میں کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ مقدمہ جھوٹا ہے۔ کسی نے اختر اور جاوید کو اغوا نہیں کیا اور نہ ہی ان لوگوں کو کسی نے زخمی کیا ہے۔“
”آئی جی صاحب آپ کیا بات کر رہے ہیں؟“ نام نہاد ”شہری امن کمیٹی“ کے سربراہ نے حیرانی اور غصے کے ملے جلے تاثرات سے آئی جی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیا آپ ہوش و حواس میں ہیں.....؟“ ایک اور صاحب غرائے۔

”جناب والا! میں جو عرض کر رہا ہوں بھائی ہوش و حواس کہہ رہا ہوں۔ آپ سی آئی ڈی والوں سے علیحدہ انگوائری کی رپورٹ مانگ سکتے ہیں۔ اس ملک میں متعدد ایجنسیاں ہیں آپ کسی سے بھی رپورٹ مانگ سکتے ہیں۔“ آئی جی اپنے ارادے میں اٹل تھے۔

”آئی جی صاحب! آپ جانتے ہیں انقلابی طلباء تنظیم سے ہمارے سیاسی روابط کتنے گہرے ہیں۔ اگر آپ کے ارشادات ”آن دی ریکارڈ“ آگئے تو ہماری کمرٹوٹ جائے گی۔ ہم نے اس شہر میں سیاست کرنی ہے آئی جی صاحب۔“ ایک وزیر بات دیر کو طیش آ گیا.....!

”جو حقیقت تھی وہ میں نے گوش گزار کر دی۔ اس کے بعد جو حکم آپ فرمائیں۔ ہم اس کے پابند ہیں لیکن میری درخواست ہوگی جناب والا کہ کسی غیر قانونی حکم کی تعمیل پر پولیس کو مجبور نہ کیا جائے۔ اسی میں ہم سب کی بہتری ہوگی.....!“ آئی جی نے یہ بات براہ راست وزیر اعلیٰ کی آنکھوں میں جھانک کر کہی تھی۔

”ٹھیک ہے.....!“ وزیر اعلیٰ نے گلا کھٹاکر کہا: ”ہمیں دوسری ایجنسیوں کی رپورٹ بھی مل لینے دیجئے۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہو سکے گا..... آپ جاسکتے ہیں۔“

وزیر اعلیٰ نے دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے معاملہ سنبھال لیا۔
آئی جی نے کھڑے ہو کر سر پر ٹوپی جمائی، سیلوٹ کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے کانفرنس روم سے باہر آ گئے۔ ان کے دل و دماغ سے ایک بوجھ اتر گیا تھا۔
ان کی روانگی کے فوراً ہی بعد وزیر اعلیٰ نے ایک ہنگامی اجلاس شام گئے طلب کیا تھا۔
اس سے پہلے وہ خود خفیہ ایجنسیوں کی رپورٹ کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔

شام گئے تک انہیں ایجنسیوں کی رپورٹ مل چکی تھی جنہوں نے آئی جی کے بیان کی تصدیق کی تھی۔ ان لوگوں کو کوئی ایسا کلیو نہیں ملا تھا جس کی بنیاد پر وہ اس اغوا کے ذمہ دار مخالف طلباء تنظیم کو ٹھہرا سکتے۔

وزیر اعلیٰ گہری سوچ میں ڈوبے دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک ہی ان کا ماتھا ٹھکا۔
”کہیں یہ مخالفوں کی کوئی چال نہ ہو..... کہیں مخالف سیاسی پارٹی نے دونوں کو اغوا کر دیا کہ وہ طلباء تنظیموں کو آپس میں ٹکرانے کا منصوبہ تو نہیں بنالیا.....!“
”بہت سنبھل کر کوئی بھی اگلا قدم اٹھانا ہو گا سر!“

ان کے سیاسی مشیر نے جو خود سابقہ سٹوڈنٹس لیڈر تھا، مشورہ دیا۔ ”دشمن نے گہری چال چلی ہے۔ وہ ہمیں اپنی مرضی کے میدان میں لڑانا چاہتا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں دشمن کی بساط لیٹینی ہوگی اس کے بعد ہی کچھ اور سوچیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم کسی طرح دونوں تنظیموں کو ٹھنڈا کر دو۔ میں ملک صاحب کی ڈیوٹی بھی لگاتا ہوں۔ صرف وہی ایک آدمی ہے جو انقلابی طلباء تنظیم کو ٹھنڈا کر سکے گا۔ اگر ان لوگوں نے ہڑتال کر دی تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔ الیکشن سر پر آ رہے ہیں اور ہمارے دوست کسی ایسے ہی موقع کے منتظر ہیں جب وہ ہمارے صوبے میں سیاسی اتار کی پھیلا کر اچانک وزیر اعلیٰ کا اعلان کر دیں گے اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔“
وزیر اعلیٰ نے سنبھل کر کہا۔

○

شام گئے صوبائی سیاسی لیگ کے اہم لوگ وزیر اعلیٰ کے گھر جمع تھے۔ یہ لوگ موجودہ کرائس سے نمٹنے کے لئے اکٹھے ہوئے تھے۔ وزیر اعلیٰ نے پولیس اور سیکورٹی ایجنسیوں کی

رپورٹیں ان کے سامنے رکھ دیں۔ اب ہر کوئی حسب توفیق ان پر تبصرہ کر رہا تھا۔

یہاں جمع ہونے والے تمام ”سیاسی گلدھ“ ایک ہی بات پر متفق تھے کہ ان کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو سرکار دربار میں ان کے لئے باعث عتاب بن جائے۔ وہ بظاہر صوبائی لیگ کے پرانے ممبران اور وزیر اعلیٰ کے انتہائی بااعتماد ساتھی تھے لیکن منافقانہ پالیسی پر سختی سے عمل پیرا تھے۔

الیکشن سر پر ہونے کے سبب انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ اس مرتبہ صوبے سے ٹکٹ جاری کرنے کے کلی اعتبارات وزیر اعلیٰ کو بطور صوبائی صدر لیگ کے حاصل ہیں اور وہ اسے ہی ٹکٹ جاری کریں گے جو ان کی نگاہ ناز میں معتبر ٹھہرے گا اور وزیر اعلیٰ کی نگاہ ناز میں محترم ٹھہرنے کا ان کے نزدیک بہترین طریقہ یہی تھا کہ ان کی ہر سطح پر چالوسی کی جائے۔ یہ لوگ کوئی مشورہ دینے کے بجائے صرف بات کو آگے بڑھانے کے فلسفے پر دل و جان سے عمل پیرا تھے۔

”ملک صاحب! آپ اس ضمن میں کیا فرمائیں گے؟“

وزیر اعلیٰ نے بلاخر ”کام کے بندے“ کو متوجہ کیا۔

”میں سمجھتا ہوں جناب والا کہ یہ دشمن کی گہری سیاسی چال ہے اور اس کا مقابلہ بھی سیاسی سطح پر ہونا چاہئے۔ اگر ہم دشمن کے پھیلانے والے جال میں پھنس گئے تو پھر کبھی نہیں نکل پائیں گے۔ بجائے اس کے کہ ہم دشمن کی چال کا ردنا روکتے رہیں، ہمیں نہلے پر دھلا مار کر انہیں منہ کے بل گرانا ہوگا۔“

لوگ ہمہ تن گوش ملک صاحب کی باتیں سن رہے تھے۔

”آپ فوری طور پر آئی جی کا تبادلہ کرنے کے احکامات جاری کر دیں۔ اس کے ساتھ ہماری طرف سے یہ بیان آئے گا کہ طرہوں کی گرفتاری میں ناکام رہنے کے سبب آئی جی صاحب کی چھٹی ہوئی ہے۔ نئے آئی جی کی طرف سے مخالف طلباء تنظیم کو یقین دلادیتے ہیں کہ نہ صرف ان کے لوگوں کو گرفتار نہیں کیا جائے گا بلکہ حالات میں معمولی سی بہتری آتے ہی ان کے گرفتار شدہ ساتھیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ انقلابی تنظیم کی طرف سے آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں لڑکوں کو سمجھا دوں گا کہ معاملہ اخباری بیانات سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ پولیس کو سمجھا دیتے۔“

بچوں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے انہیں شہر میں ایک دو جگہ ناز جلانے کی اجازت دے دیں۔۔۔۔۔ اس سے آگے معاملہ نہیں بڑھے گا۔

جناب والا! چندہ میں روز میں انشاء اللہ میں حالات اس پنج پر لے آؤں گا کہ دونوں پارٹیوں کے لڑکے آپ کے سامنے مذاکرات کی میز پر بیٹھے ہوں گے۔ ان میں کم از کم اتنے عرصے کے لئے مفاہمت ہو جائے گی کہ ہم الیکشن کے دوران ان کی طرف سے بے نیاز رہ سکتے ہیں۔“

اپنی بات کے خاتمے پر اس نے فاتحانہ انداز میں حاضرین کی طرف دیکھا۔ وزیر اعلیٰ صاحب اس کی ذہانت کی دل ہی دل میں داد دے رہے تھے۔

”پاکھنڈی، بد معاش! سارا کھڑاک اسی سالے نے خود پھیلایا ہوگا اور اب خود ہی ”منڈیاں دالاما“ بن کر اپنے نمبر ٹانگ رہا ہے۔“

ایم پی اے بھنڈر نے اپنے ساتھ بیٹھے دوسرے ایم پی اے کے کانوں میں سرگوشی کی۔ بھنڈر ملک کی رگ رگ کو سمجھتا تھا لیکن بے بس تھا اور سوائے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن.....!

اچانک ہی ایک خیال آنے پر وہ مسکرایا۔ ”وہ مارا“ اس نے دل ہی دل میں کہا اور حاضرین کو اپنی طرف مخاطب کیا۔

”ملک صاحب!“ بھنڈر نے بظاہر ملک کو چاروں شانے چت کرنا چاہا۔۔۔۔۔ ”آپ اپنی تقریر میں تیسری اور سب سے اہم پارٹی کو نظر انداز کر گئے ہیں۔“

سب لوگ بھنڈر کی طرف چونک کر دیکھنے لگے۔

”میرے خیال سے دونوں اغوا کنندگان کے لواحقین کو نظر انداز کرنا بڑی بھیاں تک غلطی ہوگی۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ مخالف جماعت ان کے لواحقین کو ہمارے خلاف میدان میں لے آئے اور آپ کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جائیں۔“

”بھنڈر صاحب! معافی چاہتے ہوئے عرض کروں گا کہ آپ آج بھی وہی جاگیردارانہ سیاست لئے بیٹھے ہیں جو آپ کو بزرگوں سے شقل ہوئی تھی۔ بھنڈر صاحب! ریس میں کتے دوڑا لینے سے یا دو چار دیہاتی پنجائیوں میں دھونس دھاندلی سے قبضہ جما کر کوئی

ہتھ ٹوکا

نازنین نے حسب سابق اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور اس کی کوٹھے پر آمد کے ساتھ ہی وہاں ”تخلیہ“ کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔

”جائیں میں آپ سے نہیں بولتی۔ اتنے دن کہاں غائب رہے.....؟“ اس نے نازو ادا سے پان ارسلان کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”اختر اور جاوید اچانک غائب ہو گئے ہیں، بس ان کی پریشانی نے ہی مصروف رکھا۔“ ارسلان نے وضاحت کی۔

”ارسلان باؤ! اختر کو تو میں اتنا نہیں جانتی لیکن جاوید کے غائب ہونے کی بات سمجھ نہیں آتی، اسے کیا مصیبت پڑی تھی۔“

ارسلان سمجھ گیا کہ جاوید ان لوگوں کا ”ہتھ ٹوکا“ بھی تھا اور ملک صاحب اور ان کے درمیان رابطے کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ اس کے ذریعے ہی یہ لوگ ملک صاحب سے جائز و ناجائز کام نکلوا کرتے تھے۔ شاید براہ راست اپنے اور ان کے درمیان ملک صاحب رابطہ پسند نہیں کرتے تھے۔

”کنجروں کی دکھتی رگ“ پر ہاتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا ارسلان نے.....!!“

سیاستدان نہیں بنا کرتا۔ خدا کے لئے سیاسی سوچ اپنائیے۔ آپ کس دور میں بیٹھے ہیں آج زمانہ بدل چکا ہے۔ اگر ہم اس ملک کے دو گھرانوں کو سیاسی داؤ پیچ سے قابو نہیں رکھ سکتے تو ہمیں سیاست کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بھنڈر صاحب! پیسے کی طاقت آپ سے زیادہ کون سمجھتا ہوگا۔ میں نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے۔ یہاں آنے سے پہلے اس خدشے کا مذاک کر کے آیا ہوں۔ اول تو اغوا کنندگان کے لواحقین پر پیس کے سامنے ہی نہیں آئیں گے اگر آئے بھی تو ہمارے دوست بن کر آئیں گے دشمن بن کر نہیں۔ بھنڈر صاحب! ہم آپ جیسے بڑے جاگیردار نہیں ہیں۔ آپ کی طرح ہم مویشیوں کی اعلیٰ نسل تو نہیں رکھتے لیکن ہمارے پاس ہوشیار و رکروں کی ایک فوج ضرور موجود ہے اور وہی ہماری سیاسی طاقت ہے..... یوں بھی ہارس اینڈ کیٹل شو میں انعام حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آدی سیاسی میدان میں بھی اول آئے۔“

ملک کی آخری بات پر وہاں موجود اس کی ”خاص لابی“ نے زوردار تہقیر لگایا تھا۔

بھنڈر کے سامنے زمین نہیں پھٹتی تھی کہ وہ اس میں سما جاتا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ اور جا رہا تھا۔

جہاندیدہ وزیر اعلیٰ نے معاملات بگڑنے سے پہلے حالات کو سنبھالنے کے لئے آگے بڑھ کر بھنڈر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میننگ ختم کرنے کا اعلان کرتے ہوئے سب کو کھانے کی میز پر آنے کی دعوت دی۔ کسی بد مزگی سے بچنے کے لئے وزیر اعلیٰ نے ایم پی اے بھنڈر کا ہاتھ ابھی تک تھاما ہوا تھا اور اسے اپنے ساتھ کھانے کی میز تک لائے تھے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے اپنے حصے کی بوٹیاں پلیٹ میں ڈالیں اور آہستہ آہستہ باقی لوگوں میں گھلتے ملتے ملک صاحب کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔

ملک صاحب جیسے شاطر کو ہاتھ سے کھونا اپنی سیاسی قبر اپنے ہاتھوں کھودنے کے مترادف تھا۔ بھنڈر جیسے دس گدھے انہیں مل سکتے تھے لیکن ملک جیسا چالاک بھیڑ یا مشکل ہی سے ہاتھ آتا ہے۔

وزیر اعلیٰ جانتے تھے کہ اپنی پارٹی میں موجود ایک مضبوط مخالف گروپ کی موجودگی میں ملک صاحب جیسے لوگوں کو ہاتھ میں رکھنا ان کے لئے ناگزیر ہے۔



”کیا بات ہے حضور! کوئی پریشانی آن پڑی ہے کیا؟ ہمیں حکم دے کر دیکھیں۔“ اس نے نازنین کو جھٹکے سے اپنے اوپر گراتے ہوئے کہا۔

”نہیں! بس.....!“ وہ جھپکنے کی اداکاری کر رہی تھی۔

”نازنین! کھل کر بات کرو۔ آخر مسئلہ کیا ہے؟“

”دراصل تم تو جانتے ہی ہو آج کل بازار کے حالات کیسے ہیں۔ آئے روز پولیس والے تنگ کرتے ہیں۔ جاوید ملک صاحب کے ذریعے ذرا ان لوگوں کو سیدھا رکھتا تھا۔ ہم غلط لوگ نہیں ہیں ارسلان باؤ.....!“ اس کا لہجہ بدلنے لگا تھا۔

”قسمت نے اس بازار میں پہنچا دیا ہے۔ ہم کوئی پیشہ ور لوگ نہیں خاندانی لوگ ہیں۔ تم جانتے ہو اس کوٹھے پر کوئی ادب آش آدمی قدم نہیں دھر سکتا۔ پولیس کا اس طرف آنا ٹھیک نہیں..... سنا ہے نیا ڈی ایس پی آیا ہے۔ کچھ زیادہ ہی ”تھہ جھٹ“ لگتا ہے۔ کل بی بی نے اپنے میراثی کو تھانے ”سلام“ کرنے بھیجا تھا لیکن اس نے بی بی کا بھیجا نہ رانہ قبول کرنے کے بجائے الٹا میراثی کو بے عزت کر کے نکال دیا..... صبح انپکٹر آیا تھا بی بی کے پاس۔ اللہ بھلا کرے بے چارے کا ہمارا بہت خیال رکھتا ہے۔ اس نے بی بی سے کہا تھا کہ آئندہ براہ راست کچھ بھیجنے کی جرأت نہ کرنا۔ آدمی بڑا ہوشیار ہے۔ تمام کوٹھوں والے کونسلر کے ذریعے ہی اس سے ”صاحب سلامت“ رکھتے ہیں۔“ اس نے رک کر گہرا سانس لیا۔

”تم بھی کونسلر کے ذریعے.....!“ ارسلان نے کچھ کہنا چاہا۔

”یہی تو مصیبت ہے.....! نازنین اس کی بات کاٹ کر بولی.....“ تم نہیں جانتے بی بی مرجائے گی لیکن اس کونسلر کے منہ نہیں لگے گی۔ وہ حرامی یہی تو چاہتا ہے کہ ہم اس کی چوٹ پر پہنچ کر سجدہ ریز ہوں ہاں..... انپکٹر کہہ رہا تھا کہ اگر ملک صاحب ڈی ایس پی کو کہہ دیں کہ کسی کی ہمت نہیں کہ مختاراں بائی کے کوٹھے کی طرف آنکھ بھر کے بھی دیکھ سکے لیکن ملک صاحب کو براہ راست کچھ کہنے کی ہمت ہم غریبوں میں تو نہیں ہے۔“

اس نے پریشان ہونے کی اداکاری کی۔

”بس اتنی سی بات ہے..... ارے تم فکر ہی نہ کرو۔ میری جان! میں تمہیں خود ملک صاحب کے پاس لے جاؤں گا اور اس ڈی ایس پی کو وہیں بلا کر تمہارے سامنے کرواؤں گا.....“

پھر تو بات ہوئی ناں.....!“ اس نے نازنین پر نیدے کتوں کی طرح جھپٹتے ہوئے کہا۔

”تم کتنے عظیم ہو ارسلان باؤ.....!“ نازنین اس پر مٹی جا رہی تھی۔ اس نے اپنی ”خاندانی شرم و حیا“ کو مکمل ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے چند منٹ میں ہی ارسلان کو عیش و نشاط کی ان وادیوں میں پہنچا دیا کہ اس کا رواں رواں سرشار ہو کر مستی سے ناچنے لگا۔

یہ معرکہ سر کرنے کے بعد اس نے خود کو سنبھالا اور مسکراتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

”میں کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔“

”یہ لو..... کسی کو بھیج کر منگوا لو۔“

ارسلان نے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اس کو تمنا دیا۔ اس کو اپنا وجود ہوا میں اڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ صوفے پر ٹیک لگائے وہ آنکھیں بند کئے مدہوشی کے سے عالم میں بیٹھا تھا جب نازنین کی ماں مختاراں بائی اندر داخل ہوئی۔

اس نے کمرے میں قدم رکھنے سے پہلے ہی ارسلان کی بلائیں لینا شروع کر دی تھیں۔ ایک ایک فقرے سے ہزار ہزار مطلب ادا کرتی وہ باؤ ارسلان پر مٹی جا رہی تھی اور اس کے اتنے دن نہ آنے پر زبردست شاکھی تھی۔

”بی بی! تم بے فکر ہو جانا۔ ملک صاحب اپنے بندے ہیں۔ کوئی کام ہو تو بلا جھجک بتانا..... بی بی اگر تمہارا کام نہ کروا سکے تو یہ شہر چھوڑ جائیں گے۔“ اس نے شراب کا گلاس ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا۔

بی بی نے اس کے لئے خاص طور سے پیگ تیار کیا تھا۔ دونوں نے اگلے روز ہی ملاقات کا وقت طے کر لیا۔ ارسلان نے کہا تھا کہ وہ انہیں فون کر کے بتا دے گا۔

میراثی کھانے کا خوان اٹھائے کمرے میں آ رہا تھا۔ اس کے تعاقب میں آ رہی تھی نازنین.....!

اپنے ناز و ادا کی بجلیاں گراتی..... شراب اور شراب کے نشے نے ارسلان کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔

بی بی اٹھ کر چلی گئی۔ میراثی اپنا انعام لے کر رخصت ہو گیا۔ دونوں نے کھانا کھایا اور

اپنے کمرے میں آرام کرنے چلے گئے۔ صبح تک نازنین نے اس کے ساتھ ایسے ایسے داؤ بیچ کھیلے کہ اب اس کے لئے نازنین کے کسی حکم کی سرتابی کی مجال ہی نہیں تھی۔

○

تیسرے دن شام کو وہ نازنین اور مختاراں بی بی کو ملک صاحب کے حضور ”سلام کروانے“ لے جا رہا تھا۔ یہ لوگ ملک صاحب کے لئے اجنبی نہیں تھے لیکن آج تک براہ راست ملک صاحب کے سامنے آنے کی جرأت انہوں نے نہیں کی تھی حالانکہ ”برے بھلے وقت“ میں ملک صاحب کے حکم پر مختاراں بائی ہی ان کے لئے مال سپلائی کیا کرتی تھی۔

مختاراں بائی پر ارسلان کا پہلا حملہ ہی بڑا زوردار تھا۔

جاوید نے شاید اس خوف سے دونوں پارٹیوں کو آپس میں نہیں ملایا تھا کہ کہیں درمیان سے اس کا پتہ ہی نہ نکٹ جائے اور یہ لوگ اسے مکھن سے بال کی طرح نکال کر الگ رکھ دیں۔ لیکن.....!

ارسلان کو کوئی ایسا خوف یا فکر دامن گیر نہیں تھا۔

وہ جب چاہتا بازی کو الٹ سکتا تھا..... اسے جو زور کی سیاست کی خاصی سمجھ آنے لگی تھی۔

”کیا حال ہے مختاراں بائی! ارسلان تمہاری بڑی سفارش کرتا ہے۔ کیا جادو کر دیا ہے لڑکے پر؟“ ملک صاحب نے انہیں اپنے خاص ڈرائنگ روم میں طلب کیا تھا اور یہاں وہ ایک مکمل بدلا ہوا انسان تھا.....!

مختاراں بائی اور اس کی بیٹی نازنین نے ملک صاحب کو اتنا جھک کر اور مغلیہ انداز سے فرشی سلام کیا تھا کہ ارسلان کو خود پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

دونوں ماں بیٹی نے اپنے جسمانی خطوط کی نمائش میں ایک دوسری کو مات دینے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی۔

”ارے ادھر آؤ شہزادی تم کہاں جا رہی ہو؟“ ملک صاحب نے لپچائی ہوئی نظروں سے نازنین کے جسمانی خطوط کو گھور اور اپنے نزدیک بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”شکریہ جناب! ہم اس قابل کہاں ہیں؟“ نازنین جو کچھ ارسلان کے سامنے کیا کرتی

تھی وہی تاریخ اب ملک صاحب کے سامنے دہرائی جا رہی تھی۔

”بھئی ہم تمہیں بتائیں گے اس قابل۔“

ملک صاحب اپنی جگہ سے جھومتے ہوئے اٹھے اور نازنین کا بازو پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھالیا۔

”ارسلان..... تم جاؤ بیٹا۔ شام کو چھوڑ آنا ان لوگوں کو.....!“

ملک صاحب نے اچانک ہی ارسلان کی موجودگی کو کباب میں ہڈی جان کر اسے کہا تھا۔

ارسلان کو آج زندگی میں پہلی مرتبہ بڑی شدت کے ساتھ اپنی بے عزتی کا احساس ہوا۔ اسے نازنین پر بہت غصہ آ رہا تھا جو ملک کے پہلو میں یوں چٹ کر بیٹھی تھی جیسے ارسلان کے پہلو میں بیٹھی ہو۔

○

بڑے جبر سے اس نے اپنے چہرے کے تاثرات چھپائے اور بے شرمی سے دانت نکالتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

یہ ملک صاحب کی رہائش گاہ تھی جہاں بہت خاص قسم کے لوگوں کو ہی قدم رکھنے کی اجازت ملا کرتی تھی۔ یہاں ان کی نو بیاہت بیوی رہتی تھی۔ یہ ملک صاحب کی ”آن دی ریکارڈ“ تیسری شادی تھی جو انہوں نے اپنی بیٹی کی عمر جتنی ایک استانی سے رچائی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ ملک صاحب کی موجودہ بیوی کسی سفارش کے لئے ملک صاحب کے کسی گرگے کے ذریعے ان سے ٹکرائی اور ملک صاحب نے حسب عادت اسے ”معمول کا شکار“ سمجھ کر ”کھلیا“ تھا لیکن یہ کھیل اسے بڑا مہنگا پڑا۔ استانی نے دھمکی دی کہ اگر انہوں نے اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول نہیں کیا تو وہ انہیں بچکا کر دے گی۔

”ملک صاحب! میں تو مٹ ہی چکی ہوں لیکن آپ کی داشتہ بن کر زندہ رہنے کی بجائے میں مرجانا پسند کروں گی..... اور ہاں اگر آپ اس چکر میں ہیں کہ مجھے غائب کروادیں تو بھول جائیں..... اگر مجھے کچھ ہو گیا تو آپ کے اور میرے ناجائز تعلقات کی کہانی ملک کے سارے اخبارات میں چھپ جائے گی۔ میں نے اس کا بندوبست کر لیا ہے۔“

اس نے ایک روز ملک صاحب کی خواب گاہ میں لیٹے ہوئے انہیں دھمکی دی تھی۔

ملک صاحب نے دنیا دیکھی تھی.....!

وہ بات کرنے والے کا وزن کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بھونکنے اور کاٹنے والے کتوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ وہ تو خود ایک ایسی ہی ”سیکرٹری نمایاں“ چاہتے تھے جس کے ساتھ سوشل تقاریب میں شرکت کر سکیں۔

آئے روز انہیں غیر ملکی سفارت خانوں میں مختلف تقاریب میں شرکت کرنا ہوتی تھی اور جس سوسائٹی سے وہ اپنا تعلق جوڑ چکے تھے وہاں بوڑھے سیاستدانوں کی نوجوان بیویاں ان کے لئے ترقی کے ایسے زینے بن جایا کرتی تھیں جن کے ذریعے وہ سالوں کا سفر دنوں میں طے کر لیا کرتے تھے۔

ملک صاحب سیاست کے ہر میدان میں اپنے پاس مضبوط گھوڑے رکھتے تھے لیکن ”سوشل لائف“ کے لئے کسی جاندار گھوڑی کی کمی وہ شدت سے محسوس کرتے تھے۔

ایسی دلیر اور بے باک عورت ان کے بہت سے کام آسان کر سکتی تھی۔ جس جرات سے اس نے ملک صاحب کو چیلنج کیا تھا اس ”ادا“ نے ملک صاحب کو اپنا گرویدہ بنا دیا.....! انہوں نے بڑی خاموشی سے ایک سادہ سی تقریب میں نکاح پڑھوایا۔

اس شادی کا انکشاف ایک اخبار کے رنگین صفحات پر اچانک ہی ملک صاحب اور ان کی نو بیاہتا بیوی کے مشترکہ انٹرویو سے ہوا جس میں مسز ملک نے کہا تھا کہ ملک صاحب کی سیاسی خدمات کی وجہ سے ان پر لٹو ہو گئی تھی اور اس نے ملک صاحب کے ”عظیم مشن“ میں ہاتھ بٹانے کے لئے ان کے ساتھ شادی کی ہے۔ ملک صاحب نے کہا تھا کہ انہیں مسز ملک کے جذبہ خدمت نے بہت متاثر کیا اور انہیں زندگی میں بہترین سماجی اور سیاسی رفاقت میسر آئی ہے۔ دونوں میاں بیوی پہلے سے بڑھ کر قوم کی خدمت کریں گے۔

مسز ملک غریب گھر کی پڑھی لکھی اور ہوشیار لڑکی تھی۔ اس نے غربت کے ماحول میں جنم لے کر زندگی کو اپنی دہلیز پر سجدہ ریز کرنے کے خواب دیکھے تھے۔ وہ بھی کسی ایسے ہی ”پائیدان“ کے چکر میں تھی جس پر پاؤں رکھ کر وہ کامرانیوں کی سپر ایکسپریس میں سوار ہو سکے۔

دونوں اپنی اپنی جگہ داؤد کھیل کر ایک دوسرے کو بیوقوف اور خود کو عقل مند سمجھ رہے

تھے۔

دونوں..... ہی اپنی دانست میں ایک دوسرے کو ”شکار“ کر چکے تھے۔

مسز ملک کی نظریں ملک صاحب کی شہرت سے زیادہ ان کی دولت پر تھیں۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے نہ صرف یہ کوٹھی اپنے نام لکھوائی تھی بلکہ اپنا الگ اکاؤنٹ بھی کھول لیا تھا اور آج کل تو ایکشن نزدیک ہونے کی وجہ سے وہ صوبائی سیاسی لیگ کی خواتین برانچ میں بھی خاصی سرگرم تھیں۔

اپنے گھر میں کسی طوائف کی آمد کو مسز ملک نے نیک شگون نہیں جانا تھا۔ وہ ملک صاحب کی ہر حرکت سے باخبر رہنا چاہتی تھی۔ پردے کی اوٹ سے اس نے ارسلان کی بے بسی کا نظارہ کر لیا تھا اور اس کی جہاندیدہ نظروں نے ارسلان اور طوائف زادی کے ”تعلق“ کی سبب سے بھی محسوس کر لی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ اس کے بہتر مستقبل کا انحصار اس کی بہتر ”باخبری“ پر ہے۔

○

”ظہر و.....!“

ارسلان کو اچانک ہی پشت سے آنے والی نسوانی آواز نے چونکا دیا۔

”جی.....!“ اس نے گردن موڑی تو مسز ملک سامنے کھڑی تھی۔

”مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں.....!“ مسز ملک نے لگی لپٹی رکھے بغیر اس

کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

ارسلان کے اندر کا شیطان انگڑائی لے کر جاگ اٹھا۔

”وہ مارا!“ اس کا دل بلیوں اچھلا۔

”اچھا ملک صاحب تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟ تمہارے نزدیک کیا انسانوں کی قیمت کتنی

جتنی بھی نہیں۔ سالا! نازنین پر بھی قبضہ جمالیا..... جیسے میری اپنی کوئی زندگی ہی نہیں جیسے میں اس

کا زرخیز غلام ہوں..... میں دیکھوں گا ملک صاحب کہ تم میرا کیا بازو لو گے..... تمہیں اس گستاخی

کی قیمت بہر صورت ادا کرنی ہوگی.....!“ وہ خود کو سراٹا کبیر سمجھنے لگا۔

○

”فرمائیے.....!“ اس نے مزملک کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

اتنے نزدیک سے اس نے پہلی مرتبہ انہیں دیکھا تھا۔ اس کے حسن اور ذہانت کے چہرے کن کر ارسلان بھی یہی سوچا کرتا تھا کہ ملک صاحب نے ضرور اس کو بھی بلیک میلنگ سے قابو کر رکھا ہے..... ورنہ ایسی خوبصورت اور ذہین عورت کو اس بڑھے کھوسٹ کے کھونٹے سے بندھے رہنے کا شوق کیوں کر ہونے لگا۔

”تم ارسلان ہو؟“

اچھا میرا نام بھی جانتی ہے۔ عورت ہوشیار معلوم ہوتی ہے۔ اس نے سوچا۔

”جی!“

”مجھے جانتے ہو؟“ اس نے ایک خاص ادا سے ماتھے پر گری لٹوں کو ہٹایا۔

”جی! آپ مزملک ہیں۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“ اس نے ارسلان کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

وہ محرزہ معمول کی طرح اس کے پیچھے چلنے لگا۔ اپنی خواب گاہ کے دروازے پر رک کر

اس نے دروازہ کھولا۔

”ادھر آ جاؤ۔“

”جی.....!“ وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔

اچانک ہی ملک صاحب کی دہشت اس کے راستے کی دیوار بن گئی۔ اگر ملک صاحب

کو علم ہو گیا؟ اس نے سوچا اور لرز کر رہ گیا۔

”گھبراؤ نہیں۔ یہ میرا اور تمہارا معاملہ ہے۔ ملک درمیان میں نہیں آئے گا۔“ مزملک

نے اس کے دل کا چور پکڑ کر اسے تسلی دی۔

”میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔“ اس نے ارسلان کی مردانگی پر

چوٹ لگائی۔

”اچھا یہ بات ہے!“ اس نے دل ہی دل میں کہا اور اندر داخل ہو گیا۔

”وہ رات سے پہلے کمرے سے باہر نہیں نکلے گا اور رات کو بھی صرف اس طوائف کی

ماں باہر آئے گی تاکہ تم اسے واپس اس بازار میں چھوڑ آؤ جہاں سے لے کر آئے تھے۔“

مزملک ماہر نفسیات کی طرح اس کی مردانگی پر مسلسل ضربیں لگا کر اس کے لاشعور میں
ترہتی انتقام کی آگ کو بھڑکا رہی تھی۔

”میں اتنا بزدل بھی نہیں بنتا آپ نے سمجھ لیا.....!“ اس نے حوصلہ دکھایا۔

”اس گھر میں صرف ایک نوکرانی کام کرتی ہے یا پھر ایک باڈی گارڈ۔ دونوں میرے

بندے ہیں..... بے فکر رہنا۔ اپنے ذہن کو سکون دے لو..... میں تم سے جو بات کروں گی مکمل

راز داری اور ضمانت کے ساتھ کروں گی..... گھبرانا نہیں..... ممکن ہے تمہارے نزدیک ملک کسی

وحشی درندے کا نام ہو لیکن تم نے سرکس میں اس شیر کو دیکھا ہو گا جس کے منہ میں بکری کی گردن

دے دی جاتی ہے اور وہ کچھ نہیں کر پاتا۔“

ایک لمحے کے لئے رک کر مزملک نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”سگریٹ پیتے ہو.....؟“ اس نے سگریٹ کی ڈبیا سے ایک سگریٹ نکال کر اس کی

طرف بڑھایا۔

”جی نہیں۔“

”گدھے ہو تم..... شراب پی لیتے ہو سگریٹ نہیں پیتے۔“ مزملک نے لائٹ سے اپنا

سگریٹ سلگا کر ڈبیا میز پر پھینک دی۔

ارسلان مسمریزم زدہ معمول کی طرح اس کا مطیع ہو رہا تھا۔

”یہ سارا کامال ٹریڈ کا ہوتا ہے..... بے فکر رہو میں نے اپنے معاملات کی حد تک اس

شیر کے دانت نکال دیے ہیں۔ وہ میرے سامنے صرف سرکس کا شیر ہے..... اور بس!“

مزملک نے چند منٹ میں اس کے لاشعور سے ملک صاحب کا خوف اکھاڑ کر باہر

پھینک دیا تھا۔

”دیکھو ارسلان! میرا اور تمہارا ایک رشتہ ہے بہت مضبوط رشتہ۔“ اس نے سگریٹ کے

دھوئیں سے مرغولے بناتے ہوئے کہا۔

ارسلان نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مظلومیت کا رشتہ..... میں اور تم دونوں بہت مظلوم اور خرم خوردہ ہیں۔ مجھے تمہارے

ماضی کا پورا علم ہے۔ شراب کے نشے میں ملک نے تمہارے متعلق سب کچھ مجھے بتا دیا تھا۔ وہ خود

ہی بولنے لگا تھا۔ میں نے نہیں پوچھا۔ میں تو تمہیں تب تک جانتی بھی نہیں تھی..... پھر میں جان گئی کہ تمہیں جکڑے رکھنے کے لئے اس نے کون کون سا حربہ استعمال کیا لیکن یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں تھی۔ اس دنیا میں ہر بڑی پھٹی چھوٹی کھلی کھلا جاتی ہے۔ شاید کمزوروں کے لئے یہ دنیا ہی نہیں..... بہر حال ہم چاہیں تو ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں کیونکہ ہم دونوں کا مسئلہ قریباً ایک جیسا ہے..... زندگی کی دوڑ میں تم بھی آگے بڑھنا چاہتے ہو اور میں بھی لیکن ہم الگ الگ ستوں میں بھاگ رہے ہیں.....!!

ارسلان بہوت اس کی باتیں سن رہا تھا۔

یہ عورت اس کے لئے مکمل ناقابل سمجھ تھی۔

اس نے ارسلان کو موقع ہی نہیں دیا تھا کہ وہ اس کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکتا۔ یہ گداز جسم والی سانولے رنگ کی عورت جس کی آنکھوں میں اسے اپنا آپ ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا بڑے اطمینان سے سگریٹ سلگا کر اس سے باتیں کر رہی تھی۔

اپنی خواب گاہ میں تمام خدشات اور خوف سے بے نیاز اس عورت میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اسے دوسروں سے الگ اور ممتاز کر رہی تھی۔ ارسلان نے ملک صاحب کا دامن تھامنے کے بعد اب تک عورت کا گوکہ ایک ہی روپ دیکھا تھا اس روپ کی بے شمار عورتوں سے اس کا واسطہ پڑا تھا۔

لیکن.....!

ایسا کچھ تھا جو ارسلان کو اس کی عزت کرنے پر مجبور کرتا تھا۔

”یہ جو طوائف ملک صاحب کو ملنے آئی ہے اس کا نام کیا ہے؟“

اب وہ مطلب کی بات پر آ گئی۔

”نازنین..... یہ مشہور طوائف مختاراں بائی کی بیٹی ہے۔“ ارسلان نے بغیر کسی ہچکچاہٹ سے کہہ دیا۔

”ایک بیوی ہونے کے ناطے آپ کو اپنے شوہر کی پرائیویٹ لائف میں جھانکنے کا حق تو حاصل ہے۔ میں اس حق کو چیلنج نہیں کرتا لیکن معاف کیجئے ایسا پہلی مرتبہ تو نہیں ہوا۔ یہ تو آپ بھی جانتی ہیں کہ ملک صاحب عورتوں سے کچھ زیادہ ہی شغف رکھتے ہیں۔“ اس نے بھی اب کھلا شروع کر دیا تھا۔

”اچھا سوال کیا ہے تم نے..... لیکن اس سے پہلے ملک صاحب کا ”ضرورت مند خواتین“ سے ہی واسطہ رہا ہے..... جیسے میں..... کسی پیشہ ور طوائف نے آج تک اس گھر کی دہلیز پر قدم نہیں رکھا اور یہ لوگ ”ضرورت مند“ بھی دکھائی نہیں دیتے۔ اس لئے میرا چونکنا فطری بات ہے۔ مجھے علم ہے تمہیں اس طوائف سے محبت ہے یا پھر اس نے تمہارے ساتھ محبت کا ڈھونگ رچایا ہے۔ میں جانتی ہوں جب نوجوان عورت اور مرد ایک دوسرے کے جسمانی تقاضے سمجھ لگیں تو اس منافق معاشرے میں اس رشتے کو بھی وہ ”محبت“ کا نام دے لیتے ہیں۔ ”اپنی ہاؤ“ میں تمہیں الزام نہیں دے رہی ہوں نہ ہی مجھے کسی بحث میں پڑنے کی ضرورت ہے۔ ہر آدمی کو اپنے نظریات کے ساتھ جینے کا حق ہے لیکن تم ایک مشرقی مرد ہو۔ اس سے پہلے تم نے ایک ”اچھی عورت“ ہما اکبر شیروانی کو ملک صاحب کے ساتھ اپنے تعلقات کی بھینٹ چڑھایا اور اب پھر ملک تمہارے منہ سے نوالہ چھین رہا ہے..... تم آخر کب تک اس بوڑھے سیاستدان کی لالچی بنے رہو گے؟“

اس نے اب دوسرا سگریٹ سلگا لیا تھا۔ اس کی بات کے آخری فقرے سے ارسلان کے ذہن کے سارے تار جھنجھٹا اٹھے تھے۔

”کیا مطلب ہے آپ کا.....؟ معاف کیجئے مجھے آپ کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ آپ ایک شادی شدہ خاتون ہو کر.....“

”یہ ایک سیاسی شادی ہے۔“ اس نے ارسلان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”میری کہانی تم سے مختلف نہیں لیکن فرق اتنا ہے کہ میں نے عورت ہو کر بھی اپنے لئے کی قیمت وصول کر لی اور تم مرد ہو کر بھی.....“ اس نے بات نا مکمل چھوڑ دی تھی۔

”ظہر میں تمہارے لئے کچھ پیسے کو منگواؤں۔ اتنا کہہ کر وہ ارسلان کو چھوڑ کر باہر نکل گئی۔

شاید اس تنہائی میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے ارسلان کی مردانگی پر آخری اور جان توڑ حملہ کیا تھا۔

واقعی وہ اس حملے سے نہ سنبھل سکا۔

اس نے سوچا۔ مسز ملک نے کتنی صحیح بات کہہ دی۔ ملک کا ”بھٹہ ٹوکا“ بن کر اس نے زندگی میں کیا کچھ نہیں کھو دیا تھا۔ اپنا گھریاں ماں باپ، بہن بھائی، ہما اکبر شیروانی اپنا کیریئر حتیٰ کہ

اُتار آپ بھی..... وہ اب ایک عام شہری نہیں تھا، قانون کا باغی، قانون کو مطلوب.....!

کب تک اس کے جرائم پر پردہ بڑا رہے گا۔

کب تک وہ اپنی آنکھوں سے اپنے لئے کا تماشا دیکھے گا۔

”ٹھیک ہے.....!“ اس نے سوچا..... ”ملک صاحب نہیں تو مسز ملک ہی سہی۔ یہاں

کم از کم برابری کی بنیاد پر تو معاملہ چلے گا۔ وہاں تو وہ اپنی مرضی سے کچھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور

سب سے بڑھ کر تو یہ بات تھی کہ وہ یہاں ”مجبور محض“ نہیں تھا۔“

○

مسز ملک کی واپسی چائے کی ٹرائی کے ساتھ ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر اسے پیش کی تھی۔

”مجھے امید ہے کہ تمہارا فیصلہ وہی ہوگا جو ایک عقل مند انسان کا ہونا چاہئے۔ تم میرے

لئے کام کرو۔ میری اپنی سیاسی پارٹی ہے اس کے لئے کام کرو۔ تمہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں

ہونی چاہئے کہ میرا اور ملک کا رشتہ کیا ہے۔ تم یہی سمجھو کہ اب تمہارا اور میرا تعلق کیا ہے.....؟ اس

تعلق کو ہم دونوں اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر مضبوط کرتے رہیں گے۔ ہاں میں تمہیں یہ ضرور یقین

دلاتی ہوں کہ کامیابیوں میں تمہارا اور میرا حصہ فغنی فغنی ہوگا..... میں اس کا گھپلا نہیں کروں گی۔

غنیمت کی تقسیم ایمان داری سے ہوگی.....!“ اس نے چائے کا گھونٹ حلق میں اٹھایا۔

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ ارسلان نے پوچھا۔

”شاباش! فی الحال تم دو محاذوں پر کام شروع کرو گے۔ تین روز بعد بھارتی سفارت

خانے کی ایک تقریب میں ملک شامل ہوگا۔ اس مرتبہ تم بھی وہاں جاؤ گے۔ اپنی آنکھیں اور کان

کھلے رکھنا، زبان بند۔ تمہیں بہت کچھ دیکھنے سننے کو ملے گا۔“

”اور دوسرا کام.....؟“

”نازنین کو تیار کرو۔ ملک اس کی بونیاں ابھی کچھ روز مسلسل نوچے گا۔ اس دوران اگر

وہ ہماری مدد کرے اور شراب کے نشے میں دھت ملک صاحب کے ساتھ تصاویر بنانے میں مدد

کرے تو اسے منہ مانگی قیمت مل جائے گی.....!“

ٹھہرو..... ابھی کچھ نہ کہنا۔ یہ پروفیشنل لوگ ہیں۔ دولت کے لئے سب کچھ کر گزرنے

پر تیار..... اسے اتنی بڑی آفر دینا کہ اس کے پاس ”ناں“ کی گنجائش ہی نہ رہ جائے۔“

”مثلاً..... کتنے تک.....!“ ارسلان نے بڑے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

”ایک لاکھ دو لاکھ!“

”میں جانتا ہوں اتنی رقم کے لئے وہ ملک صاحب کو زبردستی پر راضی ہو جائے گی لیکن

اتنی رقم کیا اسے.....“

”کون بیوقوف اتنی رقم اسے دے گا اتنے معمولی کام کے لئے..... اسے تو وہی ملے گا

جو ایڈوانس دے دو گے۔ اس کے بعد جب اس کی تصاویر ملک کے ساتھ بن جائیں گی تو اس کی

جرات نہیں کہ باقی رقم طلب کر سکے اور سب سے بڑی بات کہ پھر وہ کبھی تمہارے چنگل سے بھی

نہیں نکل سکتی کیونکہ وہ پھر اس کھیل کی فریق بن چکی ہوگی۔“

ارسلان کا سر چکر اکر رہ گیا.....!

اتنی ہوشیار عورت تھی یہ..... اور کتنی لاپرواہی سے بات کر رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا

تھا مسز ملک کے ساتھ مل کر کام کرنے کا..... اپنی محرومیوں کا بدلہ لینے کا۔ مکر و فریب اور ریاکاری

کے جس طلسم ہوشربا میں وہ داخل ہو چکا تھا اس کے تمام اصول اور ضابطے ارسلان پر بھی اسی طرح

نافذ العمل تھے جیسے اس دنیا کے دیگر مکینوں پر.....!

اس دنیا کا اپنا ”کوڈ آف کنڈکٹ“ تھا.....!

اس ”کوڈ آف کنڈکٹ“ کی پاسداری اس پر لازم تھی۔



قربانی کے بکرے

چوہدری غلام رسول اس وقت کوکوس رہا تھا جب اس کا دماغ خراب ہوا اور اس نے ڈی ایس پی کی حیثیت سے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اپنے علاقے کے ایک ہیروئن فروش کو گرفتار کر کے اس کے قبضے سے اچھی خاصی ہیروئن کی مقدار بھی برآمد کر لی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ یہ شخص ”اوپر تک“ جاسکتا ہے۔

پہلی سفارش ہی مقامی ایم این اے کی آئی لیکن چوہدری غلام رسول کوئی ایسا گرا پڑا پولیس افسر نہیں تھا کہ وہ ایم این اے سے دب جاتا۔ یہاں تو دویروں کی فوج موجود تھی جن کو کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ پرانا پولیس افسر ہونے کے باوجود وہ اندازہ نہ لگا سکا کہ یہ ایم این اے ذرا ”دکھری ٹائپ“ کا تھا جس نے راتوں رات چوہدری صاحب کو تارے دکھا دیئے۔

اگلے روز جب ایس ایس پی کے ہاں پیشی ہوئی تو چوہدری صاحب نے اپنی دانست میں بڑا مضبوط کیس تیار کر رکھا تھا لیکن وہ حیران رہ گیا جب یہاں متعلقہ مسئلہ پر اس سے کچھ پوچھا ہی نہیں گیا۔

”تمہاری خدمات انٹیلی جنس بیورو کو سونپی جا رہی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم جیسے لائق اور ایماندار افسر وہاں بھی اپنے محکمے کی عزت پر آج بھی نہیں آنے دیں گے۔“ اس سے پہلے کہ

چوہدری غلام رسول کچھ کہتا، ایس ایس پی نے فون پر ایک نمبر گھانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی تھنٹی بجا کر اپنے گارڈ کو اندر بلا لیا۔

”میاں صاحب کو بھیج دو۔“ انہوں نے گارڈ کو حکم دیا۔

چوہدری صاحب نے ان میاں صاحب کو آج دوسری مرتبہ دیکھا تھا۔ پہلی مرتبہ وہ ایم این اے صاحب کا حکم لے کر آئے تھے اور آج دوسری مرتبہ اس وقت نظر آئے جب چوہدری کا ”بتادلہ“ ہو چکا تھا۔

میاں صاحب نے ایس ایس پی صاحب کو تو صرف سلام کیا تھا مگر چوہدری غلام رسول سے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کر کے اس کی خیریت بھی دریافت کر لی تھی۔

چوہدری کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس مخفی سی عفریت کا ٹینٹا دبا دے۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے میاں صاحب کو گھورا اور سیلوٹ مار کر باہر نکل گیا۔

اسے چارج سنبھالے آج تین مہینے ہونے کو آئے تھے لیکن اس دوران سوائے چھ ”فورٹ ٹائپ“ (پندرہ روزہ خفیہ رپورٹ) لکھنے کے اس نے اور کچھ نہیں کیا تھا۔ ”سٹوڈنٹس ونگ“ اسے سونپا گیا تھا۔ ایک انسپکٹر اور تین چار ماتحتوں کے ساتھ اسے حکم دیا گیا تھا کہ طلباء سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔

چوہدری غلام رسول نے پولیس میں حکومت کرنے کے ڈھنگ سیکھے تھے۔ وہاں دن میں جانے کتنے مرتبہ رعب جھاڑنے اور اپنی انا کو تسکین دینے کے مواقعے میسر آتے تھے۔ چوہدری صاحب کو شاید ہی اپنی پولیس سروس کے درمیان سبزی گوشت اور فروٹ خریدنے کی نوبت آئی ہوگی۔

مگر یہاں گنگا الٹی بہہ رہی تھی۔

جب سے چوہدری صاحب آئی بی میں آئے تھے، گھر کی رونقیں ہی اجڑ کر رہ گئی تھیں۔ کوئی سابقہ ماتحت اچانک سامنے آ جاتا تو سلام دعا ہو جاتی ورنہ تو کوئی انہیں ملنے بھی نہیں آتا تھا۔ ایک وہ دور تھا جب یہ لوگ قطار باندھ کر ان کے گھر سے باہر دست بستہ کھڑے ہوتے تھے۔ اب تو سبزی گوشت کے لئے بھی مسز چوہدری کو نوکر بھیجنا پڑتا تھا۔ پھر حالت یہ ہو گئی کہ نوکر کی ہیرا پھیری سے تنگ آ کر وہ خود بازار جانے لگیں۔

اس روز چوہدری غلام رسول سرکاری عہدہ کو دل ہی دل میں کوستے ہوئے انسپکٹر کی رپورٹ پر دستخط کر رہا تھا جب اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ فون کو گالی دے کر انہوں نے بڑی بے دلی سے ہیلو کہا۔

پھر.....!

ان کے ماتحت حیران رہ گئے جب چوہدری صاحب اچانک ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ان لوگوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا تھا۔

فون پر کوئی ”اہم مرکزی شخصیت“ اس سے مخاطب تھی۔ اس شخصیت نے چوہدری غلام رسول کو سرکٹ ہاؤس میں ملاقات کے لئے طلب کیا تھا۔ چوہدری صاحب نے دل ہی دل میں نجانے کتنی مرتبہ شکر گزارا کہ کسی اہم شخصیت کو ان کا خیال تو آیا۔

○

سرکٹ ہاؤس میں چوہدری صاحب کا استقبال مرکزی وزیر کے سیکرٹری نے کیا۔ اس نے چوہدری صاحب کو پہلے ہی باور کروادیا تھا کہ یہ ملاقات بالکل ”آف دی ریکارڈ“ ہے اور اس ضمن میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہئے۔

مرکزی وزیر نے چوہدری صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور انہیں اعتماد میں لیتے ہوئے کہا کہ مرکزی حکومت کی ”گڈ بکس“ میں ان کا نام موجود ہے۔ اگر وہ اس مہم میں سرخرو ہو گئے تو نہ صرف پولیس سروس میں واپس چلے جائیں گے بلکہ ان کو خصوصی ترقی بھی ملے گی۔

مرکزی وزیر نے انہیں انتظامی تنظیم کے دونوں جوانوں جاوید اور اختر کے کوائف مہیا کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان دونوں کے متعلق فوری رپورٹ چاہئے کہ ان کے ساتھ کیا گزری؟

”آپ کو سرکاری طور پر آج ہی اس کیس پر کام کرنے کے احکامات مل رہے ہیں۔ زحمت صرف اس لئے دی ہے کہ آپ اپنے آدی ہیں ضروری نہیں کہ ہر اہم اطلاع فائل پر چڑھا دی جائے۔ فائلوں کا پیٹ بھی ضرور بھریئے لیکن ہمارے مشورے کے بعد..... آپ جو نتائج اخذ کریں جو بھی اہم اطلاع ملے برائے مہربانی پہلے وہ میرے ساتھ ڈسکس کر لیجئے۔ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ ”آن دی ریکارڈ“ کیا آنا چاہئے اور ”آف دی ریکارڈ“ کیا رہنا چاہئے۔

”آپ کے حکم کی پابندی ہو گی سر!“ ڈی ایس پی چوہدری غلام رسول نے آداب

گزارتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ تعاون کی صورت میں آپ مرکزی حکومت کی طرف سے کسی کمی کے شاک نہیں رہیں گے.....!“ وزیر صاحب نے فرمایا۔

”کیوں نہیں جناب! ویسے بھی میرا یہ فرض ہے کہ آپ کے ہر کم کی تعمیل کروں۔“

چوہدری صاحب سرکاری موٹر سائیکل پر جس طرح چپ چاپ آئے تھے اسی طرح چپ چاپ لوٹ گئے۔ دفتر پہنچتے ہی انہوں نے اپنے واحد انسپکٹر اکرم کو طلب کر لیا۔

”انتظامی طلباء فیڈریشن کے جتنے بھی ”سورس“ ہیں ان کی فائل لے آؤ۔“ انہوں نے حکم دیا۔

اکرم کی طرف سے مطلوبہ فائل آنے سے پہلے ان کے پاس ”تازہ احکامات“ پہنچ چکے تھے۔ ایک سرسری نظر اے ڈی صاحب کے احکامات پر ڈال کر اس نے حکم موصول کرنے کے دستخط کر دیئے۔

”اکرم صاحب.....!“ انہوں نے اپنے انسپکٹر کو مخاطب کیا جو ابھی ابھی فائل لے کر آیا تھا۔

”جی سر!“

”یہ لیٹر پڑھ لیجئے۔“ انہوں نے اے ڈی صاحب کے احکامات اسے پڑھنے کے لئے دے دیئے۔

”ٹھیک ہے جناب۔ سمجھ گیا میں!“ انسپکٹر اکرم نے مؤدب لہجے میں کہا۔

”اکرم صاحب! یہ ہمارے لئے چیلنج کیس ہے۔ سارے ملک کی نظریں اس پر لگی ہیں اور وقت بھی بہت کم ہے۔“ ڈی ایس پی چوہدری نے اسے معاملے کی سنگینی کا احساس دلایا۔

”میں آج ہی کام شروع کرتا ہوں جناب.....“

”مجھے فوری طور پر ملک صاحب کے نزدیکی لڑکوں کی فہرست چاہئے جیسے بھی ممکن ہو ان میں سے کسی کو توڑ لو۔“ آؤٹ آف دی دے“ بھی جانا پڑے تو پروا نہ کرنا۔ فنڈ کی بھی کوئی فکر نہ کرنا۔ مجھے کل صبح تک ملک صاحب کے لڑکوں کی فہرست چاہئے۔ پھر ہم کسی ایک کو منتخب کر کے کام کریں گے اور ہاں اپنے سب انسپکٹر کو انوشادہ لڑکوں کے لواحقین کی نگرانی پر مامور کر دو۔

لواحقین کے ملاقاتیوں پر کڑی نظر رکھو۔ خاص طور سے اس بات کا خیال رکھنا کہ کون کون سی شخصیات ان سے ملتی ہیں..... مجھے اس کیس کی پہلی فائل بھی لا دو۔ پہلے کس نے کام کیا تھا اس فائل پر؟“

”سر انسپکٹر شفیع نے۔“

”کہاں ہے وہ آج کل؟“

”امبروڈ (غیر ملک میں) سر! جانے کیا کارنامہ انجام دے دیا تھا اس نے۔ اس کیس کے فوراً ہی بعد اس کو سعودہ بھیج دیا گیا.....!“ انسپکٹر اکرم نے جلتے جلتے لہجے میں کہا۔
چوہدری صاحب کو اب کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی.....!
”ٹھیک ہے مجھے فائل لا دو اور تم لوگ اپنا آپریشن شروع کر دو۔“

○

انسپکٹر اکرم کو آج پھر کچھ کر دکھانے کا موقع ملا تھا۔ اس نے سوچا، نیا افسر ہے اور پولیس سے آیا ہے۔ ممکن ہے اس کی محنت کا احساس کر کے اس کے متعلق کوئی اچھی رپورٹ اور بھیج دے اور اسے بھی باہر نکلے گا چانس مل جائے۔ اس نے انسپکٹر شفیع والی فائل کا ایک ایک لفظ حفظ کر لیا تھا۔ اسے اندازہ ہو چلا تھا کہ انقلابی طلباء کا ”گاڈ فادر“ کون ہے۔

اس نے اگلے ہی روز یونیورسٹی کا چکر لگایا اور دوسرے دن چوہدری غلام رسول کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کر دی۔

”اچھا تو یہ“ ملک صاحب“ ہیں..... ٹھیک ہے تم اغوا ہونے والے لڑکوں کے لواحقین کو ٹٹولو۔ ملک کو میں خود دیکھوں گا.....!“ چوہدری غلام رسول نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس نے سانپ کے بل میں سر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انسپکٹر کی اتنی ہمت نہیں کہ اس کے نزدیک ہی پھٹک جائے۔ اسے خود میدان میں اترنا ہوگا۔ تب ہی وہ ”سرکار دربار“ میں سرخرو ہوگا۔

کچھ سوچتے ہوئے اس نے ”انڈین ڈیک“ والے اے ڈی سے رابطہ قائم کیا اور تھوڑی دیر بعد وہ اس کے دفتر میں موجود تھا۔

”کیسے چوہدری صاحب کیسے بھول پڑے ادھر.....!“ اے ڈی نے بیٹھتے ہوئے اس

کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ان کے کمرے میں نصب ٹی وی پر ”دن ڈے کرکٹ میچ“ چل رہا تھا اور ”اے ڈی“ ادھر منہ کئے ہمہ تن گوش تھے۔

”جناب والا! اگر بھارتی سفارت خانے میں تقریب میں شرکت کرنے والے مہمانوں کی فہرست مل جاتی تو میں بہت شکرگزار ہوں گا۔“ چوہدری غلام رسول نے کہا۔
”ارے چوہدری صاحب! یہ بھی کوئی بات ہے۔“

اے ڈی صاحب نے انٹرکام پر اپنے متعلقہ انسپکٹر کو چوہدری صاحب سے مکمل تعاون کا حکم دے کر اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ کرکٹ میچ ایسے سنسنی خیز مرحلے میں داخل ہو چکا تھا کہ وہ اب پلک جھپکنے کا خطرہ بھی مول لینے کو تیار نہ تھے۔ چوہدری صاحب کی روانگی کے فوراً بعد ہی انہوں نے چڑا سی کو ہدایت کر دی کہ اگلے حکم تک کسی کو کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔

ڈی ایس پی چوہدری غلام رسول کی باچھیں کھل گئیں جب اس نے بھارتی سفارت خانے کے ممکنہ مہمانوں کی فہرست میں ملک صاحب کا نام دیکھا۔ متعلقہ عملے سے چائے پی کر ان کا شکریہ ادا کر کے وہ باہر آ گیا۔

اپنی میز پر پہنچنے تک اس نے پچھلے تمام ”راہٹے“ بھول کر ”نیا جہان“ آباد کرنے کی ٹھان لی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کھیل میں انجینی کے اور لوگوں کو بھی کودنے کا موقع دے۔ اگلے روز وہ انسپکٹر اکرم سمیت سفارت خانے کے دروازے پر موجود تھا۔ انہوں نے ملک کو ایک نوجوان کی معیت میں سفارت خانے میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔

”اسے پہچانتے ہو؟“

انہوں نے انسپکٹر اکرم سے ملک کے ساتھی کے متعلق دریافت کیا۔

”یہ ارسلان ہے جناب! عہدے کے لحاظ سے تو انقلابی طلباء کا جنرل سیکرٹری لیکن ایک نمبر کا غنڈہ۔ مار دھاڑ کرنے والوں کے گینگ کا سردار یہی تو ہے..... ملک کا بہت چیتا ہے آج کل..... اس سے پہلے غائب ہونے والا لڑکا اختر ملک کا خاص آدمی تھا۔ آج کل یہ ہے۔ اپنی بیوی سے زیادہ ملک اس پر اعتبار کرتا ہے۔“

”گڈ! چوہدری غلام رسول نے اکرم کی اطلاعات پر اسے داد دینے کے انداز میں کہا۔

”آؤ واپس چلیں ہمارا آج کا کام ختم۔ تم کل تک اغوا ہونے والوں کے لواحقین کی رپورٹ تیار کر لو۔“

چوہدری نے واپس مڑتے ہوئے اسے کہا۔

دونوں الگ الگ سمتوں میں اپنے اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

○

آدھی رات کو وہ ڈرائنگ روم میں ادھڑا ہوا تھا جب مختاراں نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔

”بیٹا مجھے ذرا چھوڑ آؤ۔ بچی کو ملک صاحب صبح خود پہنچا دیں گے۔“

مختاراں نے شراب کے نشے میں ڈگمگاتے ہوئے ارسلان سے کہا۔

”اس کا تو یہی چاہتا تھا کہ اس حرافہ کا منہ نوج لے لیکن حالات نے اسے منافقت

ورمصالحت کے ایسے ہتھیاروں سے لیس کر دیا تھا کہ اب اس کے اپنے جذبات کی کوئی حیثیت رہی نہیں گئی تھی۔

”بی بی خوش تو ہونا؟“ اس نے بے شرمی کی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تو نے تو ہم غریبوں کی قسمت کا بند دروازہ

کھول دیا۔“

مختاراں بائی کے انگ انگ سے خوشی کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ اس نے براہ

است ملک کو قابو کر لیا تھا اور وہ جانتی تھی اب اس شہر میں کسی کی جرأت نہیں کہ اس کے سامنے سر

ٹھا کر چلے۔ ملک کے ذریعے وہ بازار میں اپنے حامدوں کا ناٹھہ بند کر سکتی تھی۔

گاڑی میں ارسلان اسے گھر تک چھوڑنے آیا تھا۔ سارے راستے اس نے اپنے

جذبات کو چھپائے رکھا تھا اور ہنس ہنس کر مختاراں سے باتیں کرتا آیا تھا۔ اس نے مختاراں کو اپنے

جذبات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

روانگی پر اس نے مختاراں کو خبردار کرتے ہوئے کہہ دیا تھا ”بی بی ایک بات کا خیال رکھنا

اس دروازے تک تمہیں میں نے پہنچایا ہے۔ اختر نے تمہیں ملک صاحب کی ہوا نہیں لگنے دی

ی۔ کہیں اپنے اس ”رابطے“ کو درمیان سے نہ نکال دیتا۔ جس پل سے تم گزر کر ملک صاحب

کے گھر تک پہنچی ہو اس پل کے بغیر دریا عبور نہیں کر سکوگی.....!“

○

یہاں سے وہ سیدھا ملک صاحب کے گھر ہی آیا تھا اور ڈرائنگ روم میں ہی سو گیا۔ صبح

وہ دیر گئے تک سوتا رہا۔ کسی نے اسے جگایا نہیں۔ جب وہ بیدار ہوا تو ڈرائنگ روم کے ریشمی

پردوں پر دھوپ چمک رہی تھی۔ رات کے سارے واقعات کی فلم ایکایک اس کے دماغ میں چلنے

لگی۔ اچانک ہی ڈرائنگ روم سے ملحقہ دروازہ کھلا اور ملک صاحب اندر چلے آئے۔ وہ کہیں

جانے کی تیاری میں تھے۔

”کیا حال ہے بیٹا.....؟“ انہوں نے ایسے دریافت کیا جیسے وہ معمول کے مطابق

بات کیا کرتے تھے جیسے رات اس گھر پر اتری ہی نہیں تھی..... ”بھئی تم تو بڑے کام کے آدمی ہو۔“

ملک صاحب نے اپنی بائیں آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ ”وہ اختر تو سالا جھک ہی مارتا رہا۔ شاباش

بیٹا! دل خوش کر دیا تم نے۔ واقعی تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ تم تو جانتے ہو آج کل میں کتنی

زیادہ ٹینشن کا شکار ہوں۔ الیکشن سر پر ہے اور ہر روز دو تین میٹنگوں میں آنا جانا، بھئی! میں تو بچی

بات ہے اس سیاست سے تنگ آ گیا ہوں۔ یہ تو تم نوجوانوں کی خدمت کا جذبہ ہے جس نے ابھی

تک مجھے قائم رکھا ہے..... ہاں! اسے تھوڑی دیر بعد گھر پہنچا آنا اور کل شام تم میرے ساتھ بھارتی

سفارت خانے کی دعوت پر جا رہے ہو۔“ انہوں نے ارسلان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارسلان میاں! تم انقلابی فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری ہو اور اب تمہارا تعارف بین الاقوامی

حلقوں میں بھی ہونا چاہئے۔ میں تمہیں سیاست میں اپنا جانشین بنانا چاہتا ہوں۔“ بڑی رازداری

کے لہجے میں انہوں نے ارسلان کے نزدیک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”شکریہ ملک صاحب! آپ نے مجھے کسی قابل جانا۔“ ارسلان نے انتہائی منافقت کا

مظاہرہ کیا۔

”ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔ تم یہ رکھ لو۔ میں نے ”ان لوگوں“ کو ”قارغ“ کر دیا

”ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔ تم یہ رکھ لو۔ میں نے ”ان لوگوں“ کو ”قارغ“ کر دیا

”ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔ تم یہ رکھ لو۔ میں نے ”ان لوگوں“ کو ”قارغ“ کر دیا

سکتے ہو۔“ وہ سگریٹ کا کش لگاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔
 ”شکریہ!“ بے اختیار ارسلان کے منہ سے نکلا۔

○

جب وہ نازنین والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو نازنین آرام دہ بستر سے ٹپک لگائے ٹی وی پر فلم دیکھ رہی تھی۔ ارسلان کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے ریوٹ سے ٹی وی آف کیا اور ایسی بے قراری سے اٹھ کر اس سے لپٹی کہ ارسلان بھونچکا رہ گیا۔
 اس سے لپٹی دو تین منٹ تک ٹسوے بھاتی اور اپنی قسمت کو کوستی رہی۔ اس نے ارسلان سے کہا کہ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ملک صاحب اس قماش کے آدمی ہیں ورنہ وہ کبھی اپنی ماں کے ساتھ یہاں نہ آتی۔
 ”ارسلان باؤ! اگر میں ذرا سی بھی مزاحمت کرتی تو یہ شخص ہمیں تباہ کر کے رکھ دیتا۔ تم تو جانتے ہی ہو اس کے کتنے لمبے ہاتھ ہیں۔“

”نازنین! بیوقوف نہ بنو۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے کبھی بیوفائی نہیں کرو گی۔ تم بھی میری طرح مجبور ہو۔ میں تو تمہیں یہ بتانے والا تھا کہ یہ ہمارے لئے بہت اچھا ہوا..... تمہارے ہاتھ سونے کی چڑیا لگ گئی ہے۔ اگر ہم دونوں مل کر چلیں تو کروڑوں کی آسامی ہمارے ہاتھ آ جائے گی۔ بس ذرا ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ تم نے دیکھ لیا ملک صاحب میری ہر بات مانتے ہیں۔“

اس کا جواب نازنین کے لئے بالکل خلاف توقع تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ ٹھٹھک کر ہی رہ گئی۔ شاید وہ فیصلہ کر رہی تھی کہ جو کچھ اس کے کانوں نے سنا ہے اس پر یقین کرے یا نہ کرے؟ پھر اس نے سوچا کہ ملک صاحب لاکھ ہوشیار چالاک اور بارسوخ سخی ارسلان بھی کچھ کم نہیں اور یقین ممکن ہے کہ وہ اس کی مدد سے ملک پر ہاتھ صاف کرنے کا پروگرام بنا رہا ہو۔ گویا اب وہ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت بھی بن گئے تھے۔ ارسلان نے اس کی حریصانہ فطرت کو بڑے احسن طریقے سے ایکسپلائٹ کیا تھا۔

”ارسلان! تم میری توقع سے بڑھ کر عظیم نکلے ہو۔“ اس نے ارسلان کے ساتھ ہی

پلنگ پڑھیر ہوتے ہوئے کہا۔

ہے۔ پھر بھی اپنے ہاتھ سے کچھ بخشش دے دینا۔ اس طرح یہ لوگ دب کر رہتے ہیں۔“

ملک نے آنکھ دباتے ہوئے نوٹوں کا ایک بٹل ارسلان کو تھما دیا۔
 ”کل ادھر گھر پر ہی آ جانا۔ یہیں سے شام کو اکٹھے نکل چلیں گے.....!“ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے ارسلان سے کہا۔

”شکریہ ملک صاحب۔ بہت شکریہ۔“ اس نے نوٹوں کا بٹل اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

اس گھر کی کوئی چیز اس کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی غسل خانے کا رخ کر رہا تھا۔ جب وہ نہادھو کر باہر نکلا تو ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر مسز ملک اس کی منتظر تھی۔
 بے ساختہ اس کا ہاتھ ماتھے تک اٹھ گیا۔

”شاباش! تم میں ایک اچھا سیاستدان بننے کی اہلیت موجود ہے۔ کم از کم تم ایک کامیاب انسان ضرور بن سکتے ہو۔ ارسلان! جس شخص کو اپنے دلی جذبات چھپانے اور منافقت سے بات کرنے کا ڈھنگ آ جائے کامیابی اور کامرانی کے دروازے ایک ایک کر کے اس پر کھلتے چلے جاتے ہیں۔ شاباش! اس طرح گلہ کو بیوقوف بناتے رہو۔ ایک دن ایسا آ جائے گا جب یہ تمہارے لئے وہ کچھ کرے گا جو کچھ اب تم اس کے لئے کر رہے ہو..... ہاں ناشتہ میرے ساتھ کرنا۔ ذرا اس کتیا کی خیر لے آؤ.....!“

مسز ملک کی مسکراہٹ بہت گہری اور جان لیوا ہو رہی تھی۔

سردیوں کی اس روشن صبح کی ساری تازگی اس کے بدن کی سنو لائٹ میں سمٹ آئی تھی۔ اس کا سانولا چہرہ نکھر کر گہرے سرخ رنگ کے دیسی گلاب کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ مسکرانے سے اس کی آنکھیں سارے چہرے پر پھیل جاتی تھیں۔ ان آنکھوں میں اسرار کی تھیں اتنی گہری تھیں کہ ارسلان کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔

”شکریہ مسز ملک!“ اس نے نازنین والے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”ایک منٹ ٹھہرو۔“ مسز ملک نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

”میری نصیحت یاد رکھنا۔ اپنے دلی جذبات کا اظہار کبھی نہ کرنا۔ اس عورت کو یہ احساس نہ ہونے دینا کہ تمہیں اس کے رویے سے تکلیف پہنچی ہے۔ کبھی نہیں..... اور ہاں تم مجھے نجمہ کہہ

”ابھی نہیں۔ اس کام کے لئے ساری زندگی پڑی ہے ہمیں ہر قدم احتیاط سے اٹھانا ہے۔ تم فلم دیکھو میں اندر دوسری فلم دیکھ کر ابھی آیا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو نیل بجا کر بیرے سے طلب کر لیتا۔“ اس نے آہستگی سے خود کو نازنین سے الگ کرتے ہوئے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

”او کے!“ نازنین نے بے ہودہ سی حرکت کرتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دے دی اور ایک مرتبہ پھر اس نے دی سی آراورٹی وی کے سوچ آن کر لئے تھے۔

○

تھوڑی دیر بعد وہ مسز نجمہ کے ساتھ ناشتے کی میز پر موجود تھا۔ مسز ملک نے اسے اپنے ہاتھوں سے ٹوسٹ پر کھن لگا کر دیا تھا۔

”کل تم ملک کے ساتھ بھارتی سفارت خانے میں جاؤ گے۔ اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھنا لیکن زبان بند۔ یاد رکھنا اس تقریب کے پاکستانی مہمانوں میں انٹیلی جنس کے لوگ بھی شامل ہوں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ ابتدا ہی میں اس حوالے سے تمہاری کوئی فائل کھل جائے۔“ مسز ملک نے واقعی اسے بہت قیمتی نصیحت کی تھی.....!

”نازنین کو چھوڑ آؤ لیکن آج ہی اس سے برنس کی بات نہ کر لینا۔ ابھی کچھ دن گزرنے دو۔ پھل کچا بھی اتنا ہی نقصان دہ ہے جتنا زیادہ پکا ہوا۔ اگر تم اعتدال کے ساتھ چلتے رہے تو اپنا مقصد پا لو گے.....!“ وہ ارسلان کو بچوں کی طرح زندگی کے انراور رموز سے آگاہ کر رہی تھی۔

”مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جب بھی تمہیں پیسوں کی ضرورت ہو بلا تکلف میرے پاس چلے آنا۔“ اس نے دم رخصت ارسلان سے کہا تھا۔

نازنین کو ارسلان خود چھوڑنے آیا اور گاڑی میں سارے راستے اسے یہی باور کرواتا رہا تھا کہ دونوں اگر چاہیں تو مل کر بہت مال کما سکتے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے دوسرے کے ساتھ دھوکہ کر کے الوسیدھا کرنے کی کوشش کی تو دونوں مارے جائیں گے۔

نازنین واقعی خاندانی کتھری تھی۔ وہ اب ارسلان کا مطلب سمجھنے لگی تھی۔ یوں بھی وہ جانتی تھی کہ مضبوط ”چارے“ کے بغیر وہ شکار کیسے کھیلے گی؟

انٹیلی جنس

اسی روز شام کو دونوں سفارت خانے کی تقریب میں جا رہے تھے۔ مسز ملک نے ایک کلچرل سوسائٹی کے پروگرام میں شرکت کرنی تھی۔ اس نے پہلے ہی ملک صاحب کے سامنے اپنی مجبوری بیان کر دی تھی۔ یوں بھی اب اختر کا کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا اور ملک صاحب نے ارسلان کو ہی اپنی بیساکھیاں بنانا تھا۔

ملک صاحب کی گاڑی سفارت خانے کے لاؤنج میں پارک ہوئی تو ایک باوردی ملازم نے آگے بڑھ کر اس کا دروازہ کھولا اور ان کی رہنمائی اس ہال کمرے کی طرف کی جہاں استقبالی ترتیب دیا گیا تھا۔ ڈرائیور تو وہیں رک گیا، دونوں ہال کمرے کی طرف چل دیئے۔

ملک صاحب کی شکل پر نظر پڑتے ہی ایک خوبصورت لڑکی نے مسکراتے ہوئے ہال کا دروازہ کھول دیا۔ یہ لڑکیاں بھارت کے مخصوص لباسوں میں ملبوس مہمانوں کا استقبال کر رہی تھیں۔ ہال کمرے کا دروازہ کھلتے ہی خوشبو اور رنگ و نور کا ایک سیلاب اس کی آنکھوں نے امنڈتے ہوئے دیکھا۔ یہاں سینکڑوں مرد اور عورتیں جمع تھیں۔ ان میں ملکی وغیرہ ملکی دونوں قسم کے لوگ موجود تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے جہاں وہ آئے ہیں وہ کوئی اور ہی دنیا ہے۔ عورتیں اور مرد ایک دوسرے سے چپکے مختلف کونوں میں کرسیاں سنبھالے بیٹھے تھے۔ متعدد بیرے اپنے ہاتھوں میں

مشروبات کی طشتریاں تھامے بھاگے پھر رہے تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا شخص رہا ہو جس کے ہاتھ میں جام نہ ہو۔ خصوصاً ملکی مہمان مفت کی شراب پر یوں ٹوٹ کر گرتے تھے جیسے انہیں دوبارہ زندگی میں یہ کچھ دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوگا۔

ہال کے ایک کونے میں بنی سٹیج پر کچھ سازندے بھارتی گیتوں کی دھنیں بجا رہے تھے اور بھارتی سندریاں جوڑوں اور ہاتھوں میں گجرے سجائے آنے والوں کی آرتی اتار رہی تھیں۔ انہوں نے بہت سے مہمانوں کے ماتھے پر تلک بھی سجا دیے تھے۔ روپہلی ساڑیوں سے پھیلتے ان کے پچیلے جسموں سے اٹھنے والی خوشبو کی پلٹیں ہونٹوں اور آنکھوں میں چاچی مسکراہٹ نے مہمانوں کے ایمان ڈگمگا دیے تھے۔ ہر کوئی ایسی کسی بھی سندری کی چند منٹ کی ”کمپنی“ کے لئے باؤلا ہوا جاتا تھا۔

سفارت خانے کا مردانہ عملہ ہر آنے والے مہمان کا ”سواگت“ جی جان سے کر رہا تھا۔ ملک کی نامور طاقتیں جب اب مغنیہ اور فلسفار کہلاتی تھیں یہاں بطور خاص مدعو کی گئی تھیں۔ چوٹی کے سرمایہ دار تاجر، سیاستدان، وکلاء اور ڈپلومیٹس اس مجلس میں موجود تھے۔ ملکی مہمانوں خصوصاً سفارت خانے کی خواتین کے گرد پیشگو کی طرح جھنجھٹا رہے تھے۔ ہر کسی کی خواہش تھی کہ وہ دوسرے سے بڑھ چڑھ کر غیر ملکیوں کی توجہ کا مرکز بنے۔

ملک صاحب اور ارسلان نے شراب کے بجائے سافٹ ڈرنکس لئے تھے۔ ملک کی یہ مجبوری تھی کہ وہ اس مجلس میں شراب کے بام کو چھو کر اخبار نویسوں کے لئے کوئی کہانی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ لیکن نزدیک آ رہے تھے اور اسے خود پر جبر کر کے مکمل منافقت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ بصورت دیگر ان حالات میں کوئی معمولی سی خبر بھی اس کا سارا سیاسی کیریئر تباہ کر سکتی تھی۔

بھارتی سفیر ملک کی شکل پر نظر پڑتے ہی بھاگتا ہوا اس طرف آیا تھا۔ ”ہیلو ملک صاحب کیسے ہیں آپ؟“ اس نے ملک سے بے تکلفی سے معاف کیا۔ دونوں ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف نظر آ رہے تھے۔

”ترپاشی صاحب یہ ہیں مسٹر ارسلان!“ ملک نے خیر خیریت سے منٹے کے بعد ارسلان کا اس سے تعارف کرایا۔ ”انقلابی طلباء فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری.....!“

”اوہو بھی واہ! حرا آگیا۔ واہ ملک صاحب کمال کے آدمی ہیں آپ۔ میری تو دلی

خواہش تھی کہ ہمارے نوجوانوں کا ایک دوسرے سے رابطہ ہو۔ یہ تو ہمارا سو بھاگیہ ہے جو ارسلان صاحب تشریف لائے۔ مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ارسلان صاحب۔ آپ ایسے لبرل اور روشن دماغ لوگ اس برصغیر کی واحد امید ہیں۔ میں نے آپ کی سرکار کو متعدد مرتبہ ”پروزل“ دی ہے کہ ہمارے نوجوانوں کے زیادہ سے زیادہ ”ڈپلی کیشن“ ایک دوسرے کے ملک کا دورہ کریں۔ اس طرح انہیں قریب آنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع تو ملے گا۔ کچھ عجب نہیں ملک صاحب کہ جو کام ہم لوگ نہیں کر سکتے وہ یہ نوجوان کر گزریں۔ نوجوان ہماری طرح تنگ نظر نہیں ہوتے ملک صاحب! یہ نفرت اور تعصب جو ہماری نسل نے انہیں ورثے میں دیا ہے اس کو دھکی آندھی کے سامنے ان کے عزائم ہی دیوار کھڑی کر کے ایک دوسرے کو قریب لاسکتے ہیں۔“ ترپاشی نے ایک ہی سانس میں نجائے کتنی باتیں کہہ دی تھیں۔

اسے ارسلان کی اچانک آمد سے بہت خوشی ہوئی تھی۔ بڑی بے تکلفی سے وہ ارسلان کا بازو پکڑ کر اسے ایک طرف لے گیا۔ اس اثنا میں ملک صاحب ایک غیر ملکی خاتون کا طواف کرنے لگے تھے۔

ترپاشی اسے لے کر ایک کونے میں موجود ایک بھارتی سندری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ”یہ میری بیٹی کانتا ہے اور کانتا بیٹی یہ ہیں انقلابی سٹوڈنٹس کے جنرل سیکرٹری مسٹر ارسلان!“ اس نے دونوں کا تعارف کروایا۔

”ہیلو.....!“ کہہ کر کانتا نے اپنے ماتھے پر آئے بال جھٹکے سے پیچھے کی طرف گراتے ہوئے ارسلان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اسے اپنے خون کی گردش بڑھتی محسوس ہونے لگی۔

”ہیلو.....!“ کہہ کر اس نے کانتا کا ہاتھ تھاما اور ایک برقی لہر اس کے سارے بدن میں سرایت کر گئی۔

”آپ لوگ باتیں کریں میں ذرا دوسرے مہمانوں کو دیکھوں۔ ایکس کیوز می مسٹر ارسلان۔“ ترپاشی نے ”شکار“ اپنی بیٹی کو سونپتے ہوئے اس کی اہمیت سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

”کیسے ہیں آپ؟ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ بھی میں تو بہت سوشل ہوں۔ یہاں ہر جگہ آتی جاتی ہوں۔ مجھے تو پاکستانی نوجوانوں سے مل کر بہت آندہ ہوتا ہے۔ اتنے ”براڈ مائنڈڈ“ ہیں کہ دل خوش ہو جاتا ہے۔ آپ تو خاصے مشہور آدمی ہیں۔ آیا کیجئے تاکہ کبھی ہمارے

ہاں۔ آپ سے باتیں کر کے بہت خوشی ہوگی۔“ کانٹا اردو ایسی شاندار بول رہی تھی کہ اس پر ”بھارتیہ ناری“ ہونے کا گمان ہی نہیں گزرتا تھا۔

○

ارسلان کو اپنے ساتھ لئے وہ ایک کونے میں صوفے پر بیٹھ گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ اس نے ارسلان سے باتوں باتوں میں ان کی تنظیم کے متعلق بہت سی ایسی باتوں کا پتہ بھی چلا لیا تھا جو کبھی ارسلان کے ذہن ہی میں نہیں رہی تھی۔ کانٹا اس طرح اس کے ساتھ چپک کر بیٹھی تھی کہ ارسلان کو خود ”راجہ اندر“ محسوس کرنے لگا تھا۔ اس طرح بڑے نامحسوس انداز میں ارسلان کی ایسی ایسی خوبیاں تلاش کی تھیں کہ اسے اپنی شخصیت دی آئی پی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ نہ رکنے والے ریکارڈ کی طرح کانٹا کے سامنے بجنے لگا تھا..... کانٹا کے اصرار پر اس نے کانٹا کے ساتھ ”سیئر“ شیرز کی تھی اور آئندہ بھی اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ کانٹا نے اسے بتایا تھا کہ اس نے مقامی لینگوئج انسٹیٹیوٹ میں فرنچ زبان میں داخلہ لے رکھا ہے جہاں وہ دونوں ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔ اس نے ارسلان کو کہا تھا کہ کبھی اسے بھارت کی سیر کرنے کی خواہش ہو تو بلا تکلف اسے بتائے بلکہ اس نے سردیوں کی چھٹیاں بھارت میں گزارنے کی اسے باقاعدہ دعوت دے ڈالی تھی۔

ڈنر کے آغاز تک وہ اس سے چپکی رہی۔ دونوں نے پاکستان اور بھارت کی سٹوڈنٹس پالیسیس پر جی بھر کے باتیں کی تھیں۔ اسی دوران کانٹا نے بہانے بہانے سے اسے اپنے جسم کے سارے اسرار و رموز سے آگاہ کر دیا تھا۔

ارسلان یہ بات نوٹ نہ کر سکا کہ سیاہ شیشوں کی عینک والے ایک درمیانی عمر کے پاکستانی نے اس پر مسلسل نظریں جم رکھی تھیں۔ جب وہ تپاٹھی سے باتیں کر رہا تھا تو یہ شخص ان کی طرف پیٹھ کئے بظاہر میوزک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ان کی باتیں سن رہا تھا اور کانٹا کے قرب نے اس پر ایسی مدھوش طاری کی تھی کہ وہ اس شخص کے بار بار اپنے نزدیک کسی بہانے ٹھہر کر باتیں سننے کی کوشش کو بالکل نظر انداز کر گیا۔

ملک صاحب اس دوران سپر طاقوتوں کے سفیروں اور ان کی بیگمات اور سیکرٹریوں سے مصافحہ اور گفتگو فرماتے رہے۔ ڈنر پر انہوں نے ارسلان سے چھٹے ہی دریافت کیا تھا:

”کیسا رہا پروگرام؟“

”سرجی! مزہ آ گیا۔ بڑے ایڈوانس لوگ ہیں۔“ ارسلان نے ندیدے بچوں کی طرح ہوسناک لہجے میں کہا۔

”بیٹا! ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے..... ان لوگوں سے دوستی بڑی فائدہ مند ہوتی ہے۔ کسی عزیز دوست کو ویزے کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور بندہ کبھی کبھی خود بھی موج میلہ کر لیتا ہے۔“ ملک نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بائیں آنکھ دبا لی۔ اس وقت وہ تیسرے درجے کا لفٹنگا دکھائی دے رہا تھا۔

ڈنر کے دوران بھی کانٹا اس کے گرد منڈلاتی رہی۔ اس نے کئی چیزیں اپنے ہاتھ سے ارسلان کی پلیٹ میں رکھی تھیں اور رخصت ہونے پر ایک مرتبہ پھر اس سے دوبارہ ملنے کا وعدہ بھی لیا تھا۔

ترپاٹھی انہیں رخصت کرنے کے لئے دروازے تک آیا تھا۔

○

چوہدری غلام رسول کو انسپکٹر اکرم نے بتا دیا تھا کہ لواحقین خوفزدہ ہیں۔ انہیں دھمکی تو کسی نے نہیں دی لیکن انہیں اس بات کا احساس ہے کہ اگر انہوں نے اپنی حدود سے تجاوز کیا تو نجانے ان پر کیا قیامت گزر جائے۔ دونوں گھرانوں کو ملک صاحب کی طرف سے کچھ مالی انداد کا وعدہ بھی کیا گیا تھا۔ ملک صاحب نے دونوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ ان کی اجازت کے بغیر نہ تو وہ کوئی بیان دیں گے نہ ہی کسی سے ملنے کی کوشش کریں گے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو ملک صاحب اس کیس سے الگ ہو جائیں گے پھر ساری زندگی ان کے بیٹے انہیں واپس نہیں مل سکیں گے۔

ارسلان اور اس کے گینگ کے دوسرے لوگوں سے متعلق بھی اس نے ساری رپورٹ ڈی ایس پی صاحب کے سامنے رکھ دی تھی۔

”ویل ڈن..... شاباش! اپنا کام جاری رکھو۔ میں تمہاری محنت ضائع نہیں جانے دوں گا۔“ چوہدری نے تحسین آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اب اسے عملی میدان میں خود اترنا تھا۔ اچانک ہی انٹر کام کی گھنٹی بجی۔ اسے انڈین ڈیسک والے بے ڈی نے اپنے کمرے میں چائے پینے کے لئے بلایا تھا۔ یہ معمول کی بات تھی

لیکن آج نجانے کیوں چوہدری صاحب کا ماتھا ٹھکا۔ وہ عموماً اپنے کام سے کام رکھتے تھے کیونکہ انجینی کے لوگوں سے بھی ان کے زیادہ روابط قائم نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے ذہنی طور پر خود کو ابھی تک پولیس ڈیپارٹمنٹ کا ہی آدمی سمجھا ہوا تھا۔

”آپ کا انسپکٹر انقلابی طلباء کے جنرل سیکرٹری ارسلان کو آج کل چپک کر رہے ہیں؟“ جی ڈی صاحب نے جلد ہی مطلب کی گفتگو پر آتے ہوئے کہا۔

”جناب! میں آج کل جو جوانوں کے اغوا والے کیس پر کام کر رہا ہوں اور یہ ہمارے بڑے کام کا لڑکا ہے.....!“ چوہدری نے چونکے بغیر کہا۔

”ہمارے بھی بہت کام کا لڑکا ہے۔ دونوں مل کر کام چلا لیتے ہیں کیونکہ آپ ہماری ٹیم میں ابھی ابھی شامل ہوئے ہیں اس لئے آپ کا احترام تو ہمارے لئے لازم ہے۔“

جے ڈی صاحب خاصے روشن دماغ تھے۔

”شکریہ جناب جیسے آپ کا حکم.....!“

”آپ میرے ”اے ڈی“ سے مل کر آپریشن ڈسکس کر لیں۔“

تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ آپس میں میٹنگ کر کے اگلا لمحہ عمل ترتیب دے رہے تھے۔ دونوں نے اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر ارسلان کو استعمال کیا تھا۔ چوہدری نے کسی کو ”اندر کے حالات“ کی بھٹک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ وہ اسے معمول کی کارروائی کے مطابق ذیل کر رہا تھا اور انجینی کے باقی لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ چوہدری غلام رسول کو چونکہ یہ پہلا اہم کیس تھا ہے اس لئے وہ کچھ کر دکھانا چاہتا ہے۔ چونکہ ”نواں پروہتا“ ہے جلد ہی اس کا سارا شوق اتر جائے گا۔ پھر وہ ان کی طرح خلیفہ بن کر آفس تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔

اگلے روز انہوں نے مل کر کارروائی کا آغاز کرنا تھا۔

○

ارسلان حسب معمول صبح دیر گئے سو کر اٹھا تھا۔ اس نے معمول کے مطابق ناشتہ کیا اور پھر ملک صاحب کی طرف جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔ ابھی اس نے کپڑے تبدیل ہی کئے تھے جب دروازے کی اطلاع گھنٹی بجی۔

”آگئے سالے صبح صبح۔ نجانے کمنٹوں کو رات کو نیند بھی آتی ہے یا نہیں۔“ اس کی

دانست میں یہ اس کے دوست تھے جو صبح ہی اسے لینے آ گئے تھے۔ بڑبڑاتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا اور دو انجینی چہروں پر نظر پڑتے ہی حیران رہ گیا۔

”کون ہو تم؟“ اس نے آنے والوں سے اپنے معمول کے لہجے میں دریافت کیا۔

”اگلی کوئی بات کہنے سے پہلے اس بات کا خیال رکھنا کہ ہمارے پندرہ ساتھیوں نے اس فلیٹ کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔“ نوواردوں میں سے ایک نے اسے انگلی کے اشارے سے فلیٹ کے سامنے والی گراؤنڈ کے کونے میں کھڑی جیپ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جیپ سے ایک شخص نے ہاتھ ہلا کر انہیں احساس دلایا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہیں۔

”لیکن آپ ہیں کون.....؟“ حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ارسلان نے اپنا لہجہ تبدیل کر لیا تھا۔

”ہمارا تعلق سیکورٹی سے ہے اور ہم تمہارے ساتھ دوستی کرنے آئے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ ایسی باتیں نہیں کی جاتیں۔ آؤ اندر بیٹھتے ہیں اطمینان سے بات کر لیں گے۔“

اس مرتبہ دوسرے نے جواب دیا اور دونوں اندر داخل ہو گئے۔

”کس انجینی سے تعلق ہے آپ کا؟“ ارسلان نے دریافت کیا۔

”آئی ایس آئی سے!“ انہوں نے اپنی تربیت کے مطابق جھوٹ بول کر غلط انجینی بتا دی۔

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم کسی اور جگہ بیٹھ کر بات کر لیں۔ یہاں آپ کے دوستوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جائے گا.....!“ نوواردوں میں سے ایک نے جو چوہدری غلام رسول تھا، بڑے مؤدب لہجے میں اسے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ ارسلان نے بے پروائی سے کندھے اچکاے۔

دونوں کی معیت میں وہ نزدیک ہی ایک چھوٹے سے ریسٹوران میں چلا گیا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ جیپ بھی ان کے ساتھ ہی ریگتی ہوئی ہوٹل کے سامنے سڑک کے کنارے آ کر ٹھہر گئی تھی۔

دونوں نے اس سے بھارتی سفارت خانے کی دعوت اور اختر اور جاوید کے قتل سے متعلق سوالات شروع کر دیئے تھے۔ ارسلان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس بات کا

”ارسلان صاحب! اس کی نوبت کبھی نہیں آئے گی۔ ہم دوستوں کے دوست ہیں۔“
 دونوں نے باری باری اس سے گرجوشی سے مصافحہ کیا۔
 ”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ ارسلان نے دریافت کیا۔
 ”کچھ نہیں۔ اپنے معمول کی زندگی گزاریں۔ کانٹا دیوی سے رابطہ رکھیں..... ملک صاحب سے تعلقات بنائے رکھیں۔ آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔“
 ”اور بس..... ہماری تمہاری دوستی کچی۔“ چوہدری نے جواب دیا۔
 ”آپ سے رابطہ کیسے ہوگا؟“ ارسلان نے کریدا۔
 ”اس کی تم فکر نہ کرو۔ جب ہم مناسب سمجھیں گے مل لیا کریں گے۔“ جواب ملا۔

O

چائے اور سنیکس ان لوگوں نے خود منگوائے تھے اور اس کا مل بھی اپنی جیب سے ادا کیا تھا۔ ارسلان نے پہلی ملاقات میں ان کے متعلق کوئی برائتاثر قائم نہیں کیا تھا۔
 ان میں سے ایک تو رخصت ہو گیا تھا جب کہ چوہدری اس کے پاس موجود رہا۔ اب وہ دونوں نزدیکی گراؤنڈ کی طرف جا رہے تھے۔ ایک کونے میں موجود بیچ پر وہ بیٹھ گئے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اچانک ہی چوہدری نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
 ”تمہیں اختر اور جاوید والے واقعے کا علم تو ہوگا ہی.....!“
 چوہدری نے تیر ہوا میں چلایا تھا لیکن لگا عین نشانے پر۔ ارسلان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا.....؟“ اس نے خود کو سنبھالا۔
 ”ارسلان صاحب ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ کیوں گھبرارہے ہیں؟ میرا مطلب تھا آخر آپ تنظیم کے جنرل سیکرٹری ہیں اور ملک کے خاص آدمی اس لئے ممکن ہے..... آپ کو اندر کی بات کا علم ہو..... ویسے تو ہم بھی بہت سی اندر کی باتیں جانتے ہیں لیکن وقت سے پہلے کچھ کہنا ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔“

”چوہدری نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے اپنی ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔
 ”اچھا ایک بات تو ضرور مانیں گے کہ دونوں کے اغوا کا مقدمہ جھوٹا درج کروایا گیا

احساس انہوں نے ارسلان کو دلا دیا تھا کہ ان کے معاملے میں ملک صاحب اس کے کام نہیں آ سکیں گے۔
 ”ہمارا کچھ آن دی ریکارڈ تو ہوتا نہیں نہ ہی ہم پولیس والے ہیں۔ تمہیں اس طرح غائب کیا جائے گا کہ خود تمہارے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوگا کہ تم کہاں ہو۔ تم جانتے ہو بھارتی سفارت کاروں سے تعلقات قائم کرنے عام سولیلین کے لئے کتنا بڑا جرم ہے.....!“ انسپکٹر خورشید نے اس کے پاؤں اکھاڑے۔
 ”لیکن میں نے کس سے تعلقات قائم کئے ہیں؟“ ارسلان گھبرا گیا۔
 ”اچھا جی! ارسلان صاحب وہ کانٹا دیوی کیا آپ کی.....“ فقرہ ادھورا چھوڑ کر وہ مسکرایا۔

ارسلان نے بھی زبردستی مسکرا کر خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کی تھی۔
 ”دیکھو برادر عزیز! ہم تمہارے بھائی ہیں اور تم بھی ہماری طرح پاکستانی مسلمان ہو۔ اگر ہماری تھوڑی سی مدد کرو گے تو ہم بھی بہت کام آنے والے بندے ہیں..... ملک صاحب سے زیادہ تمہارے کام آ سکتے ہیں۔“ چوہدری غلام رسول نے اسے بلا خردوسی کی پیشکش کر دی۔
 ”وہ مارا.....!“ ارسلان نے دل ہی دل میں سوچا..... ”یہ سیکورٹی والے اگر ان کے دوست بن جائیں تو بہت سے معاملات میں وہ ملک کا محتاج نہیں رہے گا۔ وہ جانتا تھا کہ انٹیلی جنس والے اپنے مخبروں کی بڑی موج کرواتے ہیں اور پولیس تو ان کی طرف دیکھتے ہوئے گھبراتی ہے۔ پھر وہ ان لوگوں کے ذریعے اختر اور جاوید کے معاملے میں ”ڈس انفارمیشن“ کو غلط رخ پر ڈال دے..... لیکن غلط کیوں؟ وہ کیوں نہ ملک صاحب کی طرف ہی توپوں کا رخ پھیر دے۔ اس طرح نجمہ ملک پر بھی ہاتھ صاف کر سکے گا اور..... اور..... بہت کچھ..... ہاں! ظاہر ہے یہ لوگ اسے بھارت سفارت خانے میں جانے سے تو نہیں روکیں گے کیونکہ اس کے جانے سے ہی ان کا کام چلے گا۔ اس طرح کانٹا بھی.....“ وہ دل ہی دل میں مسکراتا رہا۔

”ٹھیک ہے مجھے منظور ہے لیکن ایک بات کا خیال رہے کہ اگر آپ نے کبھی بلیک میل کرنا شروع کر دیا تو میں بہت کچھ کر گزروں گا.....!“ اس نے ڈرتے ڈرتے انہیں دھمکی دے دی۔

ہے.....! "چوہدری اس کے چہرے سے ایک لمحے کے لئے بھی نظریں الگ کرنے کو تیار نہیں تھا۔
 "ہاں آپ کا اندازہ صحیح ہے۔" اس نے مردہ سی آواز میں کہا۔
 "شاباش! یہ ہوئی ناں بات۔ اس کا مطلب ہے ہم مستقبل میں اچھے دوست بن سکتے ہیں۔"

چوہدری بڑا گھاگ شکاری تھا۔

"ضرور ضرور۔" ارسلان کے اعصاب بھی ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔

"تمہارے خیال سے اس سارے کھیل کے پیچھے کس کا ذہن کارفرما ہے؟"

"ملک صاحب کا..... جناب والا! وہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ

سکتا.....!" ارسلان نے جھٹ سے کہہ دیا۔

"کہاں چھپا رکھا ہے اس نے دونوں کو.....؟" چوہدری نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"بہذا اس کا مجھے علم نہیں نہ ہی مجھے یہ پتہ ہے کہ ان کے ساتھ کیا گزری۔" ارسلان نے کچھ ایسے معصومانہ لہجے میں کہا کہ چوہدری بھی دھوکا کھا گیا۔

"تم کسی طرح یہ پتہ لگا دو کہ ملک نے لڑکوں کو کہاں چھپا رکھا ہے۔ پھر دیکھ لینا کہ ہم تمہارے ملک کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں یا نہیں۔"

"جی میں کوشش کروں گا.....!" ارسلان چاہتا تھا اب یہ مصیبت اٹھ کر چلی ہی جائے۔

"ہمارے لائق کوئی کام ہو تو ضرور یاد کرنا.....!" چوہدری نے کہا۔

حالانکہ وہ بھی جانتا تھا کہ ارسلان اگر انہیں یاد بھی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ پہلی ملاقات میں انہوں نے اسے کوئی رابطہ نمبر ہی نہیں دیا تھا۔

○

ان لوگوں سے رخصت ہو کر وہ سیدھا اپنے فلیٹ پر آیا اور بستر پر گر کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس ملاقات کا ذکر ملک سے کرے یا نہ کرے۔ اگر یہ لوگ اختر اور جاوید کے کیس پر کام کر رہے تھے تو ان کی تفتیش کو غلط راستے پر ڈالنے کے لئے ارسلان کا ان

کے ساتھ رہنا ضروری تھا۔

لیکن..... کہیں اس کے اپنے گلے میں تو پھندا نہیں لگایا جا رہا؟

مشکل تو یہ تھی کہ وہ کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بہت سوچ سوچ کر بالا خر اس نے نجمہ بیگم سے مشاورت کا فیصلہ کر لیا۔ وہی ایک ایسی ہستی تھی جس سے کچھ راہنمائی مل سکتی تھی۔ یہ سوچ کر وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔

ابھی وہ اٹھ کر کھڑا ہی ہوا تھا جب اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف مسز ملک اس سے مخاطب تھیں۔

اس کا جی چاہا کہ فوراً مسز ملک کو تازہ حادثے کی خبر دے لیکن اچانک ہی اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔

"اگر ان لوگوں کا تعلق انٹیلی جنس سے ہے تو عین ممکن ہے وہ اس کا فون بھی بگ کر رہے ہوں اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اس نے فون پر معمول کے مطابق مسز ملک کی خیریت دریافت کی جس نے ایک ضروری کام سے اسے گھر پہنچنے کو کہا تھا۔

فون بند کر کے وہ ملک دولا کی طرف روانہ ہو گیا جہاں مسز ملک اس کی منتظر تھی۔

"کہو کل کی تقریب کیسی رہی؟" اس نے چھٹے ہی دریافت کیا۔

جواب میں ارسلان نے بلا کم و کاست اسے ساری کہانی سنادی۔ کانتا سے ملاقات کا ذکر اس نے سرسری انداز سے کیا تھا۔

"ہوں.....!" مسز ملک نے اس کی کہانی کے خاتمے پر لمبی سانس لی۔

"گویا کھیل شروع ہو چکا ہے..... خیر تم فکر نہ کرو۔ بس ذرا ہوشیاری سے حالات کو سنبھالنا..... ملک بچ کر نہیں جاسکتا۔" ارسلان نے بے چینی سے کہا۔

"مجھے کیا کرنا ہوگا.....؟" ارسلان نے بے چینی سے کہا۔

"تم بالکل نہ گھبرانا۔ یہ وفاقی انٹیلی جنس کے لوگ ہیں اور ملک کے خلاف مواد اکٹھا کر

کے اپنے آقاؤں تک پہنچائیں گے تاکہ جب مذاکرات کی میز پر بیٹھیں تو ملک پر ان کی گرفت مضبوط ہو۔ ایکشن نزدیک آرہے ہیں اور اس صوبے سے زیادہ مضبوط اپوزیشن حکومت کو ملے گی۔

ان کی کوشش ہوگی کہ کسی بھی طرح ملک صاحب اور اس کی قماش کے دو تین لوگوں کو صوبائی لیگ

سے توڑ کر اپنے ساتھ ملا لیں تاکہ حالات کا پانسہ ان کے حق میں پلٹ جائے۔ تم انہیں بڑے حساب کتاب سے اس بات کے دو تین شواہد فراہم کر دو کہ دونوں نوجوانوں کے غائب ہونے میں ملک کا ہاتھ نظر آئے تو وہ تمہاری جان چھوڑ دیں گے..... جہاں تک بھارتی سفارت خانے والی بات ہے، ابھی ایک آدھ ملاقات ان کے کہنے پر کانتا سے کر لو۔ اس کے بعد انہیں کہہ دینا کہ کانتا نے تمہیں لفٹ کروانے سے انکار کر دیا ہے..... اللہ اللہ خیر صلا۔“

ارسلان دل ہی دل میں اس کی ذہانت پر عرش عرش کر اٹھا۔ جس مسئلے نے اسے اتنا پریشان کر رکھا تھا اس کا سارا بوجھ مسز ملک نے چند منٹ میں اتار دیا تھا۔

”شکریہ مسز ملک! آپ میری توقعات سے بڑھ کر ذہین اور عظیم ہیں۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”ارے نہیں۔ جب ہم دونوں بزنس پارٹنر ہیں تو پھر ایک دوسرے کے کام تو آنا ہی پڑے گا۔ کبھی تم میری پریشانی دور کر دو گے اور کبھی میں تمہاری پریشانی دور کروں گی..... ہاں ان لوگوں کو ہاتھ میں رکھنا۔ اگر ان کے ساتھ ڈھنگ سے دوستی کی جائے تو بہت فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ بہت سی ”ڈس انفارمیشن“ ان کے ذریعے پاس ہو سکتی ہے۔ میری بات سمجھ گئے ناں۔“ مسز ملک کے ہونٹوں پر اور آنکھوں میں مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

اس نے ارسلان کو بطور خاص اپنے فون پر اہم گفتگو کرنے سے منع کر دیا تھا..... ”بالکل ہی بند نہ کر دینا۔ ان لوگوں کو خواہ مخواہ شک پڑ جائے گا.....!“ اس نے نصیحت کے انداز میں کہا۔ دونوں کھانے کی میز پر اکٹھے ہی بیٹھے تھے۔ اس دوران وہ ارسلان سے کرید کرید کر یہی دریافت کرتی رہی کہ ترپاشی اور ملک صاحب کے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں۔

”نازنین والا کام بھی الیکشن سے پہلے ہی ہو جائے تو ہمارے دارے نیارے ہو جائیں گے۔ ایک طرف ملک وفاقی حکومت کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہا ہوگا اور دوسری طرف ہمارے ہاتھوں..... میں دیکھوں گی اس کے اعصاب فولا اور سونے کے کشتے کھا کھا کر آخر کتنے مضبوط ہو چکے ہیں۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”آپ جیسا چاہتی ہیں ویسا ہی ہوگا مسز نجمہ.....!“ ارسلان نے چالپوسی کا انداز

اختیار کیا۔

”کیوں نہیں، کیوں نہیں۔“ مسز ملک نے قہقہہ لگایا۔

تھوڑی دیر تک اسے کچھ سمجھاتی رہی اور اب یہاں سے وہ اگلے مشن پر رخصت ہو رہا تھا۔ اس مرتبہ اس کی منزل نازنین کا کوٹھا تھی۔

○

مختار اس بابائی نے صدقہ داری ہوتے ہوئے اس کا استقبال کیا تھا اور اب نازنین کی باری تھی جو اپنی ماں سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ اس نے مختار اس بابائی کے کمرے سے نکلتے ہی ارسلان باؤ کو پلنگ پر گرادیا تھا۔ مختار اس بابائی نے بوتلیں لانے میں آدھ گھنٹہ لگا دیا۔ وہ دونوں کو اچھی طرح ”بجادلہ خیالات“ کو موقع دینا چاہتی تھی۔ اس نے ارسلان کے ذریعے ابھی بہت لمبے ہاتھ مارنے تھے۔

جب وہ کمرے میں آئی تو آکھ کا اشارہ پا کر نازنین باہر نکل گئی۔

”بیٹا ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ اس نے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

”کیا بی بی؟“

”ملک صاحب کی بچی نے ساری رات خدمت کی لیکن انعام کوئی خاص نہیں ملا..... یوں تو ایسے لوگوں کی نظر کرم ہی ہم غریبوں پر رہے تو اس سے بڑا انعام کیا ہوگا لیکن پھر بھی.....“ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اس نے ارسلان کی طرف دیکھا۔

”بی بی! تم فکر نہ کرو۔ یہ سونے کی مرغی ہے ایک ایک کر کے اس کے سارے انڈے نکال لیں گے بس ذرا میرا خیال رکھنا..... یہ آدمی پیسے کے معاملے میں بڑا کجس ہے۔ صرف اس وقت نکالتا ہے جب قابو آیا ہو..... ورنہ تو سالامفت میں کام چلاتا ہے۔“

”اے بیٹے! تم تو جانتے ہی ہو۔ ہم خاندانی لوگ ہیں۔ بچی کو روز روز بھیجتا ہماری غیرت گوارا نہیں کرتی۔ وہ تو اس روز بھی..... نازنین کو میں نے زبردستی وہاں ٹھہرایا۔ وہ تو تمہارے علاوہ کسی اور مرد کو خود پر حرام سمجھتی ہے۔“ مختار اس نے اپنی دانست میں اسے یہ قیوف بنانا چاہا۔

ارسلان کچھ اور سوچ رہا تھا..... ”ہاں بی بی! دیکھ لو تم نے کوئی زمینداری تو کرنا نہیں۔ اگر ”خانگی“ کی تہمت تم پر لگ گئی تو ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ ایک منصوبہ ہے میرے ذہن میں۔

اگر ہوشیاری سے اس پر عمل ہو جائے تو تمہارے ساتھ ساتھ میری بھی قسمت بن جائے گی۔ ساری زندگی عیش سے گزار دو گی۔“ اس نے اپنی آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

”کیا بیٹا.....؟“ مختار اس نے بے قراری سے پوچھا۔

”ابھی نہیں چند روز صبر کر لو..... پارٹی میرے پیچھے لگی ہے۔ لاکھوں کی آفر ہے۔ میں ایڈوائس پکڑے بغیر بات کرنے والا نہیں۔ تم میری بات مانو۔ جیسے بھی ممکن ہونا زمین کو دو تین مرتبہ اور ملک صاحب کے گھر بھیجو۔ ذرا سمجھا کر..... بڈھے کو قابو رکھے۔ باقی کام مجھ پر چھوڑ دو۔“ اس کی باتوں سے مختار اس کی رال منکنے لگی تھی۔

”ارسلان باؤ تم تو ہمارے بھی استاد نکلتے۔ واہ بھی واہ! مل کر چلیں گے تو دارے

نیارے ہو جائیں گے۔“

”یہ تو بے بی بی!“

نازمین اندر آگئی تھی.....!

دونوں خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد رات کا کھانا آ گیا۔ یہ دیکھ کر ارسلان حیران رہ گیا کہ آج بی بی نے کھانا اپنے پاس سے منگوایا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ چڑیانے دانہ چک لیا ہے اور اب وہ اس کے جال سے نکل نہیں سکتی۔

○

صبح اس کی آنکھ ٹیلی فون کی کھنٹی کی آواز پر کھلی۔

سورج سر پر چڑھ آیا تھا اور وہ ابھی تک حسب معمول لمبی تانے سو رہا تھا۔ فون پر دوسری طرف نقوی صاحب اس سے مخاطب تھے۔ یہ وہی شخص تھا جو چوہدری صاحب کے ساتھ آیا تھا۔ چوہدری نے طلباء کے اغوا کے متعلق ہی باتیں کی تھیں۔ اس نے اپنا موضوع بھارتی سفارت خانے تک محدود رکھا تھا۔

”جناب ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ اس نے بڑے مؤدب لہجے میں کہا۔

”نہیں بالکل نہیں۔ میں اٹھنے ہی والا تھا۔“ ارسلان نے دل ہی دل میں اسے گالی

دیتے ہوئے کہا۔

”واہ جی واہ! ایک طرف آپ ہیں کہ لمبی تان کر سو رہے ہیں اور دوسری طرف بے

چاری کا نٹا دیوی ہے جو آپ کی یاد میں..... رات بھر کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ اب ایسی بے نیازی بھی کیا ہے حضور۔ اس بے چاری کو فون کر کے ایک آدھ ملاقات ہی کر لیجئے۔“ دوسری طرف سے نقوی نے بڑی اپنائیت دکھائی۔

”اس کا مطلب ہے واقعی میرا فون بگ ہے کیونکہ ان لوگوں کو بھی علم ہے کہ میں نے کتنا کو فون نہیں کیا۔ اچھا بیٹا! تم بھی کیا یاد کرو گے۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا اور نقوی سے گویا ہوا..... ”ٹھیک ہے مہاراج آج ہی لیجئے۔“

”ارے آج ہی کیا؟ ابھی کیوں نہیں۔ اس وقت وہ کنیا گھر ہی پر موجود ہوگی اور ہاں یہ نمبر لکھ لو۔ جب کوئی ضرورت ہو خادم کو یاد کر لینا۔“

نقوی نے ایک نمبر لکھوا کر اس سے دو تین ادھر ادھر کی باتیں کیں اور رابطہ منقطع کر دیا۔ فی الحال اس نے انہیں لوگوں کے اشاروں پر ناچنا تھا..... بستر سے اٹھ کر اس نے سب سے پہلے اپنی جب سے وہ سلپ نکالی جس پر کانتا کے گھر اور بھارتی سفارت خانے کا نمبر لکھا تھا، پھر نمبر ملا دیا۔ کسی نے ارسلان کا نام اور فون کرنے کا مقصد دریافت کیا اور اس کی طرف سے جواب ملنے پر سلسلہ دوسری طرف ملا دیا۔

”ہیلو.....!“ اس نے ارسلان کا نام سن کر خوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

”کپے ہیں آپ؟ آپ تو ایسے غائب ہوئے جیسے وہ کیا کہتے ہیں اردو میں کہ کس کے سر سے سینک.....“

”مگدھے کے.....“ ارسلان کے فقرہ مکمل کرنے پر اس نے دوسری طرف سے زبردست تہقیر لگایا۔

”گویا آپ خاصے زندہ دل بھی ہیں۔ فون پر بات نہیں بنے گی۔ آئیے ناں کچھ گپ شپ رہے گی۔ میری ایک سہیلی آئی ہوئی ہے دلی سے۔ اس سے ملا دوں آپ کو..... وہ بھی آپ کی طرح سٹوڈنٹ لیڈر ہے جناب۔“ کانتا کی آواز میں شوخی اور چلبلاہٹ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

”بہت شکریہ آج شام کو ملتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

دونوں نے فون پر گھر پر ہی ملاقات کا وقت طے کر لیا تھا۔

وہ جانتا تھا دوسری طرف اس کے ”دوست“ سن رہے ہوں گے لیکن ”آف دی

ریکارڈ، کچھ سوچتے ہوئے اس نے نقوی کا نمبر ملایا اور اسے کانٹا سے ہونے والی بات چیت لفظ بلفظ سنا دی۔

”وٹر فل.....!“ نقوی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”آج دوپہر کو اکٹھے لہجے کرتے ہیں۔ چائیز میں آجائے۔ ایک بجے میں انتظار کروں گا۔“ نقوی نے فوراً ہی اگلی ملاقات طے کر لی تھی۔

معمول کے دو تین کام نمٹا کر جب وہ یونیورسٹی کا چکر لگا کر چائیز پہنچا تو ڈیڑھ بج رہا تھا۔ نقوی ایک کونے میں میز پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔

”سوری مسٹر نقوی! دیری سوری..... جلوس نے بڑی سڑک ہلاک کر رکھی تھی اور مجھے پانچ میل کا چکر لگا کر آنا پڑا۔ جب کہ شہر کی ساری ٹریفک کارخ بھی ادھر ہی تھا۔“

”کوئی بات نہیں ارسلان صاحب۔ مجھے اندازہ تھا۔ میں خود اسی ٹریفک سے گزر کر آیا ہوں۔“ نقوی نے مسکرا کر بات ٹال دی۔

لہجے پر بلانے کا مقصد دراصل اسے بریفنگ دینا تھا۔ نقوی نے کھانے کا آرڈر اس کی مرضی کے مطابق دینے کے بعد اس سے کام کی گفتگو شروع کر دی۔

”مسٹر ارسلان! اگر تم چاہو تو ملک کی بہت خدمت کر سکتے ہو۔ کانٹا اپنی جس لڑکی کا ذکر کر رہی ہے اس کا نام شتما بھٹ چاریہ ہے۔ یہ بڑی ہوشیار لڑکی ہے اور لندن کے بھارتی سفارت خانے میں خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ بظاہر اس کی شہرت ایک سٹوڈنٹس لیڈر کی ہے لیکن اصلیت کچھ اور..... تمہیں اس اصلیت کا ہی پتہ لگانا ہے۔ اس سے خوب کھل جاؤ۔ اسے جی بھر کے سیر کراؤ، گھماؤ پھراؤ۔ اگر ممکن ہو تو کسی بھی طرح اسے اپنے گھر لے آؤ۔ یہ ”گھر“ ہم تمہیں دکھا دیں گے۔ اگر تم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ملک و قوم کے لئے بڑا نیک شگون ہوگا۔“

”لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں اور آپ لوگ الٹا مجھے دھمکانا شروع کر دیں.....!! بابا آپ سیکورٹی والے لوگ بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ پہلے ہی آپ نے مجھے اس چکر میں پھانسا ہے۔“ یہ بات اس نے ہستے ہوئے کہی تھی لیکن نقوی نے اس کا مدعا پالیا تھا۔

”ارسلان صاحب! مجھے بے حد افسوس ہے اگر ہمارے رویے سے آپ کو تکلیف پہنچی

لیکن آپ جانتے ہیں ہمارا واسطہ کتنے خطرناک دشمن سے ہے۔ اس لئے بہت ہوشیار رہنا پڑتا ہے..... یہ ہمارا فرض ہے کہ بھارتی سفارت کاروں کے ہر مہمان پر نظر رکھیں۔ آپ کا انتخاب صرف ملک و قوم کی خدمت کے لئے کیا ہے۔ اس میں خدا نخواستہ ہمارا کوئی مفاد نہیں۔ نہ ہی آپ کو تکلیف پہنچا کر ہمیں خوشی ملے گی..... اگر آپ اس کام سے انکار بھی کر دیں تو ہم آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، لیکن آپ ایک محب وطن طالب علم لیڈر ہونے کے ناطے مجھے امید نہیں کہ آپ ایسا فیصلہ کریں گے۔“

ارسلان حیران ہی رہ گیا۔ آج تو نقوی کی گفتگو کا انداز ہی بدل گیا تھا اور وہ اس کی اپنے پیروں کی طرح عزت کر رہا تھا۔

”نقوی صاحب! مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میں بھی آپ کی طرح پاکستانی مسلمان ہوں.....!“

اس نے نقوی کی بات کے خاتمے پر کہا۔
”شتما سے علیحدگی میں گفتگو کا موقع ضرور نکالنا..... اور ہاں اگر اس کی یا کانٹا کی طرف سے کوئی آفر ملے تو فوراً قبول کر لینا..... کوشش کرنا کہ کانٹا کے دوستوں کو جان سکے۔“
نقوی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
کھانے کے خاتمے پر نقوی نے ایک لفافہ اسے تھما دیا۔

”یہ کیا.....؟“
اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

”ہماری طرف سے حقیر نذرانہ..... گوکہ آپ کو اس کی ضرورت نہیں لیکن پھر بھی ان لوگوں کو چائے وغیرہ تو پلائی ہوتی ہے۔“ نقوی نے اس کے ”نہ نہ“ کرنے کے باوجود لفافہ اس کی جیب میں ڈال دیا۔

ہوٹل سے باہر اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے اس نے لفافہ چاک کیا جس میں سو سو کے پانچ نوٹ موجود تھے۔ اس نے عجیب سے جذبات محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر لفافہ دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

اب وہ ملک صاحب کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ملک سے اپنے رابطے کا تسلسل کبھی نہیں ٹوٹنے دیا تھا، کیونکہ اب بھی ملک ہی اس کے لئے سب سے بڑا سہارا بن سکتا تھا۔

آستین کے سانپ

ملک حسب معمول میٹنگ میں جانے کے لئے پر تول رہا تھا۔ ارسلان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے مختار راں بائی کا نام لئے بغیر ارسلان سے کہا:

”میں نے ایس ایس پی صاحب سے کہہ دیا ہے۔ کسی پولیس والے کی جرأت نہیں کہ اب ان لوگوں کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھے..... اور ہاں بیٹا! دو ایک روز میں اسے پھر کسی روز لانا۔ بڑے کام کی عورت ہے۔ تم تو جانتے ہو میں کتنی زبردست اعصابی جنگ لڑ رہا ہوں آج کل.....!“ انہوں نے بیہودہ سے اشارے سے ارسلان کو سمجھایا۔

”ملک صاحب! فکر ہی نہ کریں۔ وہ تو اپنے گھرے کی مچھلی ہے جب آپ حکم دیں بلا لیں گے.....! سر! وہ اختر، جاوید والے کیس کا کیا بن رہا ہے؟“ اس نے کام کی بات بھی دریافت کر لینا مناسب سمجھا۔

”بے فکر رہو۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں پوچھے گا۔ ارے ان کی ہمت نہیں کہ ملک سے ٹکر لے سکیں۔ وہ آئی جی کا بچہ بڑا پسے خان بن رہا تھا۔ میں نے بھیج دیا ہے اسٹیشنمنٹ میں واپس۔ اب کرے انتظار ریٹائرمنٹ تک اگلی پوسٹ کا۔ بیٹے کو باقی ساری نوکری انتظار ہی میں کاٹنی پڑے گی..... میں نے دونوں کے لواحقین کے منہ بند کروادیئے ہیں اور انہیں

اعتماد میں لے کر بتا دیا ہے کہ لڑکے نجرمانہ سرگرمیوں میں مارے نہ گئے تو واپس آ جائیں گے۔ ویسے ان کے گھر والوں کو اپنے صاحبزادوں کے کرتوتوں کا علم پہلے سے ہی تھا۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ زیادہ چیں چیں کی تو پولیس سارے پرانے کیس نکالے گی۔ دو تین برآمدگیاں ہی کروانا پڑیں تو پیسہ چل جائے گا..... اور ہاں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی تھی۔“

”جی ملک صاحب.....!“ ارسلان ہمتن گوش ہو گیا۔

ملک صاحب نے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف مخاطب کیا..... ”بیٹا! تم جانتے ہی ہو سیاست میں سب سے پہلے اپنا خون سفید ہوتا ہے۔ آستین کے سانپ ڈستے ہیں۔ ہمارا بزنس ایسا ہی ہے کہ اس میں جس نے اعتبار کیا مار کھائی..... میری خواہش ہے کہ تم ”ملکانی“ پر بھی ذرا نظر رکھا کرو..... ایسی کوئی بات ہے تو نہیں..... لیکن تم جانتے ہو ہم دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں اور عورت ذات کو درغلانا کوئی ایسا مشکل مسئلہ بھی نہیں ہے.....!“ ملک نے مختصر سی بات میں اسے بہت کچھ باور کروا دیا تھا۔

○

ارسلان کا دماغ سن ہو کر رہ گیا۔

یہ سیاست کتنا گھناؤنا کھیل بن چکا ہے اس ملک میں۔

اس نے سوچا۔

پھر اسے خیال آیا کہ شاید قدرت نے ملک کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے جو اس نے ارسلان پر اندھا دھند اعتماد کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے دل میں تو خوشی سے لڈو پھوٹ رہے تھے کہ اگر کوئی معمولی سی مشکل بھی درپیش تھی تو وہ آسان ہو گئی۔

”ملک صاحب! آپ بے فکر ہو جائیں۔ سر! میں آپ کے خلاف کوئی سازش پینے نہیں دوں گا..... میں نے آج تک بیگم صاحبہ سے کبھی زیادہ گفتگو نہیں کی۔ اب جیسے آپ مناسب سمجھیں.....!“ اس نے بڑی مکاری سے جواب دیا۔

”اس کا بندوبست ہو گیا ہے۔ میں نے تمہارا بندوبست اسی بنگلے کی ”انکسی“ میں کر دیا ہے۔ تم ایک دوروز میں یہاں منتقل ہو جاؤ اور بیگم کو بھی کہہ دیا ہے کہ وہ تم پر اعتماد کر سکتی ہے کیونکہ تم گھر کے آدمی ہو۔ تم آج جانے سے پہلے اس سے مل لو۔“

یہ کہہ کر اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ گھریلو ملازمہ دروازے پر حاضر تھی۔

”نیگم صاحبہ کو بلا لاؤ.....!“ ملک نے اسے حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد نیگم صاحبہ وہاں موجود تھی۔ انہوں نے سگریٹ انگلیوں میں دبا رکھا تھا۔

”تم ارسلان کو تو جانتی ہو۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔ بہت اچھا پر خوردار ہے۔ بچہ ہے اپنا..... میں چاہتا ہوں کہ زندگی میں اسے کامیاب انسان بننا دیکھ لوں.....!“ ملک نے اپنی نو بیاہتا نوجوان بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے میں بھی آج کل شدت سے پی اے کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔ ایکشن بھی سر پر آنے والے ہیں۔ یہاں لڑکیاں ہمارے ساتھ نہیں چل سکتیں۔ میں نے کل آصفہ کی بھی چھٹی کروادی ہے۔ کمبخت جہاں کسی بڑے آدمی سے ملی اپنی لائن سیدھی کرنے لگتی ہے..... اور بدنامی ہمیں اٹھانی پڑتی ہے..... تم کل تک ”انیکسی“ میں آ جاؤ..... اچھا میں چلوں، مجھے تقریر کے پوائنٹس تیار کرنے ہیں۔“ لا پرواہی سے جس طرح وہ اندر آئی تھی اسی طرح باہر چلی گئی۔

”میں چلتا ہوں..... کل پرسوں تک اپنا سامان لے آنا۔ اس فلیٹ میں سکندر اور اقبال کو بھیج دو۔“ ملک صاحب نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

”جو حکم سر.....!“ اس کے لئے اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ نجمہ ملک کے سامنے موجود تھا جس کے چہرے پر فتح مندانہ مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔

”میں نے کہا تھا ناں کہ سیانا کو ہمیشہ گندگی پر گرتا ہے۔ ملک لاکھ ہوشیار چالاک سہی لیکن اتنا بھی نہیں جتنا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ اب تم میرے پی اے کی حیثیت سے بھی کام کرو گے اور انٹیلی جنس والوں کی جرات نہیں کہ وہ اس دروازے کے نزدیک بھی پھٹک سکیں۔ ملک صاحب کا اپنے مسلح سپرے داروں کو حکم ہے کہ مشتبہ شخص کو بلا دریغ گولی مار دو۔“

نجمہ ملک نے تو کہہ دیا تھا لیکن اب ارسلان اپنا الگ کھیل شروع کرنے جا رہا تھا۔ وہ اس مرحلے پر انٹیلی جنس والوں کی دوستی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے شام کے پروگرام کی اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا۔ ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے وہ رخصت ہو گیا۔ جانے سے پہلے اس نے مسز ملک کو یقین دہانی کروادی تھی کہ مختار راں بائی والا مشن ضرور مکمل ہوگا اور وہ ماں بیٹی کو اس کام کے

لئے رضا مند کر لے گا۔

سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا جب اس نے بھارتی سفیر کے گھر کی گھنٹی بجائی۔ دروازے پر موجود مسلح گارڈ نے اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھور کر اس کا نام دریافت کیا اور اسے اندر بلا لیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے علم ہو گیا کہ یہاں شارٹ سرکٹ کمرہ نصب ہے اور اندر سکرین پر باہر کی ساری سرگرمیاں دکھائی دیتی ہیں کیونکہ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا۔ گارڈ کے کمین کے اندر موجود انٹر کام کی بیل ہوئی۔ اس نے لپک کر فون اٹھایا اور اچانک بدلے ہوئے موڈ میں باہر آ گیا۔

”ادھر تشریف لے جائیں سر!“ فون پر ہدایت مل گئی تھی اور اب وہ بڑے مؤدب لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

ہاتھ کے اشارے پر چلتے ہوئے ارسلان نے ابھی پہلی روش ہی عبور کی تھی جب اس نے کانٹا کو ایک اور لڑکی کے ساتھ اس طرف آتے دیکھا۔

”ہیلو مسٹر ارسلان! ہاؤ آر یو.....؟“ اس نے اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا کہ ارسلان گڑبڑا کر ہی رہ گیا۔

”یہ ہے میری سہیلی ششما بھٹہ چاریہ..... بہت مشہور شوڈنٹس لیڈر ہے بالکل تمہاری طرح۔“

”ہیلو.....!“ ششما نے بھی اپنا دایاں ہاتھ بڑھاتے ہوئے بڑی گرجوٹی کا مظاہرہ کیا تھا۔

تینوں اندر ایک کمرے میں چلے آئے۔ کمرے کی بج دھج نے ارسلان کو حیران کر دیا تھا۔ یہاں بھارت کے مختلف علاقوں سے متعلق ”ہینڈی کرافٹ“ اور پورٹریٹ موجود تھے۔ شاید یہ لوگ اپنے شکار پھانسنے کے لئے سب سے پہلے اس کمرے میں لاتے تھے کیونکہ ”اجنٹا اور ایلورا“ کی دیواروں پر جو پینٹنگز موجود تھیں ان کا ایک عکس یہاں بھی موجود تھا جس سے نظر ہٹانا کسی بھی نوجوان کے لئے آسان کام نہیں تھا۔

”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ مجھے کاہتا نے بتایا تھا آپ کی تنظیم بہت لبرل ہے۔ جس ملک میں جمہوریت نام کی چڑیا کا وجود بھی نہ ہو آپ ایسے لوگوں کا دم غنیمت ہے۔“

مگر ادا دست ہے حالانکہ وہ عمر میں کسی طرح اس کے باپ ترپاشی سے کم نہیں رہا ہوگا۔

چیف رپورٹر نے ارسلان کو پہچان لیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے زیادہ شناسائی نہیں رکھتے تھے، لیکن کانٹا ترپاشی نے دونوں کا بھرپور تعارف کر دیا۔

”ہمارے بہت اچھے دوست ہیں‘ آپ کی طرح!“ اس نے چیف رپورٹر سے کہا۔

”تفصیلی گفتگو تو پھر کبھی ہوگی، میں تو ادھر سے گزر رہا تھا سو چاہیلو بہلو کر لوں۔“

چیف رپورٹر نے وضاحت پیش کی کہ اسے کسی پریس کانفرنس میں جانا تھا۔

”جناب آپ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہیں، لیکن آج ہمارے ساتھ پیگ لگانے

”دوستی کے نام پر.....!“ سب نے ایک مرتبہ پھر جام بکرائے۔

”آپ کے لئے اس مرتبہ بڑا خاص تحفہ آیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے کانٹا دوسرے کمرے

میں چلی گئی۔

جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بھارتی دھسکی کی دو بوتلیں پکڑی ہوئی تھیں۔ چیف رپورٹر نندے بچوں کی طرح دانت نکال رہا تھا..... اس نے درجنوں مرتبہ شکریہ تھینک یو دھنود اور نجانے کیا کیا کہہ کر بوتلیں بغل میں دبائیں اور آندھی کی طرح آنے والے طوفان کی طرح لوٹ گیا۔

تینوں اسے گاڑی تک چھوڑنے آئے تھے جو اندر پورچ میں پارک کی تھی۔ بڑا سیانا رپورٹ تھا۔ اس نے دونوں بوتلیں ڈگی میں اس طرح چھپائی تھیں کہ تلاشی لینے پر بھی نظر نہ آئیں۔ ”او کے مسٹر ارسلان! ضرور ملے گا اور کوئی بھی خدمت ہو تو ضروری یاد رکھیے گا۔ ہم تو یاروں کے یار ہیں.....!“ یہ کہہ کر اس نے بے تکلفی سے کانتا کے جسم پر ہاتھ مارا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔

ارسلان حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔ کیا مجال جو اس کے چہرے پر تاسف یا شرمندگی کا کوئی شائبہ تک موجود ہو۔

”ڈنرتو“ پارک وے“ میں کریں گے۔“ کانتا نے کہا۔

”او کے۔“ ششمانے رضا مندی ظاہر کی۔

مسترا ازسلان! ہمیں اب دین دھرم سے بلند ہو کر سوچنا ہوگا۔ یہ دنیا بہت بڑی اور انتہائی مختصر بھی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے نفرت کی دیواریں اتنی اونچی اٹھا دی ہیں کہ ہمارا کام بہت بڑھ گیا ہے..... جنگ ہمارے مسائل کا حل نہیں۔ ہمیں محبت بانٹنی ہے تاکہ جو نسل ہمارے بعد آئے وہ ہمارے متعلق ایسا نظریہ قائم نہ کرے جیسا ہم اپنے بزرگوں سے متعلق سوچتے ہیں۔“ اس نے بیٹھا زہرا ازسلان کے ذہن میں اتارنا شروع کیا۔

”ہو گئی شروع تقریر۔ بس تمہارا لیڈر لوگوں کو یہی المیہ ہے کہ جہاں سامعین میسر آئے تقریر شروع کر دی۔ کچھ ہمیں بھی باتیں سننے کا موقع دو گی.....“

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی مؤدب و میز مشروبات کی ٹرائی اندر دھکیل کر اٹے قدموں لوٹ گا۔

”یہ ہمارے بھارت کی نمبر ون بیئر ہے.....!“ کانٹا نے برف کے ٹکڑے بھرے گلاس میں بیئر اٹھیل کر گلاس اسے تھما دیا۔

”تھینک یو.....!“ ارسلان نے گلاس پکڑ کر ششما کے اور نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔

تینوں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ ارسلان اندازہ کر سکتا تھا کہ نامحسوس انداز میں وہ نہ صرف ان کے دل و دماغ میں پاکستان کے خلاف نفرت کا زہرا اِٹیل رہی تھیں بلکہ اس کے منہ سے بھی بہت سی باتیں کھلوا رہی تھیں۔ اس درمیان تِرپاٹھی اور اس کی بیوی بھی وہاں آ گئے تھے۔ انہوں نے چند منٹ بیٹھ کر ان کے ساتھ ”ڈرنکس شیئر“ کئے اور کسی ملک کے سفارت خانے کی تقریب میں شرکت کرنے کے لئے واپس چلے گئے۔

ششمانے اسے بتایا تھا کہ وہ لندن میں ایک ڈپلومہ کورس کر رہی ہے۔ اس نے ارسلان کو لندن اور بھارت کے اپنے ایڈریس اس وعدے کے ساتھ دیئے تھے کہ وہ اسے ضرور میزبانی کا شرف بخشے گا۔

کانادوسرے کمرے سے ٹیلی فون کی آواز پر اٹھ کر باہر گئی جب وہ واپس آئی تو اکیسلی نہیں تھی۔ ایک اور شخص بھی اس کے ساتھ موجود تھا اور یہ کوئی اجنبی شخصیت نہیں تھی۔ ارسلان کے لئے یہ چونکا دینے والی بات تھی کہ مقامی اخبار کا چیف رپورٹر بھارتی سفارت کار کی بیٹی کا ذاتی اور

تینوں ارسلان کی کار میں جو اسے ملک صاحب نے استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی تھی بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ کھانا خاصا پر تکلف تھا۔ ارسلان کے بھند ہونے کے باوجود بل کا نٹا نے ادا کیا تھا۔ یہاں کے ویٹر بھی شاید اسے پہچانتے تھے کیونکہ سارا عملہ کھینوں کی طرح تمام وقت ان کے گرد ہی جھنڈتا رہا۔

کھانا کھا کر جب تینوں باہر نکلے تو ہوٹل میں ایک پجاری جیب داخل ہو رہی تھی اور جب جیب کے ڈرائیور نے دروازہ کھولا تو ارسلان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس میں سے بین الاقوامی سنگسرجاں خان اور مسز نجمہ ملک برآمد ہوئے تھے۔ آج کا یہ دوسرا اور اس کی زندگی کا شاید بہت بڑا ”سرپرائز“ تھا جو اسے ملا۔

اپنی کار میں بیٹھے تک وہ پلٹ کر بار بار دونوں کو دیکھتا رہا۔
 ”کوئی دوست ہیں آپ کے؟“ ششمانے اس کی پریشانی نوٹ کر لی تھی۔
 ”نہیں! میں سوچ رہا تھا انہیں کہیں دیکھا ہے۔“ اس نے بات ٹالنے کے انداز میں کہا۔

”ویل مسٹر ارسلان کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں بھی دیکھ کر آپ ایسا سوچنے لگیں۔“
 ”ارے نہیں مس! آپ کوئی بھولنے والی ہستی تھوڑی ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ایکٹین میں چابی گھمائی۔

دونوں کو گھر ڈراپ کر کے جب وہ رخصت ہونے لگا تو ایک مؤدب ملازم نے دہسکی کی ایک بوتل اس کے ساتھ والی سیٹ پر رکھ دی تھی۔

”ہماری دوستی کے نام پر..... انجوائے یور سیلف۔ بائے بائے۔“ کانٹا اور ششمانے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

دونوں ہاتھ ہلاتی اندر چلی گئیں۔ حیران و پریشان ارسلان نے ایکسیلیٹر دبایا اور کار کو ہوا کے دوش پر اڑا تا گھر آیا۔ اس نے اپنے اندر والے شیشے سے ایک جیب کو اپنے مسلسل تعاقب میں دیکھ لیا تھا، لیکن اسے اس بات کی پروا نہیں تھی۔ عین ممکن ہے یہ لوگ اس کی حفاظت کر رہے ہوں۔ اپنے بستر پر گرتے ہوئے وہ مسز ملک کے اس روپ کے متعلق سوچتا رہا اور جب کسی نتیجے پر نہ پہنچا تو کروٹ لے کر نیند کا انتظار کرنے لگا۔

صبح اسے سب سے پہلے نجمہ بیگم نے ہی طلب کیا تھا۔ وہ ناشتے کی میز پر اس کی منتظر تھیں اور یہ اطلاع اسے گھر بیٹو انٹرکام پر نجمہ بیگم سے ملی تھی۔ تین گھنٹوں کے بعد وہ بیدار ہوا تو دوسری طرف سے بیگم نجمہ نے اس سے دریافت کیا..... اور جب اس نے بتایا کہ صبح کے فونج رہے ہیں تو ارسلان کچھ شرمندگی ہی محسوس کرنے لگا۔

”اگر تم دوپہر سے پہلے ناشتہ کرنا پسند کرو تو پندرہ بیس منٹ تک آنا.....!“ اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

پندرہ منٹ سے پہلے وہ ناشتے کی میز پر موجود تھا۔ ملک صاحب کل شام دارالحکومت گئے تھے اور وہاں دو تین روز قیام کرنے کے بعد ہی انہوں نے واپس آنا تھا۔ اس مرتبہ پارٹی کی مرکزی کمان نے اپنے خصوصی اجلاس کے لئے ملک کے ہر حصے سے اہم سیاسی شخصیات کو مدعو کیا تھا جن میں ملک صاحب سرفہرست لوگوں میں شامل تھے۔ اس مرتبہ چونکہ نئی نامزدگیاں ہونی تھیں اس لئے اجلاس دو تین روز جاری رہ سکتا تھا۔

ارسلان کو بے کلی سے لگی ہوئی تھی۔ وہ جلد از جلد نجمہ اور سجاد خان کے تعلقات کی اہمیت جاننا چاہتا تھا لیکن خود سے کوئی سوال کرنے کی ہمت اس میں نہیں تھی اور اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ بیگم نجمہ خود ہی اس موضوع پر بات کرے۔

نجانے اس کی بات کا کیا مطلب لیا جائے؟
 ”کیسی رہی کل کی ملاقاتیں.....؟“ اس نے ارسلان سے اچانک ہی پوچھا اور وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

کیا اسے میرے کل کے پروگرام کا علم تھا؟ حالانکہ اس نے خود نجمہ بیگم سے کچھ نہیں کہا تھا۔ عین ممکن ہے اس نے بھی ارسلان کو ہوٹل میں دیکھ لیا ہو۔ اگر اس کی نظر نجمہ پر پڑ سکتی ہے تو نجمہ بیگم کی نظریں بھی اس پر پڑ سکتی تھیں۔

جھوٹ بولنا اس کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔
 ”کل میں ذرا کانٹا کی طرف نکل گیا تھا۔ ایسا کوئی پروگرام تو نہیں تھا لیکن وہاں دیر لگ گئی اور وہ لوگ بھند تھے کہ میں ڈر ان کے ساتھ کروں۔ ادھر سے بھی فراغت تھی اس لئے میں

یہ بات وہ ضرور سمجھتا تھا کہ اگر یہ نجمہ ملک کی کسی سیکم کا حصہ ہے تو وہ کبھی اسے اندھے کنوئیں میں نہیں دھکیلے گی بلکہ اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دے گی۔

پھر اس کے ذہن میں ایک لمحے کے لئے یہ خیال بھی آیا کہ سجاد خان سے نجمہ ملک کی دوستی کا پس منظر کہیں یہ غیر ملکی دورے تو نہیں؟ وہ جانتا تھا کہ ایک چکر ہیر وئن سمیت اگر کامیابی سے لگایا جائے تو دارے نیارے۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ مسز ملک نے اسے اب کوئی ایسی مہم سونپی ہو۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ مسز ملک نے اسے خاموشی سے چائے کی پیالی کو گھورتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

”جی کچھ نہیں.....!“ وہ کھیانی ہی ہنسی دیا۔

”میں جانتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو..... مجھے اس بات کا بھی علم ہے کہ تم نے مجھے سجاد خان کے ساتھ دیکھ لیا ہے کیونکہ میں نے بھی تمہیں دروازے سے نکلنے دیکھا تھا..... دیکھو ارسلان! اب ہم برنس پارٹنر ہیں۔ ہم نے جس کھیل کے میدان میں قدم رکھا ہے وہاں کے کوئی لگے بندھے اصول نہیں ہیں۔ یہاں ”بائی ہک یا بائی کروک“ جیسے بھی ہو آگے نکلنے کی جگہ بتانی پڑتی ہے۔ سیاست کے گھناؤ نے کھیل سے اور بھی بہت سی قباحتیں وابستہ ہیں۔ یہ لوگ جو بریف کیس بھر کر روپیہ لٹاتے ہیں کوئی اپنے آباؤ اجداد کی زمینیں فروخت کر کے روپیہ نہیں لاتے۔ یہ سب بلیک منی ہے یا پھر سرکاری بینکوں سے لوٹا ہوا روپیہ..... اور اس کا حصول تب ہی ممکن ہے جب ہم اپنے ضمیر اور نام نہاد شرافت کو ایک طرف رکھ کر سوچیں۔ سجاد خان اس ملک کا ہی نہیں دنیا کا مانا ہوا سنگم ہے۔ اس نے ہیر وئن کے پیکٹوں سے سونے کے محلات کھڑے کئے ہیں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ سجاد خان سنگم ہے لیکن مجھے بتاؤ کہ اس ملک کا کون سا حکمران سیاستدان یا بڑا آفیسر ہے جو اس کی دوستی کا محتاج نہ رہتا ہو؟ یہ لوگ سجاد خان کو اپنی نجی محفلوں میں بلانے کے لئے کیا کیا گھٹیا حرکتیں کرتے ہیں تم تصور نہیں کر سکتے۔ تم جانتے ہو یہاں کے مقامی حکمران نے ایک مرتبہ کتنی حسرت بھری آواز میں ساتھیوں سے یہ کہا تھا کہ سجاد خان صاحب اس کی دعوت قبول نہیں کرتے..... جب یہ لوگ وفادار کتوں کی طرح اس کے قدموں میں بچھے رہتے ہیں تو ہمیں اس کے سامنے بیٹھ کر اس کے برابر کھڑے ہو کر اس سے تعلقات قائم رکھنے میں اعتراض

نے.....“

اس نے نظریں کھنکھن کے ٹوسٹ پر جماتے ہوئے وضاحت کرنا چاہی۔

”ارے اس میں شرمائے کی کیا بات ہے؟ کہیں شرمائے والا کام تو نہیں کیا؟“ اس نے ارسلان کی بات کاٹتے ہوئے نامکمل سی بات کہہ دی۔

”نہیں، نہیں.....!“ ارسلان بے اختیار ہنس دیا۔

اس کے اعصاب خاصے پرسکون ہو رہے تھے۔

”نازنین والا کام جلد ہو جائے تو اچھا ہے۔ اگر ہم نے الیکشن سے پہلے یہ کام کر لیا تو سمجھ لینا لڑے بغیر ہم الیکشن جیت گئے۔“ نجمہ بیگم نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

”آپ بے فکر رہیں۔ میں نے ان سے اشارت بات کی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ انکار کریں گے۔ پیسہ ان لوگوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔“

”ہاں! تم نے سچ کہا۔ واقعی کمزور انسانوں کی پیسہ سب سے بڑی کمزوری بن جاتا ہے۔“

اس نے اب سگریٹ سلگا لیا تھا۔ ایک طویل کش لے کر دھوئیں کے مرغولے فضا میں بکھیرنے کے بعد اس نے دھوئیں پر نظریں جماتے ہوئے ارسلان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”تم پاسپورٹ کیوں نہیں بنالیتے..... اس کی ضرورت تو ہمارے برنس میں ہر وقت رہتی ہے۔ بھی دنیا کو دیکھو گے نہیں تو سمجھو گے کیسے؟“

”لیکن میرے لئے یہ کیسے ممکن ہے؟“ ارسلان کو اس بات سے واقعی خوشی ہوئی تھی۔

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ اس نے لا پرواہی سے کہا..... ”تم فارم بھر کے امجد صاحب کو

دے آنا۔ باقی میں خود دیکھ لوں گی۔“

امجد ملک صاحب کے وکیل کا نام تھا جس کو تنخواہ ہی ”ہنگامی حالات“ سے نمٹنے کی دی جاتی تھی۔

”شکریہ۔“ ارسلان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

تب اس کے ذہن میں دور دور تک یہ بات نہیں تھی کہ بیرونی ممالک کی یہ سیر اسے کیوں کروائی جا رہی ہے۔

نہیں ہونا چاہئے..... جب تم میرے ہمراہ اس سے ملاقات کرو گے تو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لو گے کہ قابل نفرت سجاد ل خان ہے یا ملک صاحب جیسے معزز اور معتبر شہری.....؟“

ارسلان اندازہ کر سکتا تھا کہ اس عورت میں کتنا زہر بھرا ہوا ہے..... وہ جان سکتا تھا ایسی زہریلی عورت جب ملک کو ڈسے گی تو اسے شاید اگلے سانس کی مہلت بھی میسر نہ ہو سکے۔

متوسط گھرانے میں جنم لینے والی نجمہ نے..... ایسی بھیانک اور مکروہ زندگی کا کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ جانے اس ملک کے ملک صاحبوں نے ایسی کتنی معصوم لڑکیوں کے اذہان میں زہر بھرا کر انہیں عورت کے عظیم منصب سے گرا کر انسانیت کی سطح سے بھی گرا دیا ہے۔

ملک واقعی کسی کڑی سزا کا مستحق تھا۔

○

اس روز شام کو نقوی صاحب کا ٹیلی فون آ گیا۔ وہ فوراً ملاقات کے خواہش مند تھے۔

ارسلان نے محسوس کیا کہ نقوی صاحب فون پر گفتگو کرنے سے احتراز برت رہے تھے کیونکہ انہوں نے فون اس کے نئے ٹھکانے پر کیا تھا۔ نقوی نے اسے ملاقات کی جگہ بتادی تھی اور اب وہ اسی طرف جا رہا تھا۔

نقوی صاحب بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی وہ بلائیں لینے کے انداز میں ارسلان کی طرف لپکے۔

”ویل ڈن..... ونڈرفل۔ شاندار۔ کمال کر دیا بھئی..... مان گئے ارسلان صاحب آپ کو۔ یا ر تم نے سالی پر جادو کر دیا ہے۔“ انہوں نے ایک ہی سانس میں نجانے کیا کچھ کہہ دیا۔

”شکریہ نقوی صاحب! یہ میرا فرض تھا۔“

دونوں یہاں سے پیدل ہی نزدیکی باغ کی طرف چل دیئے جہاں ایک کونے میں رکھے پتھر کے پنج پر نقوی صاحب کی قماش کا کوئی دوسرا آدمی پہلے سے موجود تھا۔

”تم جاؤ کینٹین والے سے یہاں چائے پہنچانے کو کہہ دینا۔“ انہوں نے اس شخص سے کہا جس نے ابھی ارسلان کی طرف غور سے دیکھا بھی نہیں تھا۔

حکم سن کر وہ چل دیا۔ دونوں اس پنج پر بیٹھ گئے۔

شام کا ملگجا اندھیرا باغ کے درختوں سے اب گھاس پر اترنے لگا تھا۔ رخصت ہوتی

گرمیوں کی خوشگوار شام کا ٹھنڈا اور فرحت بخش ذائقہ ارسلان کو اپنی نس میں سماتا محسوس ہوا۔

باغ کے مختلف کونوں کھدروں میں کسی انجانے خوف سے سہمے سٹے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے جوڑے ایک دوسرے کو مستقبل کے سنہرے خواب دکھا رہے تھے۔ یہ سب اپنے گھروں سے جھوٹ بول کر یہاں آئے تھے۔ اپنے نزدیک قدموں کی آہٹ پر وہ خوفزدہ ہرنوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے، پھر کسی کوسر پر موجود نہ پا کر کھسیانے انداز میں دوبارہ جو گفتگو ہو جاتے۔

باغ کی مصنوعی پہاڑیوں پر سالوں سے سایہ فگن درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندوں کی آوازیں اب آہستہ آہستہ دم توڑنے لگی تھیں۔ کسی فوارے سے کبھی پانی دھار کی صورت برآمد ہوتا پھر چپ سادھ لیتا۔

جان توڑ گرمی اور سادوں بھادوں کے شدید جس کے بعد اب شام کو درختوں سے سرسراہٹ والی ٹھنڈی ہوائ نے یہاں معمول کی سیر کو آنے والوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا تھا۔

ارسلان بھی یہاں خود پر مسلط گھٹن سے نجات محسوس کر رہا تھا۔ کینٹین والا شاید نقوی صاحب کو جانتا تھا۔ اس نے چائے اپنے پاس محفوظ برتنوں میں سجا کر ان کے سامنے رکھ دی اور خود واپس لوٹ گیا۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ارسلان نقوی کو کانٹا کے ہاں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔ اس نے اپنی دانست میں چیف رپورٹر کی وہاں آمد اور بھارتی سفیر کی بیٹی سے اس کی بے تکلفانہ دوستی کی تفصیلات بتا کر چونکا دینے والی بات کی تھی۔

لیکن.....!

وہ حیران ہی رہ گیا کہ نقوی صاحب کو ان تمام باتوں کا پہلے سے علم تھا اور انہوں نے اس پر کوئی خاص تبصرہ نہیں کیا، حالانکہ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ اس انکشاف سے وہ نقوی صاحب کو چونکا کر رکھ دے گا۔

اس نے نقوی صاحب کو ملاقات کی ایک ایک تفصیل بتائی تھی۔ ارسلان نے محسوس کیا تھا کہ یہ لوگ کانٹا سے زیادہ دلچسپی اس کی لندن والی دوست شمشاد بھٹہ چاریہ میں لے رہے تھے۔

شاید یہ لڑکی لندن میں بھارتی انٹیلی جنس کے لئے کام کرتی رہی ہے۔ اس نے سوچا۔

”کسی طرح اپنے دوستوں کو سیر کروانے گھر پر لے آؤ تو خوب مزہ رہے۔“ نقوی نے

بالا خروہ بات کہہ ہی دی جس کے لئے وہ جانے کب سے ذہنی طور پر تیاری کر رہا تھا۔

”کوشش! کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ اس سے پہلے یہ سب کچھ کہاں تھا جواب ہے..... بھئی ارسلان صاحب جو آج ہے وہ کل نہیں تھا اور جو کل ہو گا وہ آج نہیں ہے۔ وہ کیا کہا ہے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے۔“

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہو گا

نقوی صاحب کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چمک گئی۔

”آپ نے مجھے کس آج کل کے چکر میں پھنسا دیا۔ جناب! بے فکر رہنے میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ آپ کی توقعات پر پورا اتر سکوں“ ارسلان نے اس کی فلسفیانہ گفتگو کو روکتے ہوئے کہا۔

”مسٹر ارسلان! چیف رپورٹر جیسے بہت سے لوگ ابھی تمہیں ملیں گے۔ یہ لوگ شراب کی ایک بوتل کے لئے غیر ملکی عورت کی چند منٹ کی صحبت کے لئے کہاں تک گر سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ بھی تمہیں اچھی طرح ہو جائے گا۔ جب میں نے سروس جائن کی تھی تو ایک مشن لے کر آیا تھا لیکن بہت جلد مجھے احساس ہو گیا کہ میں پرلے درجے کا احمق ہوں..... مجھے اپنی سوچ پیشہ ورانہ بنانی چاہئے۔ اگر میں نے اپنی ”ڈیوٹن“ (devotion) کو اس میں شامل کر لیا تو کسی کام میں کچھ نہیں بگاڑ پاؤں گا..... ہاں میری اپنی سروس فائل کا حلیہ ضرور بگڑ جائے گا۔“

ایک لمحے کے لئے رک کر اس نے سگریٹ سلگایا تو سگریٹ لائٹر کی روشنی میں ارسلان نے اس کے چہرے اور آنکھوں میں کروٹیں لیتی کرب کی لہروں کو اتنا ہی شدت سے محسوس کیا جس شدت سے نقوی خود گزر رہا تھا۔

”ارسلان صاحب! بسا اوقات جی چاہتا ہے کہ ان لوگوں کے ٹکڑے کر ڈالوں جو مادر وطن کی عصمت پر کلنک کا ٹیکہ بن جاتے ہیں، لیکن میں صرف رپورٹ کر سکتا ہوں۔ میں کیا میرے جیسے معبولی آفیسر کی تو حیثیت ہی نہیں۔ یہاں تو بڑے بڑے بے ڈی ان لوگوں کا کچھ نہیں کر پاتے۔“

ارسلان کو بے حد افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے چیف رپورٹر کا ذکر کیوں چھیڑ دیا۔ اسے محسوس ہوا کہ نقوی جیسے ایجنڈا ریسکورٹی آفیسر کا دم قدم نہ ہو تو اس ملک کا خدا ہی حافظ۔

دیر گئے تک وہ باتیں کرتے رہے پھر نقوی اسے اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ اس مرتبہ وہ شہر کی ایک ماڈرن آبادی کے فلیٹ میں پہنچے تھے۔ دو بیڈرومزاور ڈرائنگ ڈائننگ پر مشتمل شہر کی اس متمول آبادی میں موجود یہ فلیٹ بڑے قیمتی سامان سے آراستہ تھا۔ نقوی صاحب نے اسے فلیٹ کا مکمل ”تعارف“ کروانے کے بعد ایک چابی اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا۔

”جب بھی تم اپنے مہمانوں کو یہاں لانا چاہو اس گھر کے دروازے کھلے پاؤ گے۔ یہاں کا فریج ہر وقت اشیاء ضرورت سے بھرا رہتا ہے۔“

ارسلان نے مسکراتے ہوئے چابی اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔ اب وہ اچھی طرح سے سمجھ گیا تھا کہ نقوی صاحب نے ”مہمانوں“ کو خاص طور سے یہاں مدعو کرنے کے لئے کیوں کہا تھا۔

○

انسپکٹر اکرم آج پھر دونوں اغوا کنندگان کے گھروں کے چکر کاٹ رہا تھا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے پہلے اختر کے گھر والوں پر قسمت آزمائی کی تھائی۔ اسے ان لوگوں سے کچھ باتیں آن دی ریکارڈ کھلوانی تھیں۔ اس مرتبہ اس نے اختر کے باپ مولوی اشفاق صاحب کو دفتر سے واپسی پر گھیر لیا تھا۔

مولوی اشفاق ریلوے آفس میں سینئر کلرک تھے اور جتنا بیٹا خراب اتنا ہی باپ نیک اور اچھا انسان..... اس سے پہلے بھی اکرم ان سے مل چکا تھا۔

”مولوی صاحب! بخدا میں آپ کو بار بار تنگ کر کے آپ کے زخم کریڈنا نہیں چاہتا“ لیکن میری یہ خواہش ضرور ہے کہ آپ کے بیٹے کو اگر وہ اس دنیا میں موجود ہے جلد از جلد آپ تک پہنچاؤں۔ اس کے علاوہ بار بار ملاقات کا اور کوئی مقصد نہیں۔“ اس نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا کہ مجبور باپ کی بے کسی اور الم نصیبی کا اندازہ وہ لگا سکتا تھا۔

”میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں بیٹا۔ لیکن تمہارے ہر سوال کا جواب میں متعدد مرتبہ دے چکا ہوں..... میرے پاس بتانے کو اور کچھ نہیں ہے.....!“ انہوں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

”دیکھئے بزرگوار! میں جانتا ہوں آپ کچھ چھپا رہے ہیں..... مجھے حیرت ہوتی ہے کہ

اپنے بیٹے کی زندگی پر کسی دھمکی یا لالچ کو ترجیح دیتے ہیں۔“ انسپٹر اکرم نے یہ بات کہہ کر جیسے مولوی صاحب کی دکھتی رگ کو اچانک ہی چھیڑ دیا ہو۔ وہ پھٹ پڑے۔

”کاش تمہاری کوئی جوان بیٹی ہوتی اور تمہیں دھمکی دی جاتی کہ اگر کوئی الناسید ہابیائے دیا تو اسے اغوا کر لیا جائے گا۔ پھر میں تمہیں پوچھتا کہ.....“ اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ ان کا گلارندھ گیا۔

انسپٹر اکرم کا دل بھر آیا۔ اس نے مولوی صاحب کو تسلی دی اور انہیں یقین دلایا کہ ان کی کبھی ہر بات صرف اس کے حکمے تک محدود رہے گی اور وہ عام پولیس والوں کی طرح کبھی انہیں تنگ نہیں کریں گے۔ اس نے مولوی اشفاق صاحب کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنا بیان لکھ کر دے دیں۔

مولوی اشفاق نے بھی آج سارے معاملات خدا پر چھوڑ دیئے۔ وہ دیندار آدمی تھے۔ ساری زندگی انہوں نے بہت ”ریزرو“ رکھ کر گزاری تھی۔ خدا جانے کس بری گھڑی اختر نے ان کے ہاں جنم لیا تھا کہ جس کی وجہ سے مولوی صاحب کو تھانہ کچہری بھی دیکھنا پڑ جانا تھا۔

انہوں نے تفصیلاً سارے واقعات گوش گزار کر دیئے۔ انہیں اس بات کا علم ہی نہ ہو سکا کہ ان کے اور انسپٹر اکرم کے درمیان ہونے والی ساری گفتگوریکارڈ ہو رہی ہے۔ مولوی صاحب نے بتایا کہ جب سے اختر نے انقلابی طلباء تنظیم میں شمولیت اختیار کی، گھر سے اس کا رابطہ قریباً ختم ہو گیا تھا اور وہ ہوشل میں رہنے لگا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ دو تین مرتبہ پولیس نے ان کے گھر پر بھی چھاپہ مارا اور ایک دفعہ تو وہ اتنے مجبور ہو گئے کہ اس روز روز کی ذلالت سے بچنے کے لئے اسے باقاعدہ اخبار میں اشتہاد کے کرایہ کرنے کا پروگرام بنایٹھے تھے، لیکن اس کی ماں آڑے آگئی۔

”بیٹا! میری چار بیٹیاں ہیں اور ایک ہی بیٹا ہے۔ لوگ زینہ اولاد کے لئے خدا سے جانے کیا کیا التجائیں کرتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کاش خدا نے مجھے اختر کی جگہ بھی بیٹی ہی دے دی ہوتی۔ کم از کم پھر پولیس میرے گھر کا دروازہ نہ دیکھتی۔ اختر نے تو مجھے جیتے جی مار ڈالا..... خدا بیڑہ غرق کرے اس ملک صاحب کا جو ہر مرتبہ آڑے آتا اور اسے قانون کی گرفت سے بچا لیتا ہے۔“

”آپ کو اس بات کا علم کیسے ہوا؟“ اکرم نے درمیان میں ہی انہیں ٹوک دیا۔

”اختر نے خود بتایا تھا۔ اس پر جو دو تین کیس تھے وہ بھی ملک صاحب نے ہی ختم کروائے تھے۔ ورنہ میری کیا مجال تھی۔ ایک مرتبہ جب سے کسی جگہ گولی لگی تھی تو بھی ملک نے ہی اس کا علاج کروایا تھا۔“

”آپ کبھی خود ملک صاحب سے ملے ہیں؟“

”صرف ایک مرتبہ جب چند روز پہلے انہوں نے خود مجھے گھر بلایا اور تسلی دی تھی کہ وہ اختر کو جلدی ڈھونڈ نکالیں گے اور مجھے خاموش رہنے اور پولیس کو کوئی بیان نہ دینے کی ہدایت کی تھی۔“

”یہ کب کا واقعہ تھا.....؟“

”مجھے تاریخ تو یاد نہیں، البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ ان دنوں نو جوان کافی ہنگامہ آرائی کر رہے تھے۔ اس روز مجھے اور نواز کی والدہ کو ملک صاحب نے اپنے گھر بلایا تھا۔ نواز کا باپ تو کسی دوسرے ملک میں ہوتا ہے۔ اس کے گھریلو حالات کچھ ایسے برے بھی نہیں لیکن مجھے ملک صاحب نے دس ہزار روپے برادری تھا دیئے تھے..... بیٹا! وہ رقم جوں کی توں رکھی ہے۔ میں مرزا مرزاؤں کا مگر حرام کا ایک پیسہ اپنے گھر نہیں آنے دوں گا..... اگر میں اس وقت ملک صاحب کو انکار کر دیتا تو اس کے نتائج میرے حق میں اچھے نہ نکلتے۔“

انسپٹر اکرم اب خود کو خاصا ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اپنے کوٹ کی جیب میں چھپائے ٹیپ ریکارڈر میں اس نے ساری گفتگوریکارڈ کر لی تھی۔ اس کا رگڑاری سے وہ چوہدری صاحب کو خوش کر سکتا تھا۔

اس نے مولوی اشفاق احمد کو یقین دلایا تھا کہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو ہمیشہ راز رہے گی اور انہیں ہدایت کی تھی کہ فی الوقت وہ صرف ملک کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں اور کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے ملک صاحب کو ان پر شک گزرے۔ اس نے مولوی صاحب کو ایک فون نمبر دیتے ہوئے تلقین کی تھی کہ اگر کسی بھی مرحلے پر اس کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ اسے ضرور یاد کریں۔

مولوی صاحب سے اس نے اختر کے دو چار خاص دوستوں کے کوائف بھی لے لئے تھے اور اب مزید کامیابیوں کی امید کے ساتھ اس کے ایک دوست بابر کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

انٹیلی جنس کے افسر کو سامنے دیکھ کر باربر کے توباقوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے سنا تھا کہ یہ لوگ توبندے کو ایسے غائب کرتے ہیں کہ اس کا پھونکھی پتہ ہی نہیں چلتا۔ ایک مرتبہ اختر نے ہی اسے بتایا تھا کہ جیسے ان لوگوں نے اپنے خفیہ ٹارچر سیل بنا رکھے ہیں جہاں وہ مخالف طلبہ تنظیم کے نوجوانوں کی تفتیش کرتے ہیں، اسی طرح انٹیلی جنس والوں نے اپنے خفیہ عقوبت خانے بنا رکھے ہیں اور جس شخص کو ایک مرتبہ یہ لوگ غائب کر دیں وہ پھر مشکل ہی سے گھر لوٹتا ہے۔

”دیکھو میاں تم مجھے شریف گھرانے کے معلوم ہوتے ہو۔ تمہارا باپ بھی سرکاری ملازم ہے اور تمہارے گھریلو حالات بھی تم سے ڈھکے چھپے نہیں۔ تمہاری ایک بہن طلاق لے کر گھر آن بیٹھی ہے اور دوسری دونوں شادی کے انتظار میں بوڑھی ہو رہی ہیں..... ہمیں ہر بات کا علم ہے کہ تمہارا بڑا بھائی شادی کے بعد والدین کو چھوڑ گیا ہے۔ ان حالات میں اگر تمہاری وجہ سے تمہارے والدین کو کوئی صدمہ پہنچا تو تمہارا والد خودکشی کر لے گا۔ اس کے بعد تمہارے گھر پر کیا قیامت ٹوٹے گی اس کا تم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہو۔ میری تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں۔ ہمیں حکم تو یہی ملا ہے کہ اختر کے دوستوں کو ایک ایک کر کے ”سرکاری مہمان خانے“ کی سیر کروائیں اور وہیں ان کی تفتیش کی جائے، لیکن مجھے تمہارے گھریلو حالات کی وجہ سے رحم آ رہا ہے۔ خدا کا شکر کرو کہ تمہاری تفتیش میرے ذمے لگی ہے۔ اگر کسی اور کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ اس طرح تمہارے ساتھ بات نہ کرتا..... اب تم اتنے بچے بھی نہیں ہو کہ میں تمہیں بتاؤں کہ پولیس والے کس زبان میں گفتگو کرتے ہیں..... تمہاری عمر کا میرا ایک بھائی ہے جو تمہاری ہی طرح طلباء سیاست میں پھنس کر مصیبت میں پڑ گیا ہے۔ میں خود ان حالات سے گزر چکا ہوں۔ اس لئے تمہیں صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ اگر میرے ساتھ تعاون کرو گے تو ہم دونوں فائدے میں رہیں گے ورنہ یاد رکھنا کہ اس معاملے میں ملک صاحب تو کیا ان کا باپ بھی تمہارے کام نہیں آ سکے گا۔ ہم لوگ پولیس کی طرح کوئی رپٹ تو درج نہیں کرتے.....“

انسپکٹر اکرم نے اس کے چہرے کی بدلتی کیفیت سے اندازہ لگا لیا تھا کہ شکار جال میں پھنس گیا ہے۔ اس نے ایک دفعہ توبار کو خوفزدہ کر دیا تھا۔

”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں.....؟“ باربر نے حلق میں تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

خوف سے اس کا گلابری طرح خشک ہو رہا تھا۔ یہ شخص تو اس کے تمام گھریلو حالات جانتا تھا۔ واقعی اگر اس کے والدین کو بھٹک بھی لگ جاتی کہ پولیس یا سی آئی ڈی اس کے پیچھے ہے تو جانے وہ بد نصیب کیا کر گزرتے۔ اپنے والدین اور گھریلو حالات کے پیش نظر تو اس نے کبھی سرگرمی سے پالیٹکس میں حصہ ہی نہیں لیا تھا۔ بس اختر کے ساتھ دوستی کی وجہ سے وہ اس تنظیم کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ ورنہ تو اس نے کبھی کوئی غلط کام کرنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

”میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اختر کے متعلق تم جو کچھ جانتے ہو، صاف صاف بتا دو..... سب سے پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اس کے ساتھ مل کر کوئی واردات بھی کی تھی؟“

انسپکٹر اکرم نے ہوا میں تیر چلایا جو عین نشا نے پر لگا۔

”نہیں! نہیں! خدا کی قسم میں نے تو اس کے ساتھ مل کر کبھی کچھ نہیں کیا۔ وہ تو اور لڑکے ہوں گے۔ مجھے کچھ علم نہیں مجھے تو وہ.....“

”ہاں! ہاں! شباؤ! سچ بتا دو۔ بے فکر رہو۔ میں نے کہا ناں کہ تم میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہو اور میں تمہارے ساتھ نہ کوئی خود زیا دتی کروں گا نہ کسی کو کرنے دوں گا لیکن شرط ایک ہے کہ تمہیں سچ بولنا ہوگا۔“ اکرم نے بے چینی سے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی تھی۔ لڑکا کوئی کام کی بات بتانے جا رہا تھا۔

”وہ تو جی مجھے کبھی کبھی پیسے دیا کرتا تھا اور کبھی کبھی مجھے عورتوں کے پاس لے جایا کرتا تھا۔“

”کہاں کس کے پاس؟“ اکرم نے بے قراری سے دریافت کیا۔

”تین چار عورتیں ہیں۔ ایک شاہی بازار میں گانے بجانے کا دھندہ بھی کرتی ہے۔ اس کے پاس تو وہ مجھے صرف ایک دفعہ لے گیا تھا۔ عورتوں کے ٹھکانوں کا مجھے علم نہیں لیکن ہم گلشن باغ کی ایک کونھی میں جایا کرتے تھے۔ وہیں سب کچھ ہوتا ہے۔“

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”دیکھو ایک بات ذہن نشین کر لیتا۔ میں ابھی نرمی اور شرافت سے کام لے رہا ہوں۔ اگر تم نے مجھے ڈانچ کرانے کی کوشش کی تو یاد رکھنا.....“ انسپکٹر اکرم اپنا دباؤ اس پر مسلسل بڑھ رہا تھا۔

بابر کی گھٹھی بندھ گئی تھی..... وہ بات بات پر قسم اٹھا کر اسے اپنے سچا ہونے کا یقین دلا رہا تھا۔

”شاہی بازار والی عورت کا نام کیا ہے؟“

”مجھے نام کا تو علم نہیں ہے۔ میں اس کے کوٹھے تک..... آپ کو لے جاسکتا ہوں۔“

اس نے جواب دیا۔

”اچھا اب ذرا ذہن پر زور دے کر سوچو اور بتاؤ کہ اختر کہاں ہو سکتا ہے۔ پہلے یہ بتاؤ

کہ جو رپورٹ تھانے میں درج کروائی گئی ہے، کیا وہ سچ ہے؟“

”دیکھئے جناب آپ تو سی آئی ڈی والے ہیں۔ آپ سے کیا بات چھی ہے۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے تو وہ میرا کیا حشر کریں گے آپ کو معلوم ہی ہے۔“

”بابر میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ تم میرے ساتھ اعتماد سے بات کر سکتے ہو۔ میں تمہیں طرز یا طرزموں کا ساتھی نہیں بلکہ اپنا بھائی سمجھ کر بات کر رہا ہوں۔“ اکرم نے بڑے برادرانہ قسم کے لہجے میں اسے تسلی دی۔

”وہ مقدمہ غلط درج کروایا گیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اختر کو کسی نے اغوا نہیں کیا۔ اختر کا تعلق تنظیم کے خاص گروپ سے تھا وہ لوگ عیاشی میں ہزاروں روپے لٹا دیا کرتے تھے۔ آخر وہ پیسہ کہاں سے آتا تھا؟ میں نے ایک مرتبہ اختر سے پوچھا تو اس نے مجھے نشے کی ترنگ میں بتا دیا تھا کہ وہ یہ سب پیسہ غلط طریقے سے حاصل کرتے ہیں..... جناب والا! وہ لوگ مل کر ڈاکے مارا کرتے تھے۔ پٹرول پمپوں کو فلائنگ کوچوں کو لوٹا کرتے تھے اور ہر دفعہ بچ جاتے تھے۔ خدا ہی جانے پولیس ان سے ڈرتی کیوں تھی۔ میرا یہ خیال ہے کہ ضرور اختر کسی ایسی ہی مہم میں مارا گیا ہے۔ جاوید اور اختر آپس میں گہرے دوست تھے۔ عین ممکن ہے انہوں نے کہیں کوئی واردات کی ہو اور وہ پولیس مقابلے میں مارے گئے ہوں..... لیکن اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ ان کی لاشیں پھر کہاں گئیں۔ اخبارات میں بھی کوئی ایسی کہانی شائع نہیں ہوئی۔“

”ہوں ںں.....“ اکرم نے لمبا سانس لیتا..... ”تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ انہیں اغوا نہیں کیا گیا۔“

”دیکھئے جناب! اسلامی تنظیم کا جنرل سیکرٹری میرا کلاس فیلو ہے۔ ہم نے سکول اور

کالج میں اکٹھے ہی تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ میرا محلہ دار بھی ہے۔ ان لوگوں نے مقدمے میں اس کو نامزد کیا ہے۔ میں حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ وہ کبھی ایسی حرکت نہیں کر سکتے۔“

”لیکن وہ بھی مسلح ہیں اور ان کے بھی خفیہ ٹھکانے ہیں۔“ اکرم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”میں اس سے انکار نہیں کر سکتا لیکن میرا دل کبھی نہیں مانے گا کہ انہوں نے ایسی گندی حرکت کی ہو۔“

”تمہاری تنظیم کے تفتیشی مراکز کہاں کہاں ہیں؟“

اس سوال نے بابر کو پریشان کر دیا تھا جس کا اندازہ اکرم کو ہو گیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اسے بڑے پیار سے برادرانہ انداز میں سمجھانا شروع کر دیا تھا کہ اس کے ساتھ ملاقات کی خبر بھی کسی کو معلوم نہیں پڑے گی۔ اگر اس نے خود کسی کو بتا دیا تو الگ بات ہے۔

بہت سمجھانے بھانے پر بھی بابر نے صرف دو ٹھکانے بتائے تھے۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ ان دونوں ٹھکانوں کا علم بھی اسے اختر کے ذریعے ہی ہوا تھا۔ اس نے اکرم کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ لوگ مستقل تفتیشی مرکز قائم نہیں کرتے بلکہ انہیں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی ہوٹل کے کمرے میں مخالف پر تشدد کر لیا، کبھی کسی گھر میں، کبھی کسی اور ٹھکانے پر۔“

”اب تم میرے ساتھ شاہی بازار چلو اور دور ہی سے اس جگہ کی نشاندہی کر دینا جہاں تم اختر کے ساتھ آئے تھے۔ اس کے بعد تمہاری چھٹی..... کبھی بھول کر بھی اس ملاقات کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ میں کوشش کروں گا کہ پولیس تک تمہارا نام نہ پہنچ سکے۔ کبھی کسی نئی بات کا علم ہو تو مجھے ضرور خبر کرنا۔“ اس نے ایک فون نمبر بابر کو دیتے ہوئے کہا۔

بابر کو وہ اپنی موٹر سائیکل پر بازار تک لایا۔ موٹر سائیکل انہوں نے دور ہی کھڑی کر دی تھی اور اب پیدل اس کو ٹھے کی طرف جا رہے تھے۔ کوٹھے کی سیڑھیوں کی نشاندہی کروانے کے بعد اس نے ”ماں تان“ کرنے کے باوجود انسپکٹر اکرم اسے گھر کے نزدیک اتار کر گیا تھا۔ اس نے واپسی پر ایک ہوٹل میں بابر کی اچھی خاصی مدامت کر کے اس کے دل و دماغ میں جگہ بنائی تھی۔

بابر سے الگ ہو کر وہ دوبارہ شاہی بازار آیا اور یہاں اپنے ایک پرانے ”سورس“ سے

گھناؤ نے کھیل

اس نے متعلقہ کوٹھے کے متعلق معلومات حاصل کیں تو اس کے علم میں آیا کہ اس کوٹھے کی مالکہ مشہور طوائف مختاراں بائی ہے جس کی بیٹی نازنین آج کل بڑی اونچی ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔ آفس میں رات دیر گئے تک وہ رپورٹ بناتا رہا۔ صبح اس نے آفس میں آتے ہی چوہدری غلام رسول کے سامنے ساری کارروائی بیان کر دی۔ چوہدری صاحب کی تو باچھیں کھل گئیں۔ انہوں نے بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی پیٹھ پر تھپکی دی اور اسے آج رات مختاراں بائی کے کوٹھے کی نگرانی پر لگا دیا۔ انہیں امید تھی کہ اختر کے ساتھیوں میں سے اور بھی اس طرف آتے ہوں گے اور اس ابھی ہوئی ڈور کا کوئی نہ کوئی سرا ضرور ان کے ہاتھ لگے گا۔ چوہدری کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس نے آدھے سے زیادہ میدان تو مار لیا ہے۔ اب بس ایک آدھ کلنڈر مل جائے تو بیڑا پار۔



ارسلان کو آج پہلی مرتبہ ملک صاحب نے خود نازنین کو لانے کی فرمائش کی تھی اور اب وہ ملک صاحب کی خواہش کے احترام میں ہی اس کے کوٹھے کی طرف جا رہا تھا۔ ابھی شام نہیں ڈھلی تھی۔ جب وہ نازنین کے دروازے پر موجود تھا۔ ارسلان کی شکل پر نظر پڑتے ہی مختاراں بیگم کے لعنتی چہرے پر رونق سی آ گئی۔ وہ اس طرح بے قراری سے اس کی طرف بڑھی جیسے ارسلان بہت مدت بعد اچانک اس طرف آ نکلا ہو۔ ”کہاں رہے بیٹا اتنے دن.....“ نازنین تو تمہارے بغیر ادا اس ہو جاتی ہے۔ کل سے ضد کر رہی تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو تمہیں لے کر آؤں۔ اس روز کے بعد سے ایسے غائب ہوئے کہ کوئی خبر ہی نہیں۔“

”بی بی تمہارے لئے ہی کام کر رہا تھا۔ شکر کرو ملک صاحب قابو آ گئے۔ تمہیں کیا معلوم وہاں کیا کیا گل کھلائے جا رہے ہیں۔ وہ تمہاری رشتہ دار شریقاں بائی ملک صاحب کے گھر جانے کہاں سے پہنچ گئی تھی۔ وہ تو شکر کرو ملک صاحب کو میری اجازت کے بغیر کوئی مل نہیں سکتا ورنہ شریقاں نے تمہارا پتہ کٹوا دیا تھا۔ تمہیں تو علم ہے اس کی تینوں بیٹیوں کا۔ ایک تو آج کل پانچ چھ فلموں میں آ رہی ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر ہے..... میں نے بھی وہ سلوک کیا کہ کیا یاد کرے گی

سالی.....چوکیدار سے کہہ دیا کہ دھکے مار کر نکال دو اور آئندہ نظر آئے تو ٹانگیں توڑ دینا تاکہ کی۔“
اس نے مختاراں بائی پر پہلا حملہ ہی ایسا جان لیوا کیا کہ اسے ہاتھوں پیروں کی پڑ گئی۔
”ہائے ہائے یہ چھٹال کجنت وہاں بھی جامری..... اسے مولا اٹھائے۔ جانے کس
برے وقت کی پیدائش ہے کجنت۔ اے بیٹا! سارا بازار اس کے کروت جانتا ہے۔ لعنت ہو اس اللہ
ماری پر جانے یہ ”خانگی“ کہاں سے آن مری تھی ہمارے قبیلے میں۔“ مختاراں کے تو ہاتھوں کے
طوطے اڑ گئے تھے۔

”تم گھبراؤ نہیں بی بی۔ میں جو ہوں وہاں۔ اگر قدم بھی رکھنے دیا تو ارسلان نام نہیں
میرا۔ ایسی کئی دیکھی ہیں میں نے۔ بی بی تمہیں راز کی بات بتا دوں کہ اگلے الیکشن کے بعد ملک
صاحب کو صوبے کی سب سے اہم وزارت ملنے والی ہے۔ سودا ہو چکا ہے بی بی..... ملک صاحب
چاہیں تو اب بھی کوئی سی وزارت لے لیں، لیکن وہ تھوڑے عرصے کے لئے کچھ کرنا نہیں
چاہتے..... الیکشن کے بعد دیکھنا۔ تمہارے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔“

اس کی بات سن کر مختاراں بی بی کے منہ سے رال ٹپکنے لگی تھی۔ وہ ارسلان پر صدقے
واری ہو رہی تھی۔

”آج ذرا نازنین کو تیار کر دینا۔ ملک صاحب کے منہ سے میں نے خود فرمائش کروائی
ہے نازنین کی اور ہاں اسے سبھا دینا کہ سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ خدمت میں کوئی
کسر نہیں ڈینی چاہئے۔“

”باؤ ارسلان تو بے فکر ہو جا۔ ہماری طرف سے کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ بس تو
ہمارا خیال رکھنا ہم تو تیرے نوکر ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ نازنین کے کمرے میں داد عیش دے رہا تھا۔

مختاراں بائی نے آج اپنی گرہ سے سارا خرچ اٹھایا تھا اور اس کے لئے خاص طور سے
وہ سکی منگوائی تھی۔ رات گئے تک ماں بیٹی اس کی خاطر مدارت میں مصروف رہیں۔ مختاراں بائی
نے سر شام ہی ”استادوں“ سے کہہ دیا تھا کہ آج کوٹھا نہیں بچے گا۔ آج بچی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔
استاد بے چارے بچی کی جان کو روٹے صبر شکر کر کے واپس چلے گئے۔

مختاراں نے جاتے ہوئے تھوڑے تھوڑے پیسے ان کو خرچ کے لئے دے دیئے تھے۔

نازنین اب تیار ہو رہی تھی اور مختاراں کے ساتھ دوسرے کمرے میں ارسلان مجھو دھکا۔
اس نے شریفاں کا پتہ مختاراں کے سامنے پھینک کر لوہا گرم کر دیا تھا۔ اب اس پر ایک ہی چوٹ
لگانے کی ضرورت تھی۔

”میں سوچتا ہوں بی بی کہ آج شریفاں آئی ہے کل کوئی اور سالی نہ چلی آئے۔ ملک
صاحب تو عیش طبیعت کے مالک ہیں۔ آخر میں کب تک ان بلاؤں کو روکتا رہوں گا۔ اس بیماری
کا کوئی مستقل علاج ہو جائے تو کیا ہی بات ہے؟“

مختاراں اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی صوفے سے اٹھ کر اس کے قدموں میں آ
بیٹھی تھی۔ وہ تو خود اس غم میں غلطاں تھی کہ شریفاں اگر کبھی براہ راست ملک صاحب سے ٹکرائی تو
اس بازار میں بنی بنائی عزت خاک میں مل جائے گی۔

شریفاں کی دلزکریاں تو ابھی تک کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ وہ تو اور بھی بہت سے داؤ
جانتی ہوں گی۔

”بیٹا! مولا تجھے خوش رکھے جلدی سے بتا۔“ اس نے بے چینی سے کہا۔

”بی بی میرے پاس ایک بہت بڑی آفر ہے۔ اگر تم ذرا ہوشیاری سے کام لو تو ایک
رات میں پانچ لاکھ روپے کی مالک بن جاؤ گی۔“

پانچ لاکھ کا ذکر سنتے ہی مختاراں کے چہرے کا رنگ تبدیل ہونے لگا تھا۔ اس کے منہ
میں پانی بھرا آیا تھا اور وہ بار بار پو پلے منہ میں زبان پھیر رہی تھی۔

”میں حاضر ہوں بیٹا۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”پہلے غور سے سن لو۔ اگر میری بات کی سمجھ آ جائے تو ایڈوانس تمہیں کل پہنچ جائے گی۔
تم ان سیاسی لوگوں کو تو جانتی ہی ہو۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے یہ کیا کچھ کر گزرتے ہیں۔
ملک صاحب کی مخالف پارٹی کے ایک بڑے عہدیدار نے مجھے آفر کی ہے کہ اگر میں ملک صاحب
کی کچھ خاص قسم کی تصویریں بنوا دوں تو وہ ان تصویروں کا پانچ لاکھ روپیہ دینے کے لئے تیار ہے۔
مجھے کچھ زیادہ لالچ نہیں بس ایک لاکھ مجھے دے دینا باقی تمہارا۔ کسی کو کانوں کا خبر بھی نہیں ہوگی
اور یہ نہ سمجھنا کہ وہ کوئی معمولی آدمی ہے۔ مرکزی حکومت کا وزیر ہے۔ اب نام اس کا کیا لوں۔
ملک صاحب جیسے تو اس کے دروازے کے باہر ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ بی بی ذرا ہمت

کر لوساری زندگی کی روٹیاں ہیں۔ عیش کرو گی عیش۔ وارے نیارے ہو جائیں گے تمہارے۔“

○

اس نے مختاراں کی تمام دھتھی رگیں ایک ایک کر کے ایسی خوبصورتی سے دبائیں کہ وہ مچھلی کی طرح اس کے جال میں پھنسی چلی گئی۔ مختاراں کو اس نے ایسے ایسے پینترے دیئے کہ اس جیسی گھاگ کجھری کے لئے فرار کی کوئی راہ ہی باقی نہ بچی۔

اس نے مختاراں کو سمجھایا کہ ملک صاحب شراب کے نشے میں بالکل آؤٹ ہو جاتے ہیں۔ انہیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔ اس کیفیت کا کچھ اندازہ مختاراں کو بھی ملک صاحب کے ساتھ پہلی ہی ملاقات میں ہو گیا تھا۔ اس نے مختاراں سے کہا تھا نازنین نے صرف اتنا کام کرنا ہے کہ ملک صاحب کو معمول سے کچھ زیادہ شراب پلا دے جس کے بعد ایک ماہ فریو نوگر افراس چالاکی سے کام کرے گا کہ کسی کے فرشتے کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہو سکے گی۔ اس نے مختاراں بائی کو خاص طور سے کہا تھا کہ تصویروں میں نازنین اول تو نظر نہیں آئے گی۔ اگر کہیں نظر آ بھی گئی تو پوز ایسا ہوگا کہ جسے پہچانا مشکل ہو جائے گا۔

”اور بی بی تصویریں سب سے پہلے تمہارے پاس آئیں گی۔ اگر تمہیں کوئی شک ہو تو تم وہ تصویریں ضائع کر دینا جو پسند نہ ہوں..... جو تصویر تم چاہو گی وہی ہم اس شخص کو دیں گے..... اگر تم چاہو کہ تمہارا یا نازنین کا ملک صاحب کے مخالف لیڈر کو علم نہ ہو سکے تو ایسا ہی ہوگا۔ اگر تم ملنا چاہو تو تمہاری مرضی۔ ویسے میرا مشورہ ہے کہ ابھی ملاقات نہ کرو۔ پہلے رقم لے لیں۔ کوئی کونٹھی وغیرہ خرید لو۔ جب نئی حکومت بنے تو پھر ہم اس سے بھی کام نکھواتے رہیں گے۔“

مختاراں کی ساری چالاکی ہوشیاری دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ ارسلان کی چکنی چڑی باتوں کی دلدل میں پھنسی چلی جا رہی تھی..... ارسلان نے اپنا کیس ایسی چالاکی سے پیش کیا تھا کہ طوائف کے لئے کوئی سوال کرنے کی گنجائش ہی باقی نہیں چھوڑی۔

”ٹھیک ہے باؤ ارسلان لیکن پیسے کب ملیں گے؟“ اس کی رال بالا خرچک پڑی۔

”پہلے کچھ ایڈوانس مل جائے گا۔ اس کے بعد کا مکمل ہونے پر باقی رقم۔“ اس نے

مختاراں بائی کے نزدیک منہ لے جا کر سرگوشی کی۔

”دیکھ لینا بیٹا کہیں.....“

”تم فکر نہ کرو بی بی۔ جب تک میں موجود ہوں تمہارا کوئی بال بکا نہیں ہو سکتا۔“ اس نے طوائف کو مطمئن کرنے کے لئے اس کی بات درمیان ہی سے کاٹتے ہوئے کہا۔

”کام کب کرنا ہے؟“

”اگر تم چاہو تو آج ہی کر لیں..... لیکن میرے خیال سے آج مناسب نہیں کیونکہ ابھی نازنین کو ہم نے مکمل اعتماد میں نہیں لیا اور اب وقت بھی رواں گئی کا ہو گیا ہے۔ کچھ اور بندوبست بھی کرنا ہے..... لیکن تم مطمئن رہو میں چار پانچ روز بعد ہی ملک صاحب سے نازنین کی فرمائش کروادوں گا۔ بس اسے یہ سمجھا دینا کہ آج ذرا شکار کو اچھی طرح رام کرے تاکہ اگلی مرتبہ اس پر چھری چلانے میں دقت پیش نہ آئے۔“

ارسلان کی اس بات پر دونوں مسکرا دیئے۔ دونوں اب بے ساختہ قہقہے لگا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد نازنین اس کی گاڑی میں بنی ٹھنی ملک صاحب کی کونٹھی کی طرف جا رہی تھی۔

ارسلان کو اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ انسپٹر اکرم جس نے آج صبح ہی سے یہاں ڈیرے ڈال رکھے تھے اسے مختاراں بائی کے کونٹھے پر جاتے دیکھ چکا تھا اور پھر نازنین کے ساتھ کار میں بیٹھ کر جاتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ ہنگامی صورت حال کے لئے بازار کے باہر سڑک پر کھڑی کار تک وہ موٹر سائیکل اڑاتا ہوا پہنچا تھا۔ اپنی موٹر سائیکل اس نے وہیں بھینکی اور اب وہ کار میں اونگھتے ڈرائیور کو بیدار کر کے سفید رنگ کی کار کے تعاقب کا حکم دے رہا تھا جس میں ارسلان اور نازنین محو سفر تھے۔

سفید کار جلد ہی انہیں بازار سے اس سڑک کی طرف آتی دکھائی دی۔ ڈرائیور اپنے فن میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے اتنی مہارت سے تعاقب کیا کہ رنگ رلیوں میں مست کار چلا تے ارسلان اور نازنین کو احساس ہی نہ ہونے دیا۔

تعاقب کا خاتمہ ملک صاحب کی کونٹھی پر ہوا تو انسپٹر اکرم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ

گئی۔

”وہ مارا.....!“ اس کے منہ سے نکلا۔

ڈرائیور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو اکرم نے کھیانی سی ہنسی ہنس کر اپنا منہ

دوسری جانب پھیر لیا۔

”بس اب مجھے اپنی موٹر سائیکل لینی ہے اور تمہاری چھٹی۔“ اس نے ڈرائیور کو ہدایت کی۔

○

ارسلان کی خدمات نے ملک صاحب کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔۔۔۔۔ وہ عورتوں کے رسیا تھے اور زندگی بھر انہوں نے عورتوں کو کھلونا سمجھ کر ان سے دل بہلایا تھا، لیکن اس طوائف زادی نے ملک صاحب کو ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔ انہوں نے زندگی میں کبھی ایسی طرح دار عورت نہیں دیکھی تھی۔

نازنین کے ساتھ ساتھ انہوں نے ارسلان پر بھی انعام و اکرام کی بارش شروع کر دی تھی۔

صبح جب وہ نازنین کو سو راج نکلنے سے پہلے اس کے کوٹھے تک چھوڑ کر گیا تھا تو مختار اس ان کے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس نے زبردستی ارسلان کو وہاں ٹھہرا لیا اور دوپہر تک وہ یہیں تان کر سوتا رہا۔

دوپہر کو اس کی آنکھ کھلی تو مختار بابائی۔۔۔۔۔ نوکرانیوں کی طرح اس کے سر ہانے چائے لے کر کھڑی تھی۔ اس نے بوڑھی نانیکہ کو چاروں شانے چت کر دیا تھا اور وہ ارسلان کو پیروں کی طرح پوجنے لگی تھی۔

”بی بی! تمہاری قسمت کھلنے والی ہے۔ دونوں طرف سے راج کر دی۔ ملک صاحب تو تمہارے غلام ہوں گے ہی، مرکز والے بھی تمہارے قابو میں آ جائیں گے۔“ اس نے کوئی موقع ہاتھ سے نہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”اے بیٹا! مولا تجھے خوش رکھے۔ بس یہ رقم مل جائے تو میں بھی بازار پر لعنت بھیج کر بیٹی کو کسی شریف آبادی میں لے کر بیٹھ جاؤں۔ ہم نے زیادہ لالچ کیا کرنا ہے۔ وہاں ہفتے میں ایک آدھ گاہک بھی آ جایا کرے تو کافی ہوگا۔“

”بی بی اس کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔“

○

وہ مختاراں بابائی کو لالچ و ہوس کے نئے جہاں کی سیر کراتا جب واپس پہنچا تو نجمہ بیگم بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔

”اتنی دیر!“ اس نے شکایت کے لہجے میں کہا۔

”آپ کو خوشخبری سنانے جا رہا ہوں کہ آپ حیرت زدہ رہ جائیں گی۔“

اس نے نجمہ بیگم کے سامنے ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔ ”مختاراں بابائی تیار ہے۔ وہ تو آج رات ہی تیار ہو گئی تھی لیکن میں نے سوچا ہنگامی طور پر کہیں کام ہی نہ بگڑ جائے۔ یوں بھی گرم گرم دودھ سے منہ جلانا ٹھیک نہیں۔“

”ویل ڈن۔۔۔۔۔!“ نجمہ بیگم نے بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے دبا یا۔

”شاباش! جیسے ہی یہ کام مکمل ہوا میں بھی تمہیں ایسا سر پرانز دوں گی کہ خوش ہو جاؤ گے۔۔۔۔۔ اچھا چلو ابھی سہی جب تم نے مجھے اتنی بڑی خوشخبری دے دی ہے تو میں تمہیں کیوں نہ دوں۔۔۔۔۔! ارسلان اس کام کے مکمل ہوتے ہی تم یورپ کا سفر۔۔۔۔۔ کی دورہ کرو گے۔“

ارسلان کو اس نے واقعی بڑی زبردستی خوشخبری سنائی تھی۔ اس نے تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ دنیا کے اس طلسم ہوشربا کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ سکے گا۔

”تھینک یو۔“

”اور تمہارا پاسپورٹ بھی تیار ہو کر آ گیا ہے۔ وکیل صاحب صبح دفتر جاتے ہوئے دے گئے تھے۔“ اس نے نزدیکی میز پر رکھا اس کا پاسپورٹ ارسلان کو پکڑا دیا۔

اس پاسپورٹ کے اندراج کے مطابق وہ برنس مین تھا اور نجمہ بیگم نے اسے بتا دیا تھا کہ ایک انٹرنیشنل فرم جس کی ایک ڈائریکٹر وہ بھی ہے اور جس کے دفاتر نیویارک، لندن اور ایمرسٹرڈم میں قائم ہیں وہ اس فرم کی پاکستانی شاخ کا منیجر تھا۔

”میں خواہ مخواہ جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتی، لیکن مغربی سفارت خانے ہمارے سچ کو قبول نہیں کرتے۔ انہیں ایسا سچ پسند ہے جو جھوٹ کے خوبصورت لبادے میں ملفوف کر کے ان کے سامنے پیش کیا جائے۔ مثلاً اگر تم براہ راست امریکہ کی سیر کاویزہ طلب کرو تو وہ لوگ تمہیں کبھی ویزا نہیں دیں گے، حالانکہ تمہارے دماغ میں دور دور تک امریکہ میں غیر قانونی طور سے بس جانے

”اکرم تم نے جو کچھ بھی کیا، اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ اس کا پھل تمہیں اگلی دنیا میں نہیں اس دنیا میں ملے گا۔ میں چوہدری غلام رسول خدا کو حاضر ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہارے لئے اپنی جان لڑا دوں گا، لیکن ایک وعدہ تم نے بھی مجھ سے کرنا ہے.....!“ چوہدری غلام رسول نے کہا۔

”حکم جناب!“

”جو کچھ ہم فائلوں کا پیٹ بھرنے کے لئے لکھ دیں گے آن دی ریکارڈ وہی کچھ ہوگا۔ اس کے علاوہ جو بھی ”آف دی ریکارڈ“ ہے وہ تمہارے اور میرے درمیان ایک راز ہے۔ میں تمہیں آج بتا رہا ہوں کہ اس معاملے میں وفاق کے کچھ لوگ دلچسپی لے رہے ہیں اور یہ ان کی خواہش ہے۔“

انسپکٹر اکرم کے لئے یہ کافی چونکا دینے والی یا سنسنی خیز خبر نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سرکاری ایجنسیاں سرکار کی زیادہ اور ملک کی کم خادم ہیں۔ اگر کسی نے ایمانداری سے سر دس روٹ پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی کی تو اسے تیسرے درجے کا کارندہ بننا پڑا۔ یہاں ترقی اور منصب کے دروازے صرف ان پر کھلتے ہیں جو حالات کے نبض شناس ہوں اور جنہیں ”خدمت کے فن“ میں کمال حاصل ہو۔ اس نے دیکھا تھا کہ یہاں آج کے ڈائریکٹر نئی حکومت آنے پر مجرموں کی طرح تفتیش کاٹ رہے ہوتے ہیں اور بمشکل غیر ممالک میں جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

”جو حکم جناب.....!“ اس نے بڑی ہی اطاعت گزار لہجے میں کہا..... ”اگر جناب میری ”ابراڈ“ (غیر ملک) پوسٹنگ کے لئے سفارش کریں تو جناب میرے بچے بھی آپ کو دعائیں دیں گے۔“

”میں نے کہا ناں اکرم صاحب کہ میں اپنے وعدے کا پابند ہوں۔“

”مجھے بھی جناب حکم کا پابند ہی پائیں گے۔“

”ٹھیک ہے اب تم معمول کا کام کرو گے۔ اس کیس کو ختم ہی سمجھو۔ اگر مناسب ہوا تو میں خود ہی تمہیں اگلی ہدایت دوں گا۔“

”او کے سر!“ اس نے ایڑیاں بجا ئیں اور باہر آ گیا۔

کا کوئی منصوبہ نہ ہوگا اس کے برعکس اگر تم ان کی مرضی کی کچی جھوٹی دستاویزات ان کے سامنے پیش کر دو تو وہ بڑی خوشی سے تمہیں ویزہ دے دیں گے..... لیکن یہ مجبوری بھی ایک دوسرے ہی ہوتی ہے زیادہ دیر نہیں رہتی۔

اس لئے تمہاری موجودہ شناخت قائم کرنی پڑی..... ارسلان اپنے ملک میں ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا کے تمام ممالک کی سیاست کو سمجھنے کے لئے ان ”ماسٹرز“ کو دیکھنا ضروری ہے جن کی یہ ممالک کٹھ پتلیاں ہیں۔ انسان کو وسعت نظر عطا ہوتی ہے۔ دل و دماغ میں کشادگی آتی ہے اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہماری بین الاقوامی دنیا میں کیا حیثیت ہے۔ میں تمہیں لاکھ بتاتی اور پڑھاتی رہوں کہ مغربی دنیا ایسی ہے ویسی ہے، لیکن جب تک تم اپنی آنکھوں سے سب کچھ نہ دیکھ لو کچھ جان نہیں پاؤ گے۔ یوں بھی یاد رکھنا مشاہدے اور تجربے کے نعم البدل کچھ نہیں۔

پہلی مرتبہ میں جان بوجھ کر تمہیں اکیلے بھیج رہی ہوں، لیکن مطمئن رہنا تم وہاں خود کو اکیلا کبھی محسوس نہیں کرو گے۔ وہاں ہر جگہ تمہارے میزبان موجود ہیں۔ میں چاہتی ہوں تم میں خود اعتمادی آ جائے..... یوں بھی تم نو جوان ہو۔ ممکن ہے میری موجودگی میں کوئی شرم محسوس کرو۔ آئندہ سے ہم دونوں اکٹھے ہی سفر کیا کریں گے۔“ نجمہ بیگم نے اسے سب کچھ سمجھا دیا۔

اور.....!

اس نے نجمہ کی باتوں کو بچ جان لیا۔

اس نے آج ہی ارسلان کو دس پندرہ پاسپورٹ سائز تصاویر بنانے کی ہدایت کی تھی کیونکہ اس کے کچھ پیچرز اور شناختی کارڈز متعلقہ برنس سے متعلق تیار کرنے تھے۔ کچھ تصاویر یورپ میں اس کے میزبانوں تک پہنچانی تھیں۔ ارسلان تصاویر بنوانے چلا گیا۔

○

انسپکٹر اکرم نے جب کل رات کی کارگزاری پیش کی تو چوہدری غلام رسول کا جی چاہا کہ اٹھ کر اس کا منہ چوم لے۔ اس نے واقعی ایسا کارنامہ انجام دیا تھا کہ چوہدری صاحب نے جس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اب وہ کم از کم اس پوزیشن میں آ گئے تھے کہ اس ”وفاقی شخصیت“ کو جس نے ان سے خصوصی رابطہ قائم کیا تھا، ملاقات کر کے اپنی کارگزاری پیش کریں اور سرکار دربار سے انعام کے طلب گار ہوں۔

عزیزہ ہے۔ اس لئے موقع ملنے پر خود بھی داؤ لگا لیتا ہوں۔ پھر مفت کی مرغی کون چھوڑتا ہے جناب.....!“ اس نے چوہدری کو بظاہر اس انداز سے جواب دیا کہ اگر اس کے ذہن میں اس کے متعلق کوئی غلط خیال ہو تو وہ ختم ہو جائے۔

”اویار کس چکر میں پڑ گئے۔ بھئی ہم نے کب منع کیا ہے۔ کرو موبیں۔ بس ہمیں تو اپنے کام سے مطلب ہے۔ اچھا تمہارا کیا خیال ہے یہ عورت اختر کے اچانک غائب ہو جانے پر کچھ روشنی ڈال سکے گی؟“

اس مرتبہ اس سوال نے پھر ارسلان کو چونکا کر رکھ دیا۔ اس نے سوچا اگر یہ لوگ پہلے ہی نازنین کے کوٹھے پر پہنچ گئے تو وہ شاید خوفزدہ ہو کر ملک صاحب کی تصاویر بنوانے سے انکار نہ کر دے۔ اس کے علاوہ اسے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ مختار اس بانی کو بھی اختر کے متعلق اتنا ہی علم تھا جتنا ارسلان کو۔ وہ بھی انٹیلی جنس والوں کو یہی کچھ بتاتی جو ارسلان بتا رہا تھا۔

”میرے خیال میں اس کے علاوہ تو اسے بھی کسی بات کا علم نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے بزنس کے حوالے سے ہی شاید کچھ بتا سکے..... یا یہ بھی ممکن ہے کہ اختر نے اسے اعتماد میں لیا ہو۔ بہر حال میں اس سلسلے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔“ اس نے گول مول سا جواب دیا۔

”ٹھیک ہے میرا بھی یہی خیال ہے۔ بہر حال تم ذرا اس نازنین کو کریدنا۔ شاید کوئی کام کی بات نکل ہی آئے۔“

”میری طرف سے تو آپ مطمئن ہو جائیں۔ ہم تو جناب آپ کے خادم ہیں۔ یاروں کے یار ہیں۔ جب آپ سے کہہ دیا کہ میری آپ کی دوستی کچی تو پھر کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔“

”تم اسے ذرا اٹھالو۔ اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نکل آئے تو ٹھیک در نہ پھر ہم خود کچھ کریں گے۔“

”ٹھیک ہے لیکن اس بات کا آپ کو یقین دلا دوں کہ اگر وہ کچھ جانتی ہے تو مجھ سے چھپا نہیں سکتی۔ میں اب اسے کچھ کچھ جاننے لگا ہوں.....!“ ارسلان نے بے شرمی کی طرح ایک آنکھ دبائی۔

”ٹھیک ہے۔ اچھا ایک بات ہے۔ میرا خیال ہے تم بہتر مشورہ دے سکو گے۔ کیا ایسا تو

چوہدری غلام رسول نے آخری داؤ خود کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اب خود ارسلان سے ملنے جا رہا تھا۔ ابھی تک اکرم کو بھی اس نے علم نہیں ہونے دیا تھا کہ ارسلان سے اس کا براہ راست رابطہ ہے۔

دوسرے روز صبح ہی اس نے ارسلان کو فون کر کے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی اور اسے ملاقات کی جگہ بھی بتا دی تھی..... دوپہر تک دونوں وہیں پہنچ چکے تھے۔

چوہدری غلام رسول نے ساری زندگی پولیس سروس میں گزاری تھی، لیکن اس وقت وہ اپنا ”پولیس سائن“ انداز ایک طرف رکھ کر بڑی عاجزانہ گفتگو کر رہا تھا۔

”مختار اس بانی اور اس کی بیٹی کا ملک صاحب سے کیا تعلق ہے؟“ اس نے ادھر ادھر کی دوچار باتیں کرنے کے بعد براہ راست مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔

اچانک سوال نے ایک لمحے کے لئے تو ارسلان کو گڑبڑا کر ہی رکھ دیا، لیکن اب وہ بڑا کامیاب اداکار بن چکا تھا اور اپنے چہرے کے تاثرات چھپائے رکھنے پر تو اسے کمال حاصل ہو گیا تھا۔

”ایک طوائف کا کسی سیاسی تماش بین سے کیا تعلق ہو سکتا ہے.....؟“

اس نے چوہدری کے سوال کا جواب بھی سوالیہ انداز میں دیا تھا۔

”تم تو وہاں آتے جاتے رہتے ہو۔“

”ہاں! پہلے کسی اور کی ڈیوٹی تھی اب میری ہے۔ جب ملک صاحب حکم دیں اسے جا

کر لے آتا ہوں۔ ان کی داشتہ ہے اور کیا.....!“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”اختر کا جانا بھی یہاں رہتا ہے؟“ چوہدری نے یہ سوال اس کی طرف کنکھوں سے

دیکھتے ہوئے کیا تھا۔

”چوہدری صاحب اختر کوئی بہت اچھا لڑکا نہیں۔ میں بہت معذرت سے عرض کر رہا

ہوں کہ وہ دلال قسم کا آدمی ہے۔ اس کا کام ملک صاحب کے لئے نئی نئی عورتوں کی تلاش اور

انہیں ملک صاحب کی خواب گاہ تک پہنچانا ہی تھا۔ جب سے وہ غائب ہوا ہے یہ ڈیوٹی بادل خواستہ

مجھے دینی پڑتی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں میں بھی کوئی ایسا سادھو سنت نہیں ہوں نہ ہی وہ میری کوئی

ممکن نہیں کہ ملک نے انہیں مروا ڈالا ہو..... یا پھر وہ دونوں کہیں پولیس مقابلے میں مارے گئے ہوں کیونکہ ہمارے ایک سب آفس نے دو گنا لاشوں کی رپورٹ درج کروائی تھی۔“

چوہدری نے آخری بات بالکل لاشعوری طور پر اور محض بات برائے بات کے انداز میں کہی تھی لیکن اس نے ارسلان کے چہرے کا رنگ بدلنے دیکھ لیا تھا، پھر جلد ہی ارسلان نارمل ہو گیا۔

”کچھ بھی ممکن ہے جناب۔ کچھ بھی ممکن ہے۔ آپ اس آدمی کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ وہ دونوں اس کے انتہائی خاص آدمی تھے۔ مجھے تو ان کی موجودگی میں ملک صاحب نے کبھی زیادہ منہ لگانا پسند ہی نہیں کیا۔ یوں بھی ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ کسی نوجوان کو ملک کے نزدیک نہ پھٹکنے دیں۔ شاید اس طرح وہ اپنے لئے کوئی خطرہ محسوس کر رہے تھے؟ یہ بھی ممکن ہے انہیں کسی دشمن نے مروا کر غائب کر دیا ہو۔ بندے تو وہ وارداتیا قسم کے تھے۔ چوری ڈاکہ تو ان کے معمول تھے۔ ہمارا لڑائی جھگڑوں سے واسطہ رہتا ہے لیکن یہ مجرمانہ قسم کے کاموں سے میں تو کوسوں دور بھاگتا ہوں۔ جب اس کے بغیر ہی کام چل رہا ہے تو ضرورت کیا ہے کچھ کرنے کی؟“

چوہدری غلام رسول کا مقصد حل ہو گیا تھا.....!

اس نے وفاقی شخصیت کو پیش کرنے کے لئے مکمل کیس تیار کر لیا تھا۔

اب اس نے پچھلے دو تین ماہ میں نزدیکی پولیس اسٹیشنوں سے تمام لاوارث لاشوں کا ریکارڈ منگوانا تھا۔ اس کام میں اکرم سے زیادہ اس کی مدد کوں کر سکتا تھا۔ اکرم کے ذریعے اس نے آدمی جنگ جیتی تھی اور اب وہ آخری حملہ کرنے جا رہا تھا۔

یہاں سے رخصت ہو کر جب وہ دفتر پہنچا تو اکرم چھٹی لے کر جانے والا تھا، لیکن چوہدری صاحب نے اسے نئے احکامات سے آگاہ کر دیا۔ اس نے اپنے سیکشن کے تمام ملازمین کی ڈیوٹی اس کام پر لگا دی تھی۔ چوہدری صاحب نے اندازے سے گرد و نواح کے پندرہ بیس تھانے مارک کئے تھے۔ وہ چونکہ خود پولیس ڈیپارٹمنٹ سے آیا تھا۔ ایک ایڈوائس بھی اسے حاصل تھا کہ ان میں بہت سے تھانوں میں اس کے سابقہ ماتحت ہی انچارج لگے ہوئے تھے اور اپنے دیرینہ تعلقات کی بنا پر وہ ملن سے بہتر کام لے سکتا تھا۔

دو تین دن کی اس ایکسرسلز سے ہی چوہدری صاحب کو گوہر مقصود ہاتھ لگ گیا اور ایک

مضافاتی تھانے سے انہیں ڈاکے کی مکمل تفصیلات اور وہ گناہ ڈاکوؤں کی لاشوں کی رپورٹ مل گئی۔ مردہ لاشوں کی تصویریں اس نے ریکارڈ سے حاصل کر لی تھیں اور اب وہ ان کا موازنہ انخوا کنندگان کی تصویروں سے کر رہا تھا۔ یہ تصویریں بہت عرصے پہلے انٹیلی جنس نے حاصل کر لی تھیں۔

چوہدری غلام رسول کو اس انکشاف نے بوکھلا کر رکھ دیا کہ مرنے والوں کی شکلیں ہو بہو ان دونوں سے ملتی تھیں۔ اتنی عظیم کامیابی کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں۔ بدن پر لرزہ طاری تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے لائیخ کیس حل کئے تھے لیکن یہ کامیابی اس کی تقدیر کا رخ موڑنے کے لئے کافی تھی۔

اب وہ بے قراری سے وفاقی شخصیت کی غیر ملکی دورے سے واپسی کا منتظر تھا، جس کے سامنے اس نے اپنی کارکردگی بیان کرنی تھی۔ یہ وفاقی شخصیت ایک ہفتے کے غیر ملکی دورے پر گئی ہوئی تھی اور چوہدری غلام رسول اس کی واپسی کا منتظر تھا۔ وہ ایک ایک پل گن گن کر گزار رہا تھا۔

○

ملک نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ جب سے اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ اس مرتبہ صوبائی لیگ میں اس کے ”حاسد دھڑے“ نے اسے صوبائی کے بجائے صرف مرکزی اسمبلی کا ٹکٹ دلانے کی سازش شروع کر دی ہے تو اس کا ماتھا ٹھنکا..... اس نے اندازہ لگالیا کہ یہ لوگ اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ اگر اس مرتبہ بھی ملک صاحب منتخب ہو کر صوبائی اسمبلی میں آگئے اور یہاں صوبائی لیگ کی حکومت بن گئی تو نہ صرف وہ خود وزارت حاصل کر لیں گے بلکہ کم از کم دو اور اہم ترین پورٹ فولیو بھی اپنے گروپ کے لوگوں کو دلائیں گے۔ اس طرح صوبے کی سیاست پر عملاً ان کو مکناڈ حاصل ہو جائے گی اور وزیر اعلیٰ بھی ان کا محتاج ہو کر رہ جائے گا۔

اس صورت حال کا علاج ان کے حاسدوں کے پاس یہی تھا کہ پارٹی کی مرکزی کمان کو ایسا چکر دیا جائے کہ وہ ملک صاحب کو صوبائی حلقے سے ٹکٹ ہی جاری نہ کریں۔

مخالفین کے اس گروپ کے اجلاس کی مکمل رپورٹ ملک کو مل چکی تھی اور وہ اس سازش کو پھینکے کا موقع دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی اہمیت منوانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور آج کا اجلاس جو اس نے طلب کیا تھا وہ اسی سلسلے کی کڑی تھی۔

ارسلان اور اس کی تنظیم کے چار پانچ اہم ترین ممبرز اس وقت ملک صاحب کے ساتھ بڑی اہم میٹنگ کر رہے تھے۔

”کل سے جلوسوں کا آغاز کر دو اور یہ سلسلہ دونوں کی برآمدگی تک جاری رہنا چاہئے۔ آج اخبارات کو بیان جاری کر دو اور کل صبح نو بجے تمام لڑکوں کو مال روڈ پر جمع کر لو۔ یہ کھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ کمال ہے میں اگر اتنے روز سے چپ ہوں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم بزدل ہو گئے ہیں۔ مجھ سے اب دونوں کے لواحقین کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ آخر کب تک انہیں جھوٹی تسلیاں دیتے رہیں۔ اگر سارے ملک کی سیکورٹی ایجنسیاں اور اس صوبے کی پولیس دو بے گناہوں کا اتہ پتہ نہیں لگا سکتی تو پھر جائے جہنم میں۔۔۔۔۔ اب سٹوڈنٹس خود ہی اپنے ساتھیوں کا پتہ لگا لیں گے۔۔۔۔۔ ایک بات کان کھول کر سن لو۔ کل اپنی طاقت کا پورا پورا مظاہرہ کرنا۔۔۔۔۔ پولیس کو دیکھ کر دم دبا کر بھاگنا نہیں، مقابلہ کرنا ہے مقابلہ۔۔۔۔۔ ان کو اپنی طاقت کا احساس دلاؤ۔ یہ سارے طاقت کی زبان کے علاوہ اور کوئی زبان ہی نہیں سمجھتے اور ہاں میں تمہارے پیچھے۔۔۔۔۔ دیوار کی طرح کھڑا ہوں، لیکن میرا نام کسی کی زبان پر نہیں آنا چاہئے۔ الیکشن کسی بھی وقت اناؤنس ہو سکتا ہے اور پارٹی اس وقت کسی ایجنڈیشن کی متحمل نہیں ہو سکتی، لیکن کیا کریں کل کو اگر ہماری حکومت نہ رہی تو ہم کہاں فریاد کریں گے۔۔۔۔۔ جس حکومت کے دور میں یہ ظلم ہوا ہے۔ انصاف بھی وہی حکومت کرے گی۔۔۔۔۔ شاباش تم اپنے اپنے مشن پر نکل جاؤ۔ لڑکوں کو راتوں رات ہوشیار کر دو۔ گرفتاری وغیرہ سے ہرگز نہ گھبرانا۔ راتوں رات تمہارے پلے کارڈز تیار ہو جانے چاہئیں۔“

اس نے لڑکوں کو ہدایات جاری کر کے رخصت کر دیا۔ ارسلان کو اس نے اپنے پاس ہی روک لیا تھا اور اب وہ اس سے مخاطب تھا۔

○

”یار بڑی ذہنی تھکاوٹ ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ کوئی بندوبست کرو بھی۔ اب اس بوڑھے کا خیال بھی تم نے ہی رکھنا ہے۔ وہ تمہاری بیگم صاحبہ کو تو اپنے سیاسی چکروں سے نجات ہی نہیں ملتی۔۔۔۔۔!“ ملک نے بڑی بے شرمی سے تہقہہ لگایا۔

جواب میں ارسلان نے بھی اس کا پورا پورا ساتھ دیا اور اب وہ یہاں سے سیدھا ”بیگم صاحبہ“ کے پاس جا رہا تھا۔

وہ آج ہی اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ انٹیلی جنس مقارن بائی کے کوٹھے تک پہنچے۔ وہ اس کھیل کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔

نجمہ بیگم نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اپنے سیف کا تالا کھولا اور 50 ہزار روپیہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

”کیا خیال ہے اس سے مطمئن ہو جائے گی وہ؟“ اس نے ارسلان کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ معاملہ آپ مجھ پر چھوڑیں۔“

اس نے نوٹ اپنے کوٹ کی جیب میں محفوظ کر لئے۔

”فونوگرافری کے لئے کیا بندوبست کیا آپ نے؟“ اس نے نجمہ کی طرف دیکھا۔

”میں خود کروں گی۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”مطلب یہ کہ میں خود تصویریں اتاروں گی اور اتنی صفائی سے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ تمہیں شاید اس بات کا علم نہیں کہ کالج لائف میں فونوگرافری کا مقابلہ جیت چکی ہوں۔۔۔۔۔ اور پھر اس کھیل میں ہم کسی تیسرے فریق کو داخل ہی کیوں کریں۔۔۔۔۔ کیا ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ ساری تصویریں ہمیں لوٹا دے گا۔“

کمال کی ہوشیار عورت تھی وہ۔۔۔۔۔ ارسلان اسے دل ہی دل میں نجانے کتنی مرتبہ داد دے چکا تھا۔

”میں فریج میں شراب کے تیز نشے والی بوتل رکھ دوں گی۔ تم خود وہ بوتل نکال کر نازنین کو دینا۔ بے فکر رہو۔ وہ زہر نہیں ہوگا۔“ اس نے منصوبے کا اگلا حصہ بیان کیا۔

”یہ شخص معمولی زہر سے مرنے والے بھی نہیں نجمہ صاحبہ۔“ ارسلان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”شاباش۔۔۔۔۔! تم اپنے مشن پر چلے جاؤ۔ میں بعد میں اپنا کام شروع کرتی ہوں۔ میں ان طوائف کے سامنے نہیں آؤں گی۔ اسے علم ہی نہیں ہوگا کہ تصویریں کس نے اتاری ہیں۔ تم بھی اس معاملے میں خاموشی اختیار کرنا۔“

”ٹھیک ہے جیسا آپ فرمائیں.....!“ اس نے نجمہ بیگم سے کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کا رخ اب اپنے کمرے کی طرف تھا۔

اپنی مختلف جیبوں میں ٹھونے نوٹوں میں سے آدھے اس نے اپنی الماری میں رکھے۔ اسے تالا لگایا اور گاڑی میں بیٹھ کر مختاراں بائی کے کوٹھے کی طرف روانہ ہو گیا۔

مختاراں کی رال اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی ٹپکنے لگی۔ ارسلان اس کا ہاتھ پکڑ کر فوراً دوسرے کمرے میں لے گیا..... اس کے ساتھ ہی اس نے پچیس ہزار روپے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔

نانیکہ نے اتنے روپے اکٹھے کب دیکھے تھے۔ ندیدے بچوں کی طرح لپک کر اس نے روپے اٹھائے اور اپنی جھول میں رکھ لئے۔

”کتنے ہیں بیٹا.....؟“

”پچیس ہزار!“

”اتنے کم.....؟“

”ایڈوانس ہے بی بی اور ایک بات غور سے سن لینا۔ اب ہم نے ایڈوانس پکڑ لیا ہے۔ اب بھاگنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ ان لوگوں کی دوستی کے جتنے فائدے ہیں دشمنی کے اتنے نقصانات۔ بی بی! یہ تو سونے کی مرغیاں ہیں۔ ایک ایک کر کے ان کے انڈے کھا لو گی تو مزے میں رہیں گے۔ ایک ہی مرتبہ چھری پھیر کر اپنا ہی نقصان کریں گے۔ میں نے جان بوجھ کر زیادہ ایڈوانس نہیں مانگا۔ کام ایسے کریں جیسے ہم احسان کر رہے ہیں ان پر تب ہی بات بنے گی..... جتنے پیسے میں نے تمہارے لئے ایڈوانس حاصل کئے ہیں ان سے آدھے پیسوں میں شریقاں کی بیٹیاں سارا کام کرنے کو تیار ہو جائیں۔ بس چپ چاپ میری بات مانتی رہو تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔“ اس نے مختاراں بائی کی عقل پر پردہ ڈال دیا۔

”ٹھیک ہے بیٹا۔ جیسی تمہاری مرضی۔“ شاید مختاراں سمجھ گئی تھی کہ اب کوئی راستہ نہیں

بچا۔

اس نے نازنین کو سارے داؤ بیچ سکھا کر ارسلان کے ساتھ روانہ کیا تھا۔ ارسلان جان بوجھ کر رات دیر گئے یہاں سے روانہ ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا اس درمیان ملک صاحب کی آتش شوق

اتنی بھڑک جائے کہ پھر وہ ہوس کے ہاتھوں بالکل اندھے ہو کر رہ جائیں
”اور ایسا ہی ہوا.....!“

جب وہ نازنین کے ساتھ کوٹھی پہنچا تو ملک صاحب بے چینی سے ان کے منتظر تھے۔ مسلسل انتظار نے انہیں الجھن اور غصے میں مبتلا کر دیا تھا، لیکن نازنین کے سراپے پر نظر پڑتے ہی ان کا غصہ ہوا ہو گیا تھا۔

”ذرا تیری میں دیر ہو گئی تھی سرکار اور یوں بھی اندھیرے کا انتظار ضروری تھا۔ آپ عزت دار لوگ ہیں۔ اجالے میں کسی نے مجھ دیکھ لیا ہوتا تو.....“ اس نے ملک صاحب کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر انہیں خواب گاہ کی طرف دھکیلا۔

ارسلان نے فریج سے بوتل نکال کر رکھ دی تھی اور نازنین اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”ملک صاحب میں ذرا ہوٹل تک جا رہا ہوں صبح کا بندوبست کرنے۔“ اس نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... لڑکے اپنا کام کر لیں گے۔ تم آرام کرو۔ صبح جلدی نازنین کو چھوڑ آنا۔“ انہوں نے ارسلان سے کہا۔

”ٹھیک ہے سر.....!“ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

”باہر نکلتے وقت اس کی چھٹی حس نے کمرے کے بھاری بھر کم ریشمی پردے کے پیچھے اسے سرسراہٹ کا احساس دلادیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ملک صاحب کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے نجمہ بیگم نے یہاں مورچہ سنبھال لیا ہوگا۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر وہ صوفے پر گر پڑا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے یہ انتہائی خطرناک قدم اٹھا کر اپنی زندگی سے جو اٹھایا تھا۔ اگر ملک صاحب کو ذرا سا بھی ہوش ہوا اور انہیں احساس ہو گیا کہ کوئی سازش کی گئی ہے تو وہ مختاراں اور نازنین کو ارسلان سمیت اس طرح غائب کرواتا کہ بعد میں ان کا نام و نشان نہ ملتا.....!

اس کا دل خزاں کے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ دل ہی دل میں نجائے کتنی مرتبہ اس مرحلے

”کیا مطلب تمہاری عقل گھاس چرنے تو نہیں گئی..... کہیں تم نے بھی ملک صاحب کے ساتھ چڑھا تو نہیں لی؟“

ارسلان نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

جواب میں نازنین قسمیں کھانے لگی کہ اس نے ایک عورت کو پردے کے پیچھے سے تصویریں اتارتے دیکھا ہے۔ بشکل ارسلان اسے یقین دلانے میں کامیاب ہوا کہ وہ عورت نہیں مرد تھا۔ بال اس کے چونکہ بڑے بڑے تھے اس لئے شاید اس نے لڑکی سمجھ لیا ہو۔

”تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں۔ ویسے وہ تھی کوئی عورت۔“ نازنین نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

”اچھا ابھی جو تم کہہ رہی ہو وہی سچ ہوگا۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟“ ارسلان نے زچ آنے کے انداز میں کہا۔

”آپ تو ناراض ہو گئے.....!“ نازنین نے بے ہودہ سی حرکت کرتے ہوئے کہا۔
نازنین کو وہ اس کے کونٹھے کی سیرھیوں تک چھوڑ کر واپس آ گیا۔ بازار کی رونقیں ماند پڑ چکی تھیں۔ دکاندار اپنی دکانیں بڑھا رہے تھے اور کسی دم ایک منحوس صبح یہاں اترنے والی تھی۔ بازار میں کہیں کہیں گشت کرتے مقامی تھانے کے اکا دکا سپاہی تھے یا پھر کھانے کی دکانوں کے باہر تماشا بینوں کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں پر منہ مارتے خارش زدہ کتے..... اور کچھ بلیاں.....! واپس آ کر وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر ہی بے سدھ ہو کر گر پڑا۔

○

ایسے ملک صاحب نے بازو جھنجھوڑ کر بیدار کیا تھا.....!

”سوری سر.....!“ اس نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

صبح کے آٹھ بجے رہے تھے۔

”کوئی بات نہیں یار۔ آج تو میری آنکھ بھی نہیں کھل رہی تھی۔ جانے اس سابی نے کیا

پلا دیا۔ ابھی تک دماغ گھوم رہا ہے۔ شاید میں کچھ زیادہ ہی پی گیا تھا۔“ ملک صاحب بولے۔

”سر! چیز ہی ایسی تھی۔“ اس نے بے شرموں کی طرح دانت نکالتے ہوئے کہا۔

جواب میں ملک نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

کے بغیر و خونی گزر جانے کی دعا مانگ رہا تھا۔ نجمہ لاکھ چالاک ہوشیار سہی! لیکن یہ بھی تو ممکن ہے اس سے کوئی غلطی ہو جائے۔

اس اذیت ناک صورت حال سے بچنے کے لئے وی سی آر پر ایک بیہودہ فلم چلا دی تھی! لیکن اس فلم میں اس کا دل بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ دو گھنٹے تک اس نے اس کیفیت کا عذاب بھگتا۔ جب اچانک ہی اس نے بلی کی طرح دبے قدموں نجمہ بیگم کو اس طرف آتے دیکھا۔ کیرہ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور اس کا چہرہ احساس فتح سے تھمرا ہوا تھا۔ ارسلان کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنی دو انگلیوں سے فتح کا نشان بنایا اور فتح کے نشے سے لڑکھاتی اس کے نزدیک پہنچ گئی۔ اس نے ارسلان کا ہاتھ مضبوطی سے دبا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو ارسلان سہم کر رہ گیا۔

”تھینک یو ارسلان.....!“ اس کی آواز آج ارسلان کو معمول سے بالکل مختلف سنائی دے رہی تھی۔ ایک غماز اس پر طاری تھا۔

ارسلان نے اس کے ہاتھ میں دنیا کا جدید ترین کیرہ دیکھ لیا تھا۔ ایسا کیرہ جوش لائٹ کے بغیر بھی اندھیرے میں تصویریں اتار سکتا تھا جب کہ اندر تو اچھی خاصی روشنی تھی۔
”صبح ملاقات ہوگی.....!“

کہہ کر اس نے ارسلان کا ہاتھ چھوڑ دیا اور فتح کے نشے کی اسی کیفیت سے سرشار سیرھیوں کی طرف چل دی۔ سیرھیوں کے خاتمے پر اپنے کمرے کے دروازے پر رک کر اس نے ایک مرتبہ پھر ارسلان کی طرف گہری نظروں سے دیکھا اور ایک عجیب سا اشارہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ارسلان کو اپنے خون میں انگارے دیکھتے محسوس ہونے لگے تھے۔ اس کے سر سے منوں بوجھ اتر گیا۔ وہ خود کو ہلکا محسوس کر رہا تھا۔

رات ڈھل رہی تھی جب نازنین دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس نے صوفے پر اوٹ گھٹتے ہوئے ارسلان کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا اور اپنے ساتھ باہر آنے کا اشارہ کیا۔ ارسلان نے اٹھ کر زوردار انگڑائی لی اور اس کے ساتھ کار کی چابی سنبھالتا باہر آ گیا۔

”کون تھی وہ؟ میں نے اسے دیکھا تھا۔ کوئی عورت تھی؟“ اس نے ارسلان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہی کہا۔

تیار ہو کر انہوں نے ناشتہ اکیٹھے ہی کیا۔ اس کے بعد ارسلان طلباء کا جلوس منظم کرنے کی مہم پر نکل گیا۔ ملک صاحب نے اسے سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ سامنے نہ آئے اور پیچھے ہی رہے۔ وہ اتنے کام کے نوجوان کو ایک لمحے کے لئے بھی خود سے الگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ملک نے اپنے کمرے میں ٹیلی فون سنبھال لیا تھا۔ وہ اخبارات میں اپنے زر خرید صحافیوں کو اس جلوس کی شاندار کوریج کی ہدایات جاری کر رہا تھا اور جواب میں ”جی سر! میں سر! مطمئن رہے سر!.....! ملک صاحب خادم ہیں آپ کے۔“ جیسے جوابات سن رہا تھا۔

یہ جلوس اتنا اچانک اور بھرپور تھا کہ انتظامیہ چکرا کر رہ گئی۔ نوجوانوں نے پلک جھپکتے شہر کی معروف ترین شاہراہ پر چار سرکاری بسیں روک کر انہیں نذر آتش کر دیا۔ طلباء اتنے پھرے ہوئے تھے کہ جب ہنگامی پولیس کے دستے انہیں منتشر کرنے کے لئے پہنچے تو وہ پولیس سے ٹکرا گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے مال روڈ میدان جنگ کا منظر پیش کرنے لگی۔

○

ایک طرف تو نوجوان طلباء پولیس پر پتھراؤ کر رہے تھے اور دوسری طرف سے پولیس بھی نوجوان طلباء پر پتھر پھینک رہی تھی۔ آنسو گیس کے گولوں نے فضا مکدر کر دی تھی اور نزدیک دور کی آبادیوں میں سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔

دو تین گھنٹے پولیس اور طلباء کا جم کر مقابلہ ہوا۔

اس دوران مختلف اخبارات کے صحافی اپنے پیشہ ورانہ فرائض جان ہتھیلی پر رکھ کر ادا کرتے رہے۔ دو تین فوٹو گرافروں کو بھی پولیس نے بری طرح پیٹ ڈالا اور ان کے کیمرے چھین کر فلمیں ضائع کر دیں۔ اس کے باوجود کچھ فوٹو گرافرز تصویریں بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

نیا آئی جی جو صوبائی سربراہ کا رشتہ دار بھی تھا اس صورت حال سے بوکھلا کر رہ گیا۔ وہ اب تک نجائے کتنی مرتبہ انٹیلی جنس ایجنسیوں کو کوس چکا تھا جن کے ملازمین کی فوج ظفر موج شہر میں دندناتی پھرتی ہے اور جنہیں طلباء کے اس جلوس کی پیشگی خبر ہی نہ ہو سکی۔

بڑی مشکل سے طلباء کو منتشر کیا گیا۔ سرکاری املاک کی تباہی زخمی طلباء اور پولیس والے تشدد کا شکار صحافی اور رپورٹرز متاثرین راہ گیر اور ان کی گاڑیاں.....!!

وہاں کوئی ایک مسئلہ تو نہیں تھا۔ مقامی انتظامیہ کو صورت حال کی سنگینی کا مکمل احساس تھا اور وہ جانتے تھے کہ کل کے اخبارات میں پولیس کی بہیمانہ کارروائی کی خبریں چھپیں گی تو عوام میں اس کا رد عمل کتنا شدید ہوگا۔

صوبائی سیاسی لیگ کے سیاستدان اپنی جگہ پریشان تھے کہ مرکزی پارٹی ”ایٹو“ کو بنیاد بنا کر ان کے خلاف عوامی طوفان کھڑا کر دے گی اور ان کی ساکھ کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔

اس وقت صوبائی وزیر اعلیٰ کے ہاں ہنگامی اجلاس ہو رہا تھا جس میں کابینہ اور انتظامیہ کے اعلیٰ اراکین کے علاوہ پارٹی کے سینئر عہدے دار بھی موجود تھے لیکن ملک صاحب حاضر نہیں تھے.....!

جب سیکرٹری جنرل نے انہیں ہنگامی میٹنگ کی اطلاع دی تو انہوں نے خرابی صحت کا بہانہ بنا کر معذرت کر لی۔

ہر کوئی اپنا نقطہ نظر بیان کر رہا تھا لیکن نوجوان اور جہاندیدہ صوبائی سربراہ کچھ اور سوچ رہا تھا..... وہ جانتا تھا انقلابی طلباء تنظیم کی طنائیں کس کے ہاتھ میں ہیں اور کس کے اشارے پر یہ لوگ اتنے پھرے ہوئے ہیں۔

وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنی سیکرٹری کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

”ملک صاحب کے گھر جانا ہے۔ ابھی اسی وقت.....!“ انہوں نے سیکرٹری سے کہا۔

”اوکے سر۔“ سیکرٹری نے حفاظتی گارڈ کو مطلع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد ملک صاحب کے گھر ان کی مزاج پری کر رہے تھے۔

”کیا بات ہے ملک صاحب نصیب دشمنان طبیعت کچھ خراب ہو گئی کیا؟“ وزیر اعلیٰ نے بڑی ذومستی سی بات کہہ دی تھی۔

”ہم تو کمزور بندے ہیں جناب۔ ذرا سا موسم بگڑا اور طبیعت خراب ہو گئی۔ ظاہر ہے

جناب سردی گرمی کا اثر تو ہوتا ہی ہے۔“ ملک نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

”ملک صاحب یہ لڑکوں کا کیا مسئلہ ہے؟ آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے۔“ انہوں نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔

”جناب! میری کیا حیثیت ہے۔ آپ کے منہ چڑھے لوگ جو میرے خلاف میٹنگیں بلاتے پھرتے ہیں وہی جانتے ہوں گے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“ واقعی یہ خبر وزیر اعلیٰ کے لئے نئی تھی۔

”جناب والا! ہم تو سیاسی بندے ہیں۔ اپنی آنکھیں اور کان کھلے نہ رکھیں تو ہمیں کوئی جینے نہیں دے گا۔ آپ کو یہ لوگ اپنا دوسرا چہرہ دکھاتے ہیں ان کا اصلی چہرہ میں نے دیکھا ہے۔ جناب والا! اگر جھنڈر جیسے لوگ ہمارے لئے ٹکٹوں کا فیصلہ کریں گے تو پھر ہم نے تو ساری زندگی جھک ہی ماری..... ہم تو سیاستدان نہ ہوئے۔ ہماری حیثیت تو پھر منشیوں والی ہوگئی ناں۔“ ملک جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔

مدیر، نوجوان اور حالات پر نظر رکھنے والے وزیر اعلیٰ کو ساری بات سمجھ آ گئی تھی۔

”ملک صاحب میرے ہوتے ہوئے آپ کی طرف کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہوگا..... کس کی مجال ہے جو ہمارے ہوتے ہوئے آپ کے خلاف سازش کرے گا۔“

”ٹھیک ہے جناب جیسا آپ کا حکم۔ یہ لڑکے سر پھرے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ہمیں بھی ڈرانے دھمکانے لگتے ہیں۔ غلطی میری ہی تھی ذرا ہاتھ تنگ ہے آج کل۔ خرچ چانی تھوڑا کم دے رہا ہوں، خیر کچھ کرتے ہیں۔“ ملک نے ایک اور پتہ پھینک دیا۔

”اس کی آپ پروا نہ کریں۔ ہمیں صوبے میں امن وامان چاہئے۔ خواہ اس کی کچھ ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔“

ملک صاحب کو وزیر اعلیٰ صاحب اپنے ساتھ میٹنگ میں واپس لے آئے تھے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہاں انتظامی طلباء تنظیم کے لیڈر جمع ہو چکے تھے۔

انتظامیہ سے میٹنگ کے بعد انہوں نے اپنی تحریک ختم کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں انتظامیہ نے تمام گرفتار شدہ طلباء کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔ تنظیم کے جنرل سیکرٹری ارسلان کی طرف سے اخبارات کو جو بیان جاری کیا گیا اس میں کہا گیا تھا کہ انہوں نے پراسن جلوس نکالا اور جس کا مقصد صرف اپنے ساتھیوں کی بازیابی کا مطالبہ کرنا تھا۔ مخالف تنظیم کے کارکن بھیس بدل کر اس جلوس میں شامل ہو گئے جنہوں نے ساری توڑ پھوڑ کی اور پولیس پر حملے بھی

کئے۔

جنرل سیکرٹری صاحب نے اس صورت حال کی زبردست مذمت کرتے ہوئے طلباء سے اپیل کی تھی کہ وہ اپنی صفوں میں گھس آنے والی بھیڑوں کو نکال باہر پھینکیں۔ انہوں نے صوبے کی انتظامیہ کا شکریہ ادا کیا اور زور دے کر کہا کہ طلباء کی ہمدردیاں صوبائی سیاسی لیگ کے ساتھ ہیں اور آئندہ الیکشن میں وہ صوبائی سیاسی لیگ کی الیکشن مہم چلائیں گے۔

○

چوہدری غلام رسول اس وقت ”مرکزی شخصیت“ کے سامنے موجود تھا۔ ان کی ملاقات اسی ریٹ ہاؤس میں ہوئی تھی۔ اس نے ایک ایک کر کے تمام واقعات کی تفصیلات ثبوت کے ساتھ سامنے رکھ دیں۔

”ویل ڈن..... چوہدری صاحب کمال کر دیا آپ نے۔ دل خوش کر دیا۔ اب آپ دیکھیں ہم آپ سے کیسے دوستی نبھاتے ہیں۔“ مرکزی شخصیت کے وزیر نے تصادیر اور قائل اپنے بریف کیس میں رکھتے ہوئے کہا۔

”جناب آپ دیکھیں گے کہ میں دو چار روز کے اندر قاتلوں کو گرفتار کر کے قانون کے سامنے پیش کر دوں گا۔“ چوہدری صاحب نے ترنگ میں آ کر کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں.....!“ مرکزی وزیر کا لہجہ بڑا سرد اور بدلا بدلا تھا۔

”میں سمجھا نہیں جناب۔ دو قتل ہوئے ہیں اور ملکی امن وامان کی حالت خطرے میں ہے..... آپ فرما رہے ہیں کہ ہم قاتلوں کو گرفتار نہ کریں۔“ چوہدری نہ جانے یہ سب کچھ کیسے کہہ گیا۔

”چوہدری صاحب! آپ صرف اتنا کیجئے جتنا آپ سے کہا گیا۔ اسی طرح ہماری دوستی قائم رہ سکتی ہے۔ اس کیس کی فائل بند ہو جانی چاہئے۔ آپ نے جتنا فالتوں کا پیٹ بھر دیا کافی ہے..... اگر آپ نے زیادہ ہی وفاداری دکھائی تو پھر مجھے افسوس سے کہنا پڑے گا کہ آپ اکیلے رہ جائیں گے۔“

چوہدری غلام رسول کو زندگی میں پہلی مرتبہ کسی وزیر پر غصہ آیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ اس کا منہ نونچ لے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

صرف سوچ سکتا تھا۔

غصے سے پاؤں پٹختا وہ چپ چاپ وزیر صاحب کو سلام کر کے باہر آ گیا۔ وزیر نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ بھی خطرے کی بومیلوں سے سونگھنے والا سیاسی گرگ جہانگیر تھا۔ اگلی صبح جب چوہدری غلام رسول اپنے آفس پہنچا تو اس کو ایک سرکاری حکم نامہ تھا دیا گیا۔

چوہدری صاحب کی تبدیلی یہاں سے پانچ سو میل دور اسی عہدے پر ایک اور ضلع کی پولیس لائن میں کردی گئی تھی.....! وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سرکاری حکم نامہ گھورتے رہے۔ پھر بے دم ہو کر کرسی پر ڈھیر ہو گئے۔



آج جب اچانک اس نے کانٹا کو فون کیا تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ فون پر تو وہ یہی محسوس کر رہا تھا۔ حقیقت کیا تھی اس کا علم اسے نہیں تھا۔
”کہاں غائب ہو گئے تھے آپ؟ فون اٹھایا ہی نہیں۔“ اس نے چھٹنے ہی پوچھا۔
”بس میں نے یہی اطلاع دینے کے لئے فون کیا ہے میں نے فلیٹ بدل لیا۔“ اس نے نیا نمبر لکھاتے ہوئے کہا۔ شمشا جی کیسی ہیں؟“
”ایک دم شاندار..... وہ بھی آپ کے اچانک غائب ہونے پر پریشان ہیں۔“ اس نے فون شمشا کو پکڑا دیا۔

شمشا نے روایتی انداز سے اس کے نہ ملنے کا گلہ کیا اور ارسلان نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے ڈالی۔ ”ذرا علیحدگی میں باتیں کر لیں گے ویسے تو موقع نہیں ملا۔ پھر آپ بھی تو دو تین روز بعد واپس چلی جائیں گی۔“ اس نے کہا۔
”اوہ ضرور! کیوں نہیں۔ کب آرہے ہیں آپ؟“ شمشا جیسے اس کی دعوت ہی کی منتظر

تھی۔

”آج بلکہ ابھی.....! بس ایک گھنٹہ میں پہنچتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

دوستی کے نام پر

”ویل ڈن.....!“ اس کے فون رکھتے ہی رضوی بولا۔

اس نے فون رضوی کی موجودگی ہی میں کیا تھا۔ یہ شخص اسے کچھ الگ سا لگا تھا۔ آدمیوں کی اس بھڑ میں کسی محبت وطن کی موجودگی کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

”اب یہ بھی بتادیں کہ مجھے کرنا کیا ہوگا؟“ اس نے رضوی سے دریافت کیا۔

”ارسلان صاحب! یہ کافی ہوشیار لڑکی ہے اور لندن میں بھارتی سفارت خانے میں موجود ”را“ کے نیٹ سے وابستہ ہے۔ کسی بھی طرح اس سے دوستی کر لو..... اگر ذرا ”پکی دوستی“ ہو جائے تو ویل اینڈ گڈ.....!“ اس نے آنکھ دباتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

”رضوی صاحب! اگر اس دوستی سے ملکی خدمت میں میرا بھی کچھ حصہ پڑ سکتا ہے تو میں حاضر ہوں۔ آپ مطمئن رہئے۔ آج اسے اس فلیٹ پر ضرور لے آؤں گا۔“

”شکریہ دوست! یہاں اپنے خانا ماں کے روپ میں تم مجھے موجود پاؤ گے۔“ رضوی نے کہا۔

”یہ کچھ مناسب نہیں لگتا.....!“ ارسلان شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

”ارے بھائی۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ہمیں تو بسا اوقات آدمی سے لگدھاننا پڑتا ہے۔ پروا نہ کرو..... بس ذرا نارمل رکھنا خود کو۔ خصوصاً مجھ سے بات کرتے ہوئے مجھے اپنا خانا ماں ہی سمجھ کر مخاطب کرنا۔ لڑکی ہوشیار ہے۔ ذرا چوک گئے تو سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔“

”بے فکر رہئے۔ مجھے خانا ماموں سے نمٹنے کا تجربہ حاصل ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کار پر کانتا کے گھر جا رہا تھا۔

آج مقامی چھٹی تھی اور کانتا گھر پر ہی اس کی منتظر تھی۔ دونوں نے اس کا جی جان سے استقبال کیا۔ اس کی تواضع ایک مرتبہ پھر بیڑ سے کی گئی۔ اس مرتبہ کانتا جان بوجھ کر ششما کو گفتگو کا موقع دے رہی تھی۔ اب تک وہ بہانے بہانے سے دومرتبہ دس پندرہ منٹ کے لئے غائب ہو چکی تھی۔ اس مرتبہ پھر وہ کسی کام کے بہانے اٹھ کر گئی تو ششما اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے نزدیک آن بیٹھی۔

”ارسلان صاحب! ہمارے درمیان دوستی کی ایک اہم وجہ ہمارا مشترکہ مشن بھی ہے۔

اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو آپ بھی میری طرح یقیناً اپنے ملک کے نوجوانوں کی بہتری اور تاناک مستقبل کے خواہاں ہوں گے.....!“ اس نے آج پہلی مرتبہ اس نوعیت کی باتیں کی تھیں۔

”کیوں نہیں۔ کیوں نہیں!“ ارسلان نے چائے کا گھونٹ حلق میں اٹھیلے ہوئے کہا۔

”میں کہتی ہوں کہ آخر ہم جو ہندوستان کے نوجوان ہیں۔ ابھی تک اپنے بزرگوں کے ورثے کو کیوں جان سے لگائے بیٹھے ہیں۔ ارسلان صاحب! ہمارے بزرگوں نے ہمیں نفرت کیہ بغض اور ایک طویل تھکا دینے والی سرد جنگ کے سوا دیا کیا ہے؟

میرے خیال سے اب وقت آ گیا ہے کہ ہم تیسری دنیا کے نوجوان اپنی سوچ کو آزاد کر دیں۔ خود کو اپنے ملک کی سرحدوں میں پابند کر کے آخر ہم کب تک اندھوں کی طرح ترقی کا راستہ ٹٹولتے رہیں گے..... مسٹر ارسلان! کیا آپ چاہیں گے کہ جیسی بھیا تک زندگی ہمیں اپنے بزرگوں کی طرف سے بسر کرنے کو ملی ہے ہمارے بعد آنے والی نسل بھی ویسی ہی اذیت ناک زندگی گزارے؟

کیا مغربی دنیا کی طرح ہمیں ترقی کرنے اور زندگی کی چاروں اطراف بکھری خوشیاں سمیٹنے کا حق نہیں.....!“ ارسلان کو اندازہ ہو رہا تھا کہ رضوی صاحب نے ششما کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ اس سے بھی آگے کی کوئی چیز ہے۔

”کیوں نہیں مس! کیوں نہیں۔ برصغیر کا ہر نوجوان کم از کم اس سہانے مستقبل کی خواہش لے کر توجی رہا ہے.....!“ اس نے اپنے مزید قریب آتی ششما کے قرب سے اٹھتی ہوئی خوشبوؤں میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

”پھر یاد رکھو۔ ہمیں یہ مذہب کی دیواریں گرانہ ہوں گی۔ ہمیں اپنی سوچ سیکور بنانا ہو گی۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھنا ہو گا۔ تب ہی ہم بیماری، غربت، افلاس اور اپنی بے کسی کا خاتمہ کر سکتے ہیں..... مسٹر ارسلان یہ سفر مل کر ہی طے ہو سکتا ہے۔ مل کر ہی.....!“

”ہاں ششما تم ٹھیک کہہ رہی ہو..... لیکن کس طرح؟ ہماری راہ میں کتنے ضابطے کتنی رکاوٹیں حائل ہیں۔ اس کا اندازہ ہے تمہیں؟“

ارسلان نے رضوی صاحب کی تربیت کا پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

”مجھے سب مجبوریوں کا احساس ہے ارسلان۔“ اس نے اچانک ہی ارسلان کے کندھے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا..... ”آؤ ہم دونوں مل کر اس مشن کا آغاز کریں۔“

”میں تیار ہوں مس شمشا!“ ارسلان نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ شمشا نے اس کا ہاتھ اتنی گرمجوشی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دبایا تھا کہ ارسلان کو اپنے خون کا خیر بدلتا محسوس ہوا.....!

”میں رابطہ رکھوں گی۔ تم بھی مجھ سے رابطہ رکھنا۔ جلد ہی اس سلسلے میں کوئی لائحہ عمل تیار کریں گے..... اگر کبھی تم لندن آنا چاہو تو میں حاضر ہوں۔ ہم نے وہاں تیسری دنیا کے نوجوانوں کی ایک تنظیم قائم کر رکھی ہے۔ اس کی طرف سے تمہیں کسی بھی وقت بلانے کا اختیار مجھے حاصل ہے۔“ اس نے ارسلان کے سامنے دانہ پھینکا.....!!

ارسلان نے بظاہر بے وقوف مرغی کی طرح دانا چک لیا۔

”ہاں! ضرور کچھ فرصت یہاں سے ملے تو آؤں گا۔ جب ہم کام کا آغاز مل کر کریں گے تو پھر ملتے ہی رہیں گے.....!“ اس مرتبہ بے تکلفی کا مظاہرہ ارسلان نے کیا تھا۔

اور.....!

شمشا نے اس بے تکلفی کا جواب اس کی توقع سے بڑھ کر دیا۔
کانتا اندر آ گئی تھی!

تینوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر شمشا کے اشارے پر اس نے ایک فوری مصروفیت کا بہانہ گھڑ لیا اور کانتا ارسلان کے ساتھ..... اس کی دعوت میں شریک نہ ہونے پر اظہارِ افسوس کرنے لگی۔ ارسلان کی خواہش کے عین مطابق سب کچھ ہو رہا تھا۔
دونوں صیاد ایک دوسرے کو شکار کرنے جا رہے تھے۔

کانتا انہیں ایک ”خوبصورت دن“ کی دعا دے کر چلی گئی اور شمشا ارسلان کی کار میں اس کے فلیٹ کی طرف چل دی۔ اس مرتبہ تعاقب کرنے والے خاصے ہوشیار تھے، کیونکہ آدھ گھنٹے کے اس سفر میں شمشا بار بار کار کے اندرونی شیشے میں جھانکنے کے باوجود اندازہ نہ کر پائی کہ ان کا تعاقب کون کر رہا ہے۔

گھنٹی بجانے پر دروازہ ”خاناماں“ نے کھولا تھا.....!
ارسلان کے ساتھ شمشا بھٹ چار یہ کو دیکھ کر رضوی صاحب کے دل کی دھڑکن ایک مرتبہ تو ابنا مل ہو گئی۔

”سورس!“ اس کی توقع سے بڑھ کر ”کارآمد“ ثابت ہو رہا تھا.....!!
”چڑیا بالآخر پنجرے میں پھنس ہی گئی.....!“ ایک مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

فلیٹ کے آرام دہ سنگ روم میں ایک صوفے پر ارسلان کے پہلو میں دھنسی شمشا بھٹ چار یہ جو دل ہی دل میں ”شکار“ چھانسنے پر پھولے نہیں سمار ہی تھی اس بات سے بالکل بے خبر تھی کہ وہ خود ”شکار“ ہو رہی ہے۔ اس کی پشت پر نصب حساب آلات ان کی گفتگو ریکارڈ کر رہے تھے۔

یہاں اس نے پھر ارسلان کے سامنے امن، شانتی، بھائی چارہ، بین الاقوامیت کا سنہری جال پھیلایا اور ارسلان طے شدہ منصوبے کے مطابق اس میں پھنستا چلا گیا۔ اس نے شمشا کی توقعات سے بڑھ کر اپنے جاہل ہونے کا ثبوت دیا تھا.....!
شمشا نے آہستہ آہستہ پاکستانی سیاست، فوج اور دینی جماعتوں پر تنقید کرنا شروع کر دی تھی اور وہ اس کی ہاں میں ہاں ملارہا تھا.....!

خاناماں اس دوران دوسرے ان کے سامنے ٹھنڈا اور گرم رکھنے کے بعد ان کے حکم پر کھانا تیار کر رہا تھا۔
”اگر آپ نوجوان لوگ چاہیں تو پاکستان میں سبز انقلاب لاسکتے ہیں۔ میں کہتی ہوں۔ ہم دونوں ممالک یورپ کی منڈیاں کیوں بنیں۔ ہم کیوں نہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر تجارت کریں..... ہم سے زیادہ ایک دوسرے کے دکھ کون سمجھتا ہے۔“

شمشا نے جب دیکھا کہ شکار قابو آچکا ہے تو اس پر آخری داؤ بھی آزمایا.....!
”یہی میں چاہتا ہوں شمشا جی!“ ارسلان کے منہ سے جیسے ہی یہ بات نکلی، شمشا نے بے اختیار اس پر امنڈتے ہوئے اسے ”خران تحسین“ پیش کر دیا۔

اس ”خراج“ کا وقفہ پھر طویل ہوتا گیا۔

دونوں بظاہر یہی تاثر ایک دوسرے کو دے رہے تھے جیسے دونوں نے یہ حرکت جوش جوانی میں کر ڈالی ہے۔

ہوش مند خاناماں نے انہیں مصروف دیکھ کر دروازے کے نزدیک پھٹکنے کی ہمت نہیں کی تھی۔

خاصی دیر بعد جب دونوں نے خود کو سنبھال لیا تو ارسلان مسکراتے ہوئے اٹھا اور خاناماں کو آواز دے کر بلایا۔

”بھئی کب کھانا لارہے ہو.....؟ ابھی اور کتنی ورزش کراؤ گے ہماری؟“

خاناماں نے مسکرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”میں کھانا دوسرے کمرے میں لگا رہا ہوں صاحب!“ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

تیسری دنیا کے نوجوانوں کے مسائل حل کرنے اور آنے والی نسلوں کو محفوظ مستقبل دینے کے لئے ششما بھٹ چاریہ نے ارسلان کے ساتھ مل کر جس مہم کا ارادہ کیا تھا۔ اس کا آغاز ہی اتنا بھرپور تھا کہ ارسلان کو اپنے جسم کا انگ انگ کھانے کی میز پر ٹوٹا محسوس ہوا۔

اپنی دانست میں ششما نے اس ”دوستی“ کی بڑی مضبوط بنیاد رکھی تھی اور ارسلان سوچ رہا تھا کہ غیر ملکی سفارت خانوں کی یہ محترم ہستیاں جانے ایسی کتنی ”دوستی“ کی گہری بنیادیں پاکستان میں قائم کر چکی ہیں؟

اسے اب سمجھ آنے لگی تھی کہ اس بد قسمت ملک میں غداروں اور وطن فروشوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ کیوں ہو رہا ہے.....؟

کھانا کھاتے ہوئے ششما نے اسے یہ خوشخبری بھی سنا دی تھی کہ لندن میں اس کا اپنا الگ فلیٹ ہے جہاں کسی ”مداخلت“ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ارسلان نے اسے جلد ملاقات کا یقین دلایا تھا..... شام ڈھلے جب ششما نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو ارسلان نے کہا..... ”جی ہاں نہیں جہاں کہ تمہیں جانے دوں..... لیکن مجبوری ہے۔ تمہاری اپنی مصروفیات بھی تو ہوں گی۔“

”ارے نہیں! میری کوئی مصروفیات نہیں لیکن میں رات یہاں ٹھہر گئی ناں تو قیامت آ

جائے گی..... بھئی آخر جمہوری اور غیر جمہوری ممالک میں اتنا فرق تو ہونا چاہئے ناں۔ پھر میں تمہارے دشمن ملک کی لڑکی.....!“ اس نے ہنستے ہوئے بے ہودہ حرکت کی۔

”میں کسی کی پروا نہیں کرتا ششما جی۔ میں کسی سے ڈرنے والا نہیں۔ میرا بھی طلباء سیاست میں ایک مقام ہے۔ ہر کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ میرے منہ لگتا پھرے۔ اٹلی جنس.....“

”ارے نہیں.....!“ ششما نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا..... ”ایسا کبھی بھول کر بھی نہ سوچنا..... ان لوگوں سے بہت ہوشیار رہنا ارسلان! بھگوان نہ کرے تم کبھی ان کے شکنجے میں پھنسو..... ہمارے مشن کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ان سے بچ کر رہا جائے..... کام زیادہ ضروری ہے۔“ اس نے ارسلان سے لپٹتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی گاڑی میں ششما بھٹ چاریہ کو چھوڑنے جا رہا تھا۔ اس درمیان اس نے لندن کے اپنے خصوصی ٹیلی فون نمبر ایڈریس اور بہت سی دوسری باتیں اسے بتا دی تھیں۔ ارسلان بچہ نہیں تھا۔

وہ جانتا تھا ان کی گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے اور تمام اطلاعات ان کے دوستوں تک منتقل ہو چکی ہیں۔ ششما نے اس سے اب تک نجائے کتنی مرتبہ لندن میں ملنے کا وعدہ لیا تھا۔ اس نے کہا تھا ”کام“ کے سلسلے میں وہ خود رابطہ کرے گی.....!

○

ابھی تک نجمہ بیگم نے اس سے نازنین والا کارنامہ مکمل ہونے کے بعد اس مسئلے پر بات نہیں کی تھی۔

اس نے خود اظہار تحسین نہیں کیا تھا۔ بس اگلے روز جب دونوں کی ملاقات ہوئی تو نجمہ نے اسے ”آپریشن“ کا میاب ہونے پر مبارکباد ضرور دی تھی اور اس کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔

فی الوقت اس نے نازنین کے ہاں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کیونکہ ملک صاحب بھی آج کل سیاسی معاملات سلجھانے کے سلسلے میں دارالحکومت گئے ہوئے تھے جہاں پارٹی کا مرکزی کونسل کا اجلاس چل رہا تھا جس کے وہ ایک سرگرم رکن تھے۔

آج ارسلان کو گئے پانچواں دن تھا۔

مختار اباں بائی نے یہ دن ایک ایک لمحہ گن کر بسر کئے تھے۔ دو مرتبہ اس نے ملک صاحب

کے گھر فون کر کے کسی سے دریافت کروایا تھا کہ ارسلان صاحب نے کب واپس آنا ہے، جواب میں دونوں مرتبہ فون سننے والے نے اسے ڈانٹ دیا تھا اور سختی سے کہا تھا کہ اس فون نمبر پر کوئی ارسلان صاحب نہیں رہتے۔ مجبور ہو کر وہ حالات پر تکیہ کر کے بیٹھ رہی۔ اس درمیان باجے والا استاد فیض اسے شریفیوں کے ایک ایک پل کی رپورٹ لا کر دیتا رہا۔ جس جس کوٹھے پر جا کر شریفیوں نے اس کے خلاف زہر اگلا تھا۔ وہاں کے ایک ایک پل کی خبر کوٹھے کے استادوں کے ذریعے استاد فیض تک پہنچتی جہاں سے وہ پھر مختاراں بائی کو منتقل ہو جاتی۔

شریفیوں کے پراپیگنڈے نے مختاراں کے کوٹھے کی رونق ختم کرادی تھی۔ یا تو یہ عالم تھا کہ نازنین کا ڈانس دیکھنے کو گاہکوں کے ٹھٹھ لگے رہتے تھے یا یہ حالت تھی کہ نوکروں کا خرچ بھی ڈھنگ سے نہیں چل رہا تھا۔ وہ رقم جو بطور ایڈوانس ارسلان کی طرف سے اسے ملی تھی۔ مختاراں نے اپنے محفوظ سرمائے میں منتقل کر لی تھی، لیکن اب یہ نوبت آنے والی تھی کہ وہ محفوظ سرمائے کی طرف ہاتھ بڑھاتی۔

آج تو غضب ہی ہو گیا جب رات دیر گئے تک کوئی گاہک کوٹھے کی سیزھیوں نہ چڑھا تو استاد فیض نے افیم کے نشے سے اونگھتے ہوئے کہا۔

”بی بی! اب دکان بڑھانی لیں۔ بازار بند ہونے میں ایک گھنٹہ ہی تو رہ گیا ہے۔ اب کون اس طرف آئے گا..... یوں بھی ایسی خاندانی طوائف کاٹنے خالی کوٹھا“ اچھی بات نہیں ہے..... بی بی! تم نے اس بازار میں رہنا ہے تو ذرا سیاست سے کام لیا کرو..... بیٹی کی طبیعت کی خرابی کے بہانے آج چھٹی ہی کر لیں..... ورنہ شریفیوں.....“

”نام نہ لو اس خانگی کا میرے سامنے۔“ اس نے استاد فیض کی بات کاٹتے ہوئے کہا..... ”اس جنم جلی کو ایسا مزہ چکھاؤں گی کہ ساری زندگی یاد رکھے گی۔ زبان کاٹ کر ہاتھ میں نہ دے دی تو میرا نام بدل دینا..... کتیا کی اولاد اپنی اوقات بھول کر میرے منہ لگ رہی ہے.....!“ غصے سے اس کے گلے کی رگیں پھولنے لگی تھیں۔

”تم جاؤ کل آنا.....!“ اس نے استادوں کو چھٹی کا اشارہ کیا اور وہ چپ چاپ اٹھ گئے۔

روانگی پر اس نے دونوں کو ”خرچ پانی“ دیا تھا۔ بہر حال وہ خاندانی طوائف تھیں۔

وہ رات مختاراں بائی نے کانٹوں پر بسر کی۔ وہ کسی بھی قیمت پر شریفیوں کا منہ نوچ لینا چاہتی تھی۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ شریفیوں کو تھانے کا منہ ضرور دکھائے گی۔ مقامی تھانے میں تھنیدار سے اس کی ”یاد اللہ“ تھی اور وہ جانتا تھا کہ مختاراں بائی کے ملک صاحب سے خصوصی تعلقات بھی ہیں۔

مختاراں بائی تو خود شریفیوں کی خبر لینا چاہتی تھی، لیکن اس کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ اس نے کبھی غصے کو عقل پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا..... وہ جانتی تھی کہ اگر بازار کے لوگوں کو علم ہوا کہ اس نے شریفیوں کی شکایت کر کے اسے تھانے بلوایا ہے تو سارا بازار اس کا بایکاٹ کر دے گا۔ وہ ٹھنڈے پیٹوں بھی بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔

لیکن..... سیاست سے کام لینا ہی دانش مندی کا تقاضا تھا۔

اس نے معاملات کو کل پر چھوڑا اور سر ہانے تلے بازو رکھ کر لیٹ رہی.....!

○

دوسرے روز صبح ہی وہ تھانے چلی گئی۔

اس وقت سارا بازار گھوڑے بیچ کر سوراہا تھا اور وہ جانتی تھی کہ کوئی اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکے گا۔ تھانے دار کے کمرے کا دروازہ تھانے کی مخالف سمت کھلتا تھا۔ اس نے ابھی دردی زیب تن کی ہی تھی جب کسی نے باہر سے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

تھانے دار نے خود دروازہ کھولا تو سامنے چادر میں لپیٹی مختاراں بائی کھڑی تھی.....!

”خیریت بائی جی! صبح آپ کدھر؟“

”بس میاں صاحب بہت مجبور ہو کر آئی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بڑے لوگوں کو تکلیف دی جائے۔“ وہ اندر آ کر تھانے دار کے سامنے ہنسی کر سی پر بیٹھ گئی۔

”بائی جی ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی تکلیف ہو تو ہماری نوکری کا کیا فائدہ۔ حکم کرو..... بات کیا ہے.....؟ مجھے بلالیا ہوتا۔“

تھانے دار جانتا تھا کہ مختاراں بائی کا..... ”بڑے لوگوں“ کے ہاں آنا جانا لگا رہتا ہے اور اس سے پہلے والے تھانے دار کا تبادلہ بھی یہاں سے اسی لئے ہوا تھا کہ اس نے مختاراں بائی کو

بھی آنکھیں دکھانا شروع کر دی تھیں۔

”میاں جی! بات کچھ ایسی ہی ہے۔ میں خواہ مخواہ کسی کو تنگ کرنے کی قائل نہیں، لیکن جب پانی سر سے گزر جائے تو پھر کچھ کرنا ہی پڑتا ہے..... تم جانتے ہو ہم عزت دار لوگ ہیں۔ ہر ایرے غیرے کے منہ لگنا پسند نہیں کرتے۔ چھتی گلی والی شریفاں کو تو سارا تھانہ جانتا ہے۔ آج کل اس نے میرے خلاف کچھ زیادہ ہی زبان چلانا شروع کر دی ہے..... تم جانو میاں جی! اگر ہماری عزت پر حرف آ گیا تو کہاں منہ دکھانے کے لائق رہیں گے۔ وہ تو شکر کردا بھی ملک صاحب کے کانوں میں ایسی بات نہیں پہنچی ورنہ وہ کچھ زیادہ ہی سختی کرتے..... میں بھی اس کجخت کا برا نہیں چاہتی، لیکن ”چھٹال“ نے کچھ زیادہ ہی بک بک شروع کر دی ہے۔ میں نے سوچا ایس پی صاحب کے پاس کیوں جاؤں جب اپنے میاں صاحب موجود ہیں۔“ اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

”تم حکم کرو بائی جی! اس کی ایسی تیسی۔ ایسا سبق سکھاؤں گا کہ تمہارے جوتوں کو چھو کر گزرے گی۔“ تھانے دار نے گردن پھلاتے ہوئے کہا۔

”بس میاں جی! ذرا بچا کر۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو ورنہ سارا بازار میری جان کو آ جائے گا..... ماں بیٹیوں کو کم از کم ایک رات تھانے کے ملازموں کا مہمان ضرور رکھنا۔ بے فکر رہنا کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا.....!“ کہتے ہوئے اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور چھوٹا سا بوٹہ نکال کر اس میں سے تین بڑے نوٹ نکال لئے۔

”میاں جی! شریفاں کو یہ چل جانا چاہئے کہ اس کا واسطہ کس سے ہے۔“ اس نے نوٹ تھانے دار کی مٹھی میں تھماتے ہوئے کہا۔

”بائی جی اس کی کیا ضرورت تھی۔ ہم تو تمہارے خادم ہیں۔ تم اطمینان سے جاؤ اور دیکھتی رہو کہ میں اسے کیسا سبق سکھاتا ہوں.....!“ اس نے بے شرمی سے ہنس کر نوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

○

مختار ایں بائی جس طرح آئی تھی اسی طرح چادر لپیٹ کر واپس چلی گئی۔ تھانے دار نے اسے منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا۔ مختار ایں کو بھی اس کی بات پسند آئی تھی۔ دوسر کاری چھٹیاں آرہی

تھیں جن میں اسے کارروائی کرنا تھی۔ اس طرح کم از کم دو دن ان لوگوں کی ضمانت نہیں ہو سکتی تھی۔

اسی روز بعد دوپہر مختار ایں بائی اور نازنین سائیں سیٹلی سرکار کے عرس میں شرکت کرنے دوسرے صوبے میں چلی گئیں۔ ایک نوکر وہ اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ اس طرح کچھ وقت بھی کٹ جاتا اور اس منحوس بازار سے نجات بھی مل جاتی۔

ان کی روانگی کے دو دن بعد اچانک پولیس نے شریفاں کے کوٹھے پر چھاپہ مارا اور اس کی تینوں بیٹیوں کو رنگے ہاتھوں تماش بینوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے گرفتار کر لیں۔ ماں بیٹیوں اور ان کے گاہکوں کو پولیس جس طرح سارے بازار میں ذلیل کرتی تھانے تک لائی تھی اسے دیکھ کر بڑے بڑوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

تین روز تک تھانے والے شریفاں کی دھنائی کرتے رہے۔ جو کوئی سفارش کو جاتا گالیاں کھا کر واپس آتا۔ تین روز بعد شریفاں مہینے بھر کی کمائی لٹا کر لڑکیوں سمیت کوٹھے پر پہنچی۔ اس نے ایسا سبق سکھا تھا کہ اپنی آنے والی نسلوں کو نصیحت کر جاتی کہ آئندہ مختار ایں بائی سے متھا نہ لگاتا۔

○

”پرسوں تم لندن جا رہے ہو..... ایک ہفتے کے لئے اگر تم چاہو گے تو تمہارے قیام میں تین چار روز مزید اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔“ نجمہ نے صبح ناشتے پر اسے خوشخبری سنادی۔

”تھینک یو.....!“ ارسلان نے بے ساختہ کہا۔

واقعی وہ خوشی سے پھولے نہیں سارہا تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ نجمہ بیگم تصادیر کا کارنامہ انجام پانے پر اسے انعام دے رہی ہے۔

”اپنے لئے آج دو تین سوٹ پسند کر لینا۔ باقی شاپنگ لندن میں کرنا۔ وہاں بہت اچھے میزبانوں کا انتخاب کیا ہے میں نے تمہارے لئے۔“ نجمہ بیگم نے بے تکلفی سے آنکھ دبائی۔

”جی شکریہ.....!“ وہ اور کیا کہتا۔

اگلا سارا دن اس نے تیاری میں گزارا۔ اس درمیان نجمہ بیگم نے انٹرنیشنل سٹر کے آداب سمجھادیئے تھے اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ جس جہاز کے ذریعے وہ جا رہا ہے وہ فریڈکلف پر رک

کر ہتھرو جائے گا۔ اس نے ارسلان کو بتایا تھا کہ ایئر پورٹ پر جب وہ اترے گا تو اسے کن کن مراحل سے گزرنا ہوگا۔

یہ بات اس نے بطور خاص اسے سمجھائی تھی کہ راستے میں جہاز جس ایئر پورٹ پر ٹھہرے وہاں اسے لاؤنچ میں جانے کا موقع ملے تو اپنا ہینڈ بیگ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھے جس میں اس کا پاسپورٹ اور کرنسی ہوگی۔

پاکستان سے لندن روانگی تک کا وقت اس نے خواب کے عالم میں گزرا تھا۔ وہ جاگتے ہوئے بھی لندن کے سنے دیکھتا رہا۔ اس دوران ایک مرتبہ مختار اس بائی نے بے قرار ہو کر اپنا ایک آدمی اسے لینے کے لئے بھیجا تھا لیکن چونکہ اس کو ارسلان تک پہنچنے ہی نہ دیا۔ چونکہ ایک کو بیگم صاحبہ کی طرف سے خصوصی حکم نامہ ملا تھا کہ ارسلان کے کسی ملاقاتی کو اگر وہ یہاں تک پہنچ ہی جائے تو ملنے کی اجازت نہیں..... سب کو یہی بتایا جائے کہ وہ چھٹی لے کر کہیں چلے گئے ہیں اور پندرہ روز کے بعد واپس آئیں گے۔

○

مختار اس بائی کو جب یہ پیغام ملا تو وہ چکرا کر ہی رہ گئی۔ اسے تو اپنے بقایا جات کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ ارسلان نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگلے روز شام کو ان سے ملے گا، لیکن وہ رات گئے تک نہ آیا تو مختار اس بائی نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر ایک میراثی کو اس کی طرف روانہ کر دیا تھا حالانکہ ارسلان نے اسے کبھی اپنا فون نمبر نہیں دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ خود اس سے ملنے نہ آئے۔

جب اسے یہ پیغام ملا کہ ارسلان تو دس پندرہ دن چھٹی چلا گیا ہے تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

”اللہ خیر کرے.....!“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

صبح تک وہ پریشانی کے مارے ایک پل نہ سو سکی۔ بالآخر اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی تھی کہ ملک صاحب سیاسی آدمی ہیں، عین ممکن ہے انہوں نے کسی ایمر جنسی کام سے اسے بھیج دیا ہو۔

اس کے لئے اب دس پندرہ دن تک بے قراری سے ارسلان کا انتظار کرتے رہنے کے

علاوہ اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں تھا۔

”لیکن یہ دس پندرہ دن گزاریں گے کیسے؟“

یہ سوچ اس کے لئے بڑی جان لیوا تھی۔ جب سے بازار والوں کو علم ہوا تھا کہ نازنین اب راتوں کو غائب بھی رہنے لگی ہے تو انہوں نے مختار اس بائی کے متعلق بڑی غلط رائے قائم کر لی تھی۔

”اے بی! وہ تو شروع ہی سے ”خاگی“ تھی۔ میں نے اس کی جوانی دیکھی ہے۔ بس زیادہ منہ نہ کھلاؤ میرا۔ وہاں جالندھر میں کوئی اس کو منہ نہیں لگاتا تھا۔ یہاں آ کر بے چاری خاندانی کنجری بن گئی..... ارے آج سے کہاں یہ تو پچھلے ایک سال سے نازنین سے پیشہ کروا رہی ہے۔ جانے مولا! ہم تو کسی سے کہتے نہیں..... اس نے خاندانی لوگوں کا نام بدنام کر رکھا ہے۔“ شریفان کے لئے تو بلی کے بھاگوں چھینکاؤ ٹاڈا والی بات ہوئی تھی۔

اس نے بازار میں وہ ڈنڈی پیٹی کہ جسے علم نہیں تھا، وہ بھی جان گیا۔ اب مختار اس کو خٹے کی شہرت ایسی بگڑی تھی کہ کوئی ادھر منہ نہیں کرتا تھا۔

بلا کباڑ یہ جو پچھلے دو سالوں سے اس کا مستقل گاہک تھا۔ نازنین کے اچانک کسی رات غائب ہو جانے پر بڑا غصہ کرنے لگا تھا۔ اس نے مختار اس سے اشارے کئے میں خود بھی کہا تھا۔ پھر ایک روز سارنگی نواز استاد گامی کہ جو جالندھر ہی سے مختار اس کے ساتھ لگا تھا، کہلویا کہ اگر وہ چاہے تو بلا منہ مانگا مہینہ دے کر نازنین کو بٹھانے کے لئے تیار ہے۔

لیکن.....!

مختار اس کا دماغ تو ساتویں آسمان پر تھا۔ ملک صاحب کے ہاں نازنین کے ایک دو مرتبہ چلے جانے اور بٹھانے میں اس کے دو تین فون آنے کے بعد اس نے یہ سمجھا تھا کہ جیسے اب وہ ہی بازار کی کونسلر بن گئی ہے۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ استاد گامی کو ڈانٹ دیا اور کہا تھا کہ اسے یہ بات کہتے ہوئے شرم نہ آئی۔

”بی بی پرانا نمک خوار ہوں۔ جو بات کروں گا تمہارے بھلے کی کروں گا۔ یہ چڑھتی جوانی اڑتی چڑیا کی طرح کسی روز اچانک ہی ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ اگر بچی نے ہاتھ پاؤں اچھے لٹکائے ہیں تو یہی دن ہیں اپنے برے دنوں کا سامان کر لو..... ورنہ کسی روز اس دن کو بہت بچھتاؤ

تقریباً۔ گرامر کے لئے لکھا گیا ہے۔ اس میں اس کے لئے لکھا گیا ہے۔

”بے فکر رہنا۔ کسی بات سے گھبرانا نہیں۔ میزان تمہیں لینے کے لئے وہاں پہلے آئے
منجھو بیٹے! منجھو! اے اللہ! منجھو! خدا کی رحمت سے اس بچے کو اپنا شکر ادا کرے۔“

یہاں کسی نے اس کا سامان کھول کر دیکھنے کی ہمت نہیں کی تھی بلکہ اب تک دو تین مرتبہ مقامی عملدان سے ”کوئی خدمت“ دریافت کر چکا تھا۔

جہاز کی روانگی کا اعلان ہو رہا تھا جب اچانک ہی نجمہ بیگم کے حکم نے اسے چونکا دیا۔
”جہاز فرینکفرٹ ایئر پورٹ پر رکے گا اور تمہیں ٹرانزٹ لاؤنچ میں جانے کی اجازت ملے گی۔ جس ٹرمینل پر یہ پرواز رکے گی اس پر ایک ڈیوٹی فری شاپ موجود ہے۔ سب لوگ وہاں جائیں گے، تم بھی جاؤ گے..... وہاں ایک دوست تمہاری تصاویر کے ساتھ تمہارا منتظر ہوگا۔ وہ فون پر تمہاری بات بھی مجھ سے کروائیں گے۔ یہ بریف کیس اس دکان پر چھوڑ دینا۔ وہاں بعینہ ہی دوسرا بریف کیس تمہیں مل جائے گا۔ جاؤ شاباش، گڈ بائی، اپنا خیال رکھنا۔“

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ وہ چکر اکر ہی رہ گیا۔

مسافر قطار میں جہاز کی طرف آرہے تھے اور نجمہ بیگم نے عین آخری لمحات میں اس پر پہاڑ گر دیا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ ارسلان کو کچھ کہنے سننے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔ وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ یہاں بریف کیس کھول کر دیکھ سکتا..... اگر اس میں کوئی خطرناک شے موجود ہے تو اسے باقی سارا بند و بست خود کرنا تھا۔

اب ارسلان کو یاد آ گیا کہ نجمہ بیگم کا بہاول خان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟

○

دھڑکتے دل کے ساتھ وہ مسافروں کی قطار میں لگ گیا۔

فرسٹ کلاس کی قطار بہت مختصر تھی۔ اسے ایک شاندار اور آرام دہ کوچ نے بمشکل تین منٹ میں جہاز پر پہنچا دیا۔ جہاز کی اس اعلیٰ کلاس کے دروازے پر ایک نازک اندام ایئر ہوسٹس نے اپنے پورے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر کے اسے خوش آمدید کہا اور اس کے بورڈنگ کارڈ سے سیٹ کا نمبر پڑھ کر اس کو بڑے احترام سے متعلقہ سیٹ پر بٹھا دیا۔

اسے کھڑکی کی طرف سیٹ ملی تھی اور ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔

بار بار اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بریف کیس کو کھول کر دیکھے، لیکن ابھی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

جہاز کے ایئر کنڈیشن پوری رفتار سے چل رہے تھے، لیکن ارسلان کو اپنے ماتھے پر پسینے

کے ننھے ننھے قطروں کا احساس ہو رہا تھا۔ ہتھیلی سے اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور کھڑکی کے شیشے سے باہر رن وے پر نظریں جما کر بیٹھ رہا۔

نجمہ ملک نے اس سے بہت خطرناک کھیل کھیلا تھا۔

اگر اس بریف کیس میں ہیر وڈن موجود تھی تو اسے ارسلان کو ضرور بتانا چاہئے تھا۔

لیکن.....!

اس نے نہیں بتایا۔ ارسلان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟

”کیا نجمہ ملک نے یہ سمجھا تھا کہ میں اس کا کہنا نہیں مانوں گا.....!“

اگر نجمہ بیگم اس سے کوئی بھی کام کہتی تو وہ اس کام کے لئے کبھی انکار نہ کرتا۔ اس کے پاس نجمہ ملک سے سرتابی کی گنجائش نہیں تھی۔ اب وہ نجمہ کے ساتھ ایک گہرے راز میں شریک ہو چکا تھا۔ انہوں نے مل کر ملک صاحب کے خلاف سازش تیار کی تھی۔ اس سازش میں اس نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ اگر ملک کو بھٹک بھی پڑ گئی تو وہ اس کی ٹکا بوٹی کر ڈالے گا۔

وہ جانتا تھا ملک صاحب اپنے دشمن کو کتوں کے سامنے پھینک دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔

اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب یا جواز موجود نہیں تھا کہ آخر نجمہ ملک نے اس کے ساتھ یہ زیادتی کیوں کی؟

○

جہاز کے مائیک سے نشر ہوتی موسیقی ختم گئی اور ایک ایئر ہوسٹس قرآنی آیات کی تلاوت کے بعد جہاز کی روانگی کا اعلان کر رہی تھی۔ اعلان کے خاتمے کے ساتھ ہی جہاز کے انجنوں کی آواز بدلنے لگی تھی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ ریگنٹا شروع کر دیا اور رن وے پر ایک طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد جب جہاز نے پرواز کے لئے اڑان بھری تو ارسلان کو قدرے سکون کا احساس ہوا۔

اب وہ اس لمحے کا منتظر تھا جب انہیں سیٹ بیلٹ کھولنے کی اجازت ملتی اور وہ کسی کام کے بہانے بریف کیس کھول کر اس کے اندر موجود چیزوں کا جائزہ لیتا۔ کیونکہ اس کے سامنے تو نجمہ بیگم نے اس میں دو تین فائلیں ہی رکھی تھیں اور اسے بتایا تھا کہ کوئی مسٹر مارٹن جو اسے

ایسی باتیں کہہ رہے تھے کہ پھر فائلیں اس درخت میں لپکتی تھیں خود پر لپک کر کہیں کی تلاش میں لپکتے تھے۔
نہیں سمجھا تھا۔
- لڑائیوں کے لیے لڑنے کے لیے لڑتے تھے۔

جہاز کے مخصوص بلندی پر پہنچنے کے بعد یہاں پہنچتے ہی ایئر ہوسٹس کی رہنمائی اس کے طرفت چلی۔ اس نے ایک ٹرے میں آٹھ بوم توپوں کے کوسٹل کے ساتھ ہی اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

ابو سلیمان نے تو ایسے کو کھول کر تو تین مرتبہ لڑائی اور قہر یہی علی بن موسیٰ پر اسے منہ پر پھیر لیا۔ اس عمل سے اسے چھ خاضا کیس پہنچا اور گیارہ تو لڑائیوں کیجئے ابیرے ہوشیں کی لڑائی میں پھینک کر اس نے اپنی جگہ کھڑے ہو کر پھر یہ کہیں اٹھایا اور پوچھنے لگے تھے غلاموں پر کھڑے کیا جائے گا؟

یہ سب کچھ دیکھا تو میں نے اس کو گتہ بھی پر بیٹھ ہی اس سے کہیں کہ مجھے کچھ دے دے۔ اس نے کہا کہ
تو نے اس سے کیا ہی نہیں کیا ہے اور میں بھی اس کے حساب سے کہہ دے اور جو تو نے کہا وہ اس کے
خاصی۔

تکے لہجہ برف کیس کی پھل کر اس نے انہیں سچ واپس آکر جانے دیا تو انہیں اس کی انتہائی رسی
 کہ برف کیس خالی تھا۔ اس میں وہی دو تین فائلیں تھیں۔ ارسالان نے اچھی طرح ٹھونک۔ بجا پر
 برف کیس کو دیکھ لیا۔ لیکن اس میں کوئی غصہ خانہ بھی نہیں تھا۔ بس ۱۱۱ کے ۱۲

”کیا مذاق ہے یہ؟“ اس نے سوچا۔
 اے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر نچھ ملک کیا کرنے جارہی ہے؟ بریف ٹیس کی ایک

[illegible][illegible]

ہفت روزے سامنے دیں گے پرنس و پرنسز جیہاڑہ اترتے ہی جیہاڑہ سے کامیاب کرنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ مسلسل سات آٹھ گھنٹے کی پرواز سے انہیں تھک دیا تھا۔ ان سلاٹن نے جیہاڑہ کے رکھے پر اپنی

بیل کھولی اور بریف کیس ہاتھ میں پکڑ کر دوسرے مسافروں کے تھاقپ میں اس ہلنگ نیا ٹیوب سے گزرنے لگا، جہاں کے خال خال تھے ہر انہیں ڈانڈی ڈانڈی لالہ بی بی پتیل پتیل تھا۔ یہ کس ہیں؟“

[illegible][illegible]

زبان ان پر ملا تھا جس نے ہم کو بیکے بیکے علم کر لیا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے کونے میں بیٹھ کر ہنس رہا تھا۔
 سامنے بہاول خان کھڑا تھا۔ یہ ایک لائق ملہ کے اردو بوندہ، ذی سلسلہ کے۔
 نے کہا ”ایسا دل خاں! اب وقت ہے تاج پزیر شخص نظر آ رہا تھا کہ جو اس پر ملان کو بھیجی، اپنی آنکھوں پر

ایں اے لے تو ہم تین بار آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ یہ اولیٰ خاں کی طرف ہو گیا تھا۔ اس لیے میں تو شہر اس کے لیے چنے ملک کی پولیس سمجھنے نہ چکاں لکھتے تھے۔ تہذیب، نالہ، افسوس

یہاں، وہ بچہ لڑکا حلقہ قیام الحیدر آیا، اس کے لئے ابغلاتھو اس کے لئے ان کی طرف ہی چلا گیا۔ "سلیم نام
یہ بچہ میرا ہے، اس کے لئے ابغلاتھو اس کے لئے ان کی طرف ہی چلا گیا۔ "سلیم نام

..... کہ ”جی“، اسلام اپنے لیے اپنے ہوشیار بھائیوں کو بھیجی کہ بنو امیہ کے خلاف جہاد کیا جائے، ان کے
نالہ ادا۔ ”ہر ایک آپ سے نفرت کی بات کرے اور ہر شہر سے نفرت کی بات کریں“۔ یہ بھی یاد
رہے۔ لا، ان کے بہت شرفاء تھے، ان کے میں ان کے حاکم بنی امیہ کے اس سلطان کو بھیج دیا کہ وہ ان کے اس

بھکان کے ایک لڑائیے میں کافر کے نزدیک پہنچ گئے، غنائی لوگ، شاید ”یہ سب“ کیے پہنچے آ رہا تھا۔
 لہذا پوچھ کر پڑی لڑائیے کو دیکھ رہے تھے اور ان کے لیے سلام کا، خیر مقدم کیا۔ ا۔ س: جب یہ دیکھا گیا،
 ر: نہ تو ان لوگوں نے لڑائیے کو دیکھا تو ان انھما کو ایسا ہی نہیں دیکھا۔ لگا۔ جس نے کچھ نہیں

نہ دیکھ کر ہی حضرت نے مجھ کو پہچان لیا۔ میں نے کہا: "اے نبی! میں نے تم کو پہچان لیا ہے۔" حضرت نے فرمایا: "اے نبی! میں نے تم کو پہچان لیا ہے۔" حضرت نے فرمایا: "اے نبی! میں نے تم کو پہچان لیا ہے۔"

سائنس میں کتنے سوال پوچھ لئے۔

”جی نہیں شکریہ۔ بہت اچھا۔“ ارسلان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہے اور کیسے کہے۔

”بھئی میں معافی چاہتی ہوں تمہیں عین آخری لمحات میں پریشان کیا۔ تم نے یقیناً اطمینان کر لیا ہو گا کہ خطرے والی کوئی بات نہیں تھی۔ تم اسے میری طرف سے مذاق ہی سمجھ لو۔ بھئی آخر ہم اچھے دوست ہیں۔ میں تم سے مذاق کا حق تو رکھتی ہوں ناں.....!“ مسز نجمہ ملک کا قہقہہ دوسری طرف سے گونجا اور ارسلان کے تٹے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

”تم سلیم صاحب کو جانتے ہو لیکن یہ تمہارے لئے سلیم صاحب ہی ہیں۔ باقی سب کچھ بھول جاؤ۔ انہیں بریف کیس دے دو یا پھر جیسے وہ کہیں کر لو۔ بے فکر رہنا تمہیں کوئی منہ میں نہیں ڈالے گا۔ وہاں اگر تم نے اپنے ہاتھ پاؤں بھلا دیئے تو وہ لوگ خواہ مخواہ پریشان کریں گے۔“ مسز ملک نے دو تین باتیں کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔

”نجمہ ملک آپ کی بہت تعریف کرتی ہے۔ بہت متاثر ہے آپ سے شاید!“ سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی! ان کی ذرہ نوازی ہے ورنہ میں کس قابل.....؟“ ارسلان مسکرایا۔

”مسٹر ارسلان یہ دنیا بہت بڑی لیکن بہت مختصر ہے۔ جانتے ہو کن کے لئے؟“

اس نے ارسلان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ایک دولٹے توقف کیا پھر خود ہی کہا:

”ان کے لئے جو اسے مسخر کرنے کا عزم لے کر نکلیں۔ ورنہ تو مختصری زندگی بھی پہاڑ دکھائی دینے لگتی ہے۔ تم نو جوان ہو، بیٹھو، چاہو تو ساری دنیا کو اپنے قدموں تلے روند سکتے ہو.....

شاید تمہیں میری بات سن کر حیرانی ہوگی کیونکہ تم میرے اصل روپ سے بھی آگاہ ہو۔ میرا ایمان ہے کہ جو مشکل زندگی میں آتی ہے وہ ٹل نہیں سکتی۔ موت کا ایک لمحہ مقرر ہے جیسے زندگی کا۔ پھر ڈر کس بات کا؟ یہ سب سیاست دان، دانشور، تاجر، لیڈر وغیرہ یہ سب لوگ آخر کیا کرتے ہیں؟ سب دنیا کو فتح کر لینا چاہتے ہیں۔ اپنے علم، اپنی دولت، اپنے ذہن اور اپنی قابلیت کے بل بوتے پر چھا جانا چاہتے ہیں..... مسٹر ارسلان یہ دنیا کمزوروں کے لئے تو بنی نہیں..... میری ماں کہا کرتی تھی:

”بیٹا! جو بات قبر میں آئی ہے وہ کبھی بستر پر نہیں گزر سکتی۔“ اگر تم نے کارزار زندگی میں قدم رکھ ہی دیا ہے تو پھر ”واریئر“ بن جاؤ۔ ہر لمحے چوکس اور تمام ہتھیاروں سے مسلح۔ ورنہ ایک طرف چپ

چاپ بیٹھ کر کڑھتے رہو..... میرا مطلب سمجھ گئے نا۔“ سلیم نے بیئر کا خالی ٹن ٹوکری میں پھینکتے ہوئے کہا۔

”ہاں سلیم صاحب! میں بہت اچھی طرح آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”یہ بریف کیس لندن لے جاؤ۔ وہاں مارٹن کو سوئپ دینا۔ تم سے ضرور ملاقات ہو

گی۔“

سلیم نے اسے ہو، ہو اس جیسا بریف کیسے دیتے ہوئے کہا۔

”شکریہ!“

”تمہارا بھی شکریہ۔ اب تم چلو۔ جہاز روانگی کے لئے تیار ہے۔ خیال رہے کہ تم ایک

معزز بزنس مین ہو۔ خود کو بزنس مین پوز کرو..... سفر بخیر۔“ اس نے اپنا ہاتھ ارسلان کی طرف بڑھایا اور اس سے گرجبوشی سے مصافحہ کر کے دکان سے باہر نکل گیا۔

ارسلان والا بریف کیس اس نے خود سنبھال لیا تھا۔ ارسلان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ جب وہ سلیم سے بریف کیس موصول کر رہا تھا تو کسی نے اس کی تین چار تصویریں بڑی پھرتی سے اتار لی تھیں۔

یہاں لوگ سفر کی یادگار تصویریں اتارنے میں مصروف تھے۔ ارسلان کو بالکل شک نہ گزرا کہ کوئی اس کی تصویر بھی اتار سکتا ہے۔ وہ بڑے اطمینان سے واپس جہاز میں آیا تھا۔ ٹرانزٹ لاؤنج سے جہاز میں واپس جاتے ہوئے اس کا بریف کیس ایکس رے مشین سے گزرا گیا لیکن کسی نے اسے کھولنے کے لئے نہیں کہا۔

○

فرینکفرٹ سے لندن تک کا سفر تو بمشکل گھنٹے کا تھا، لیکن جہاز نے بیٹھرو پر آدھ گھنٹہ تک چکر کاٹے جس کے بعد اسے یہاں اترنے کے لئے جگہ میسر آ سکی۔ غریب ممالک کی ایئر لائنوں کے ساتھ یہاں یہی سلوک کیا جاتا تھا۔

جہاز سے امیگریشن تک کا سفر اس نے بخیر و خوبی طے کر لیا۔ اس کے اندراجات اتنے مکمل اور مستحکم تھے کہ یہاں کسی نے اس سے زیادہ الٹے سیدھے سوالات دریافت نہیں کئے۔ کیونکہ ہر سوال کا جواب دینے کے لئے اس کے پاس پہلے سے دستاویزی ثبوت موجود تھے۔

”شاید سردی محسوس ہو رہی ہے۔ اس مرتبہ کچھ زیادہ ہی سردی پڑی ہے۔ لندن میں اپریل میں موسم عموماً اچھا ہو جاتا ہے۔“ کیرن نے یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ بے تکلفی س تقام لیا تھا۔ ارسلان کو جبھکسا لگا، لیکن وہ سنہل گیا۔

”واقعی میری تو قلفی جم گئی۔“ اس نے کیرن سے کہا۔

دونوں ”سروس“ میں چلے آئے جہاں ہاتھ روم تک کیرن نے اس کی راہنمائی کی تھی۔ اب دونوں ایک میز پر آئے سانسے بیٹھے تھے۔ اندر ماحول خاصا گرم تھا۔۔۔۔۔ ارسلان نے اندازہ لگایا کہ یہاں سردی صرف سڑکوں پر ہوتی ہے یا پھر کھلی فضا میں۔ باقی تو ہر جگہ ٹیمریچ نارمل رکھا جاتا ہے۔

کیرن اس کی چوائس دریافت کر کے اسے وہیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔ یہاں ”سیلف سروس“ تھی جس کا علم ارسلان کو نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ٹرے ہاتھوں میں پکڑے وہاں آ گئی۔ ایک ٹرے اس نے اپنے اور دوسری ارسلان کے سامنے رکھ دی۔ یہاں کے ماحول اور لوگوں کی طرح چیزوں کا ذائقہ بھی اس کے لئے اجنبی تھا۔

ہر شے نفاست کا شاہکار تھی، لیکن فی الوقت اس اٹھنے لے بد مزہ! جیسے تیسے اس نے ابلی ہوئی سبزیاں طلق سے اتاریں اور فوم کے کپ میں پڑی کافی کو گھونٹ گھونٹ کر کے پی لیا۔

کیرن کو اپنے مہمان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ یہ بات اس کے فرائض میں شامل تھی کہ وہ مہمان کی ہر ممکن دلجوئی کرے۔ اس کا ”باس“ اسے تنخواہ اس بات کی دیتا تھا کہ وہ اپنے مہمانوں کے لئے وہ سب کچھ کر گزرے جس کا ارسلان کے ملک میں تصور بھی نہیں کیا جاتا۔

کیرن نے آہستہ آہستہ اسے بے تکلف کر لیا تھا۔ وہ ارسلان سے سزا اس کے ملک اور وہاں کے لوگوں کی باتیں کرتی رہی۔ پھر اس نے یہاں کی باتیں شروع کر دیں۔ اس دوران اس نے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ارسلان کو ذہنی طور پر خاصا نارمل کر دیا تھا۔

ان کے نزدیک بیٹھے لوگ ایک دوسرے سے چپکے ماحول سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھے۔

کیرن اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے دوبارہ ہنستے ہوئے ارسلان کا ہاتھ پکڑ کر اسے قریباً

اپنی طرف کھینچا۔ ”سروس“ کے دروازے سے باہر نکلتے ہی اس نے بے تکلفی سے مقامی روایات کے مطابق اپنا ہاتھ ارسلان کی کمر پر رکھ دیا۔ جب کہ ارسلان کا ہاتھ میکانیکی عمل کے تحت اس کے کندھے پر چلا گیا۔۔۔۔۔ سروس کے دروازے سے پار کنگ تک کا ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ ارسلان نے عالم مدہوشی میں طے کیا تھا۔

اس ماحول نے اس پر سحر طاری کر دیا تھا۔ ”لیوٹن“ تک کیرن نے اسے اتنا بے تکلف کر لیا کہ جب وہ مطلوبہ مقام پر پہنچے جہاں مسٹر مارٹن اس کا منتظر تھا تو وہ آپس میں خاصے ”فری“ ہو چکے تھے۔۔۔۔۔ کار سے اترنے کے بعد ارسلان نے خود آگے بڑھ کر کیرن سے لپٹتے ہوئے ”مقامی انداز“ میں اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

○

لیوٹن کی اس خوبصورت بستی کے گرم اور آرام دہ مکان میں اس کا استقبال مسٹر مارٹن نام کے ایک ذہلٹی عمر کے انگریز نے کیا، جس کی کنپٹیوں سے سفید بال جھانک رہے تھے لیکن اس کی جسمانی ساخت اور قد کا ٹھڈیکھ کر ارسلان کو اپنی جوانی حقیر دکھائی دے رہی تھی۔

مارٹن نے اپنے بال کالے کرنے کی فکر نہیں کی تھی، لیکن اس کو دیکھ کر کوئی بھی اس کی جاذب نظر شخصیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بھی ارسلان سے وہی کچھ کہا جو کیرن نے بیٹھروایز پورٹ پر دریافت کیا تھا۔

کیرن کی معیت میں اب دونوں ایک آرام دہ بیڈ روم میں آگئے جہاں اس نے قیام کرنا تھا۔ اس کمرے میں ٹی وی، ریڈیو، ویڈیو اور ٹیلی فون سمیت دنیا کی ہر آسائش موجود تھی۔ کمرے سے ملحقہ ہاتھ روم کی طرف کیرن نے راہنمائی کر دی تھی اور کمرے کی الماری میں اس کے لئے سلپنگ سوٹ موجود تھا۔

”تم آرام کرو۔ سفر خاصا تھکا دینے والا تھا۔ رات کو کھانے پر ملاقات ہوگی۔ میں تمہارے دوست کو لینے جا رہا ہوں۔ کیرن تمہاری میزبانی کرے گی۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو اسے بے تکلف بتا دینا۔ یہاں انڈین مسلمانوں کے ہوٹل اور دکانیں موجود ہیں۔ سب کچھ مل سکتا ہے۔“ مارٹن یہ کہہ کر چلا گیا۔

ارسلان اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ آخراں اس کا کون سا ”دوست“ ہے جسے وہ لینے جا

O

میرا دل جس نے عرض کیا ہے میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی کا ایک لمحہ بھی تم سے جدا نہ ہو۔

لے لی تھی کہ اس نے طویل اگواں کی اور پھر خود کو غارت و مہر کے لئے قائل و شاکل بنا لیا۔

جہاز ہمارے سر پر آگرے اور ہم سب مرجائیں۔“

بہاول خان کا بات کرنے کا انداز ایسا تھا کہ بات ارسلان کو اپنے دل میں اتنی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اس تھوڑے عرصے میں مغربی زندگی کے ایسے ایسے کمالات کا نظارہ کر لیا تھا کہ اب اس کا دل ”ناں“ کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ اس بات میں کوئی شک بھی نہیں کہ وہاں اپنے ملک میں بھی اس کی زندگی اتنی ہی غیر محفوظ تھی جتنی آج یہاں ہے۔ وہاں بھی جانے کس لمحے کسی سمت سے اندھی گولی آئے اور اس کے سانسوں کا تانا بانا بکھیر کر رکھ دے۔

”میں یہاں اپنا اکاؤنٹ کھولنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے بہاول خان

سے کہا۔

”ویل ڈن.....! سمجھدار آدمی ہو۔ آگے نکلو گے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ارسلان

کی پیٹھ تھپک دی۔

کیرن نے دو تین مرتبہ جوس تیار کر کے ان کے سامنے رکھا تھا اور اب وہ اگلے حکم کی منتظر کھڑی تھی۔

”یہاں راتیں دن کی طرح جاگتی ہیں۔ جاؤ اور زندگی کے مزے لوٹو۔ اب شاید ہماری ملاقات دیر بعد ہو یا بہت جلدی، لیکن ایک بات اپنے ذہن سے کبھی نہ اتارنا کہ ہم دونوں آپس میں کبھی نہیں ملے۔ اگر کبھی اپنے ملک کی کسی محفل میں ہمارا آنا سامنا ہو جائے تو ہم دونوں اتنے ہی اجنبی ہوں گے جتنے اب سے چند روز پہلے تک..... جتنے دن چاہو موج میلہ کرو۔ اس کے بعد کیرن تمہاری میزبان ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔ تمہارا اکاؤنٹ بھی کیرن صبح کھلوا دے گی۔ برطانیہ کے خوبصورت علاقوں کی سیر کرو۔ یہاں کے سسٹم کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ خدا حافظ۔“ اس نے اچانک کھڑے ہو کر اس سے گرجوشی سے ہاتھ ملایا اور اس کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

مارٹن اس کے تعاقب میں ارسلان سے ہاتھ ملا کر دوبارہ ملاقات کی خواہش کر کے باہر نکلا اور پھر دونوں کار میں بیٹھ کر نامعلوم منزل کی طرف چل دیئے۔

○

کیرن اسے دوسری کار میں باہر لے آئی.....!

ہو۔ اس محنت کا انعام تمہیں دو لاکھ کی صورت میں ملے گا۔ تمہارے دیگر تمام اخراجات بھی ہمارے ذمے رہے۔ یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ تم روپیہ کس کرنسی میں اور کہاں لینا چاہتے ہو۔ اگر یہاں اکاؤنٹ کھولنے کا ارادہ ہے تو یہاں لے لو۔ اگر پاکستان میں کسی جگہ چاہئیں تو وہاں مل جائیں گے۔“

”لیکن میں نے کوئی پھیرا.....“ ارسلان طلسم ہوشربا میں پھنس گیا تھا۔

”اپنا بیگ لے آؤ۔“ بہاول خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ارسلان کسی بحرزدہ معمول کی طرح اٹھا اور کمرے سے اپنا بیگ لے آیا۔

”اسے کھول کر اچھی طرح دیکھو۔ اس میں کیا ہے؟“ بہاول خان نے کہا۔

”کچھ نہیں! میں نے خود چیکنگ کی تھی۔“ ارسلان بولا۔

”پھر بھی احتیاطاً دوبارہ دیکھ لو۔“

دوبارہ اس نے سارے کپڑے نکال کر دیکھے۔ اندر اور کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی خفیہ جیب نظر آ رہی تھی۔ ارسلان حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”مسٹر مارٹن!“ بہاول خان نے مارٹن کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا جو ارسلان کی حالت سے مسکراتے ہوئے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

○

مارٹن نے میز پر پھلوں کے نزدیک رکھا چاقو اٹھایا اور بیگ کو نچلے حصے سے کاٹنا شروع کیا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سفید رنگ کی دس تھیلیاں موجود تھیں۔ ارسلان حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسے لاعلم رکھ کر استعمال کیا گیا تھا۔ اس صورت حال نے اسے گڑبڑا کر رکھ دیا تھا، لیکن یہاں وہ خفی جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

”میں اصل میں تمہیں یہی سمجھانا چاہتا تھا کہ تدبیر اور تقدیر دونوں مل جائیں تو بہت سے لائیکل مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ اب تم خود کتنے مراحل سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہو، لیکن تمہارا مال محفوظ رہا۔ اس کی وجہ جاننے ہو کیا تھی؟ مسٹر ارسلان انسان تجربے سے سیکھتا ہے۔ اگر اس دھندے سے لگے رہو گے تو تمہیں خود بہت سی باتوں کا علم ہو جائے گا۔ جہاں تک خطرے والی بات کا تعلق ہے تو تم جانو کہ خطرات کب زندگی کا حصہ نہیں رہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ابھی کوئی

گھر کی چائیاں اس کے پاس تھیں اور وہ ارسلان کو ”لندن“ دکھانے لے جا رہی تھی۔ شاید اس کی تنخواہ ہی میزبانوں کا دل بہلانے کی ملتی تھی۔ کاراس نے ایک ”پب“ (شراب خانہ) کے سامنے روکی اور دونوں اندر داخل ہو گئے۔

نشے میں مدہوش عورتیں اور مرد دنیا و مافیہا سے بے نیاز شغل سے نوشی میں مصروف تھے۔ کسی نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ یہاں مختلف قسم کی شرابوں کا سمندر بہہ رہا تھا۔ ارسلان کے کہنے پر کیرن نے ہی اس کے لئے جام منتخب کیا اور صرف ایک ایک جام اپنے حلق میں انڈیل کر دہا ہر چلے آئے۔

شراب خانے سے ایک انڈین ریسٹورنٹ تک کیرن نے اس کے ساتھ چپک کر سفر کیا تھا۔ وہ جتنی ہوشیار سے کار چلا رہی تھی اس سے زیادہ ہوشیاری سے اپنے سوار کو بھی کنٹرول کر رہی تھی۔ اس نے فی الوقت اعتدال کی پالیسی اپنائی ہوئی تھی اور ارسلان اپنے ہوش و حواس میں اس کا ہم سفر تھا۔

انڈین ہوٹل پر انہوں نے کھانا کھایا اور اب وہ ارسلان کو ایک ”ڈسکو“ کی طرف اڑائے لئے جا رہی تھی۔

آج ویک اینڈ تھا اور ڈسکو میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہال کمرے میں گھستے ہی شراب اور سگریٹوں کے دھوئیں نے ان کا استقبال کیا۔ ارسلان کے دل کی دھڑکن اس ماحول میں تیز ہونے لگی تھی۔

”واقعی دنیا یہی ہے۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

یہی تھی وہ دنیا جو نجمہ ملک اسے دکھا کر پھنسانا چاہتی تھی اور وہ اس دنیا کی دلدل میں گہرا اترتا چلا جا رہا تھا۔

ارسلان یہ بھول چکا تھا کہ عشق و محبت کے اس طلسم ہوشربا کو آنے والے راستے تو بے شمار ہیں واپس جانے کا دروازہ کسی پر نہیں کھلتا۔

لیکن.....!

اس نے واپسی کے متعلق سوچا ہی کب تھا؟

وہ تو اس عالم رنگ و بو میں آگے اور آگے..... بہت آگے نکل جاتا چاہتا تھا۔

رات ایک پہر بیت رہی تھی جب وہ کیرن کے وجود کا حصہ بنا گھر تک پہنچا۔ اب اسے کیرن سے کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کیرن بھی اب اس کے نزدیک عارفہ اور نازنین جیسی ہی کوئی لڑکی بن چکی تھی۔ ایسی درجنوں لڑکیوں سے اس کا سابقہ زندگی میں رہتا تھا۔

اس نے جان لیا تھا کہ عورت خواہ اس کا تعلق کسی بھی رنگ و نسل اور ملک و قبیلے سے ہو مرد کے لئے بلا آخر عورت بن کر رہ جاتی ہے اور وہ اپنے حسب نسب کی پہچان سے نہیں بلکہ اپنے جسم کی پہچان سے جانی جاتی ہے۔

رات دونوں نے ایک ہی خواب گاہ میں بسر کی۔ مغربی اطوار میں ڈھلی کیرن نے اسے سرور و نشاط کے ایسے ان دیکھے جہاں کی سیر کروائی کہ وہ دنگ رہ گیا۔

یہ سب اس کے لئے نیا لیکن زندگی کا سب سے خوبصورت تجربہ تھا۔ کیرن اس کی نس نس میں نشے کی طرح اتر گئی تھی۔

صبح دیر گئے تک دونوں اپنی جسمانی حالت سے بے نیاز مدہوشی کی نیند سوتے رہے۔ شاید ان لوگوں کی صبح کا آغاز ہی دوپہر سے ہوتا تھا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو کیرن اپنے جسم سے تولیہ باندھے ہاتھ روم سے باہر آ رہی تھی۔ ارسلان کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چپک گئی۔

صبح بخیر کہتے ہوئے اس نے رات خدمت میں کوئی کمی رہنے پر معافی مانگی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

ارسلان جب نہا کر باہر نکلا تو وہ ہونٹوں سے سگریٹ لگائے چائے سمیت اس کی منتظر تھی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں ناشتے کی میز پر موجود تھے۔ ناشتہ کیرن نے مشرقی انداز میں بنایا تھا۔ اس نے ناشتے کی میز پر ہی ارسلان سے اس کی اپنی مرضی کی کوئی جگہ دیکھنے کے متعلق پوچھا۔ ارسلان کے لئے فی الوقت کیرن کے وجود سے زیادہ اور کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے جب جواب دیا تو کیرن بے ساختہ تہقہ لگا کر ہنس دی۔

”اگر مجھے ہی دیکھتے رہے تو بور ہو جاؤ گے۔ پھر میں کہاں بھاگی جا رہی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ٹیلی فون پر ہی دو تین جگہ نمبر گھما کر کچھ ریزرویشن کروائی اور تھوڑی دیر بعد وہ کار پر

لندن جا رہے تھے۔

ایک ہفتے میں اس نے ارسلان کو ایسے ایسے جہانوں کی سیر کروائی کہ اب رہ رہ کر اس کے دل میں یہاں بس جانے کی خواہش مچنے لگی۔ اس کا بینک اکاؤنٹ لندن میں کھل گیا تھا۔ قریباً ہر روز اس کی فون پر نجمہ ملک سے بات ہوتی تھی جو اس کے جذبہ شیطانیت کو مزید ہمیز لگاتی رہتی تھی۔

اس نے ارسلان کے اندر موجود تمام بشری کمزوریوں کو اس ڈھنگ سے ایکسپلاٹ کیا تھا کہ ارسلان جکڑا جا چکا تھا۔ ہر نئی فون کال پر وہ اس کے ضمیر کے گرد ہوس کی ایک مضبوط گرہ لگاتی چلی جا رہی تھی۔



سانپ کے منہ میں چھپکلی

اس نے لندن ہی سے فون کر کے رضوی صاحب کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ اچانک ہی یہاں آ گیا ہے اور ان سے ششما کے لئے ہدایات طلب کی تھیں۔

رضوی صاحب نے اس ”خوشگوار سر پرائز“ پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فی الوقت ششما سے صرف ملاقات کرنے پر اکتفا کی ہدایت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ وقت کی کمی کا بہانہ کر کے وہ جلدی جان چھڑا سکتا ہے۔ انہوں نے یہ بات اس کی صوابدید پر چھوڑ دی تھی کہ اگر وہ پسند کرتا تو فی الوقت اس سے نہ ملے۔

”نہیں جناب۔ اب میں آیا ہوں تو ملاقات نہ کرنا زیادتی ہوگی۔“ اس نے فون پر ہی ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”او کے گڈ لک۔ جس روز واپسی کا پروگرام ہو، اطلاع کر دینا۔ کوئی دوست تمہیں ایئر پورٹ پر ریسیو کر لے گا۔“

”تھینک یوسر!“

اس نے کیرن سے تین چار روز بعد ایک دن اکیلے گھومنے کی اجازت لے لی تھی۔ اس طرح وہ خود یہاں کے اسرار و رموز سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔

کیرن نے اس کی خواہش کا احترام کیا تھا اور اسے لندن کا نقشہ تھماتے ہوئے شام آٹھ بجے پکاڈلی اسٹیشن پر اس جگہ پہنچنے کے لئے کہا تھا جہاں اس نے ارسلان کو چھوڑا تھا۔

کیرن سے الگ ہوتے ہی اس نے فون باکس سے ششما کے نمبر گھمانے شروع کر دیئے۔ دوسرے نمبر پر وہ مل گئی۔ ارسلان کی اس طرح اچانک آمد نے اسے حیرت زدہ کر دیا تھا۔

”کہاں سے بول رہے ہو؟“

جواب میں ارسلان نے وہ جگہ بتائی اور قریباً آدھ گھنٹہ بعد ششما بھٹ چار یہ وہاں موجود تھی۔

”ویل کم!“ اس نے ارسلان کے گلے کا ہار بننے ہوئے کہا۔

اپنی کار میں وہ ارسلان کو نزدیکی ہی ایک ریسٹورنٹ کی طرف اڑائے لئے جاری تھی۔ راستے میں ارسلان نے اسے اچانک اطلاع دینے پر معذرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسے اچانک ملک صاحب کے خاص کام سے یہاں پانچ روز کے لئے آنا پڑا اور وہ پرسوں ہی واپس جا رہا ہے، لیکن بہت جلدی واپس آئے گا۔ پھر اس سے تفصیلی مذاکرات ہوں گے۔

اس اچانک اور انتہائی مختصر شیڈول پر ششما نے زبردست احتجاج کیا لیکن کسی نہ کسی طرح ارسلان نے اسے مطمئن کر لیا۔ ششما نے وہیں سے فون کر کے کسی کو اپنے شام تک لوٹنے کی اطلاع دی تھی اور کہا تھا کہ ایک دوست پاکستان سے اچانک اور انتہائی مختصر ملاقات کے لئے آیا ہے۔

شام تک کا وقت انہوں نے اکٹھے گزارا۔

اس دوران وہ مختلف جگہ گھومتے اور آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ششما بھٹ چار یہ نے اس درمیان اپنی دانست میں رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ اس نے سب سے پہلے ارسلان سے اپنی ایشیائی نوجوان تنظیم کا فارم رکینٹ بھروایا۔ پھر اسے پاکستان میں دفتر کھولنے کی ہدایت کی۔

ایک جگہ وہ دوپہر کے بعد جب کھانا کھا رہے تھے تو اچانک ششما کا ایک واقف کار ان سے ٹکرا گیا۔ ششما نے اس کا تعارف کر پلائی کے نام سے ارسلان سے کروایا اور اسے اپنی تنظیم کا وائس پریذیڈنٹ بتایا تھا۔

ارسلان اندازہ کر سکتا تھا کہ اس نوجوان کی آمد اچانک نہیں بلکہ طے شدہ ہے کیونکہ اس درمیان مختلف بہانوں سے ششما نے چار پانچ مرتبہ مختلف جگہ فون کئے تھے۔

اس نے اس درمیان کئی جگہ اپنی اور ارسلان کی اکٹھے تصویریں بھی اتاری تھیں۔

ارسلان اندازہ کر سکتا تھا کہ یہ تصویریں کیوں اتاری جا رہی ہیں؟

یقیناً یہ ریکارڈ میں جمع ہونی تھیں۔

شام تک ششما اسے اپنی دانست میں پاکستان سے متفرک چکی تھی اور اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ اب یہ ”پنھا“ ان کے گھناؤ نے مقاصد کی بجائے آوری میں ان کا معاون ثابت ہوگا۔

اس نے ارسلان کے ناں ناں کرتے بھی لندن کے بہت بڑے ستور سے اس کے لئے اچھی خاصی شاپنگ کر لی تھی۔

ایک طویل بوسے اور جلد ملاقات کی یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد اس نے آٹھ بجے شام اسے پکاڈلی اسٹیشن پر ڈراپ کر دیا تھا۔ وہ ایئر پورٹ پر رخصت کرنے کی شدید خواہش مند تھی۔ ارسلان نے اسے اپنی فلائٹ کی روانگی سے آگاہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

کیرن اس کی منتظر تھی.....!

ایک مرتبہ پھر وہ کیرن کی میزبانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دونوں سیدھے لیوٹن آئے تھے۔ باقی وقت انہوں نے اکٹھے گزارا۔ کیرن نے اسے رات کا کھانا گھر سے باہر کھانے کی پیشکش کی تھی لیکن اس نے کیرن کی صحبت سے لطف اندوز ہونا زیادہ ضروری سمجھا۔

اگلا سارا دن اس نے پھر کیرن کے ساتھ آوارہ گردی کی نذر کر دیا۔ نجمہ ملک نے اسے بتایا تھا کہ دوسرے مختار اس باقی اس کے لئے بندہ بھیج چکی ہے اور دو تین فون بھی اس نے کئے ہیں۔

اس نے ارسلان کو بتایا تھا کہ اب وہ واپس آ کر ذرا اسے سنبھالے۔ کہیں وہ کنٹرول سے باہر ہو کر کوئی غلط قدم نہ اٹھالے۔

یوں بھی وہ ملک کے اعتماد کو مجروح کر کے اپنے مستقبل کو داؤ پر نہیں لگانا چاہتا تھا۔

دوسرے دن رات کی فلائٹ سے وہ پاکستان واپس جا رہا تھا۔

کیرن سے اس نے لیوٹن میں ہی علیحدگی اختیار کر لی تھی اور ایئر پورٹ تک مسٹر مارٹن اسے چھوڑنے آیا تھا۔ اس نے مسٹر مارٹن کو باہر ہی سے رخصت کر دیا تھا اور سیدھا ٹرینل پر چلا گیا

جہاں ششما بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔

جہاز میں چپک ان کرنے تک وہ اس سے چپکی رہی۔ پھر خاصے جذباتی انداز میں اس نے ارسلان کو رخصت کیا۔

پاکستان میں ایئرپورٹ پر رضوی صاحب کا ایک بندہ پہلے سے اس کا منتظر تھا۔ اس نے جہاز سے ہی اسے ”ریسیو“ کر لیا اور جیسے ہی اس کا سامان بیلٹ پر آیا میزبان دوست اسے باہر لے آیا۔ صرف اس کے پاسپورٹ پر اندراج ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کسی کاؤنٹر پر کسی نے اس سے کچھ دریافت کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔

○

ایئرپورٹ کے باہر نجمہ بیگم اس کی منتظر تھی۔

وہ خود جیب ڈرائیو کرتی یہاں تک آئی تھی۔ بڑی گہری مسکراہٹ کے ساتھ اس نے ارسلان کو خوش آمدید کہا تھا۔ واپسی پر بھی جیب وہ خود ہی چلا رہی تھی۔

”کیسا ہارٹ ہے؟“ اس نے نکھکیوں سے ارسلان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”بہت اچھا“ لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ نے مجھے اعتماد میں لینا کیوں ضروری نہیں سمجھا۔ اس طرح بے خبری میں تو کچھ بھی ہو سکتا تھا.....“ اس نے دبی زبان میں گلہ کرتے ہوئے اپنے جذبات کے اظہار کی تلاش کی.....!

”ارسلان! اگر میں یہ کہوں کہ تم ابھی بچے ہو تو برا مت ماننا۔ گوکہ میری اور تمہاری عمر میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے لیکن تجربے کی بنیاد پر میں کہہ سکتی ہوں کہ میں تمہاری بزرگ ہوں۔ میں نے زندگی سے جو کچھ حاصل کیا اس کے لئے مجھے بہت کچھ قربان کرنا پڑا اور اس قربانی کے عوض جو تجربات مجھ تک منتقل ہوئے ہیں وہ سب بہت ایمانداری سے تم تک منتقل کر رہی ہوں کیونکہ ہم بزنس پارٹنر ہیں اور کبھی کبھی یہ بزنس کی پارٹنرشپ اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ لائف پارٹنرشپ اس کے سامنے پیچ دکھائی دیتی ہے..... تمہارے سوال کا مختصر جواب تو یہی ہے کہ اگر میں تمہیں باخبر کر دیتی تو اور کچھ ہو جاتا تو بھی تمہارا رد عمل کچھ بہتر نہ ہوتا اور اگر بے خبری میں کچھ ہوتا تو بھی تمہارا رد عمل مختلف نہ ہوتا۔ ایک بات تو طے شدہ ہے کہ تم مجھے کبھی انکار نہ کرتے۔ اس کا خدا نخواستہ یہ مطلب نہیں کہ ایسا تم کسی دباؤ کے تحت کر رہے ہو بلکہ آپس کے اعتماد کی بات ہے۔ دراصل میں

تمہیں ایک تجربے سے گزارنا چاہتی تھی۔ میں تم پر ثابت کرنا چاہتی تھی کہ اگر انسان پر اعتماد ہو تو کمپیوٹر بھی اندھا ہو جاتا ہے۔ چونکہ تمہارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ تم کوئی مشتبہ شے اپنے ہمراہ لے جا رہے ہو۔ سو تم پر اعتماد اور مطمئن تھے لیکن پہلے ہی چکر پر اگر تم گھبرا جاتے تو ضرور کوئی ایسی الٹی سیدھی حرکت کر دیتے جس سے تم مشتبہ ٹھہرتے اور پکڑے جاتے۔ اب ایک کامیاب چکر لگانے کے بعد تم باخبر ہو کر بھی جاؤ گے تو اعتماد سے جاؤ گے۔“

وہ اچانک ہی موڑ کاٹتے ہوئے اس کی طرف جھک کر مسکرائی اور ارسلان نے گدھوں کی طرح دانت نکال کر اس کی فلسفیانہ موشگافیوں پر صا د کیا۔

”ملک صاحب کا کیا حال ہے؟“ اس نے موضوع بدلنا چاہا۔

”وہی ہمیشہ والا۔ بدست گھوڑے کی طرح ہوا کے زور پر اڑ رہا ہے۔ آج کل دارالحکومت کے چکر کچھ زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ انتخابات کے لئے جوڑ توڑ ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔ اپنا پریشر گروپ مضبوط کر رہا ہے..... بے چارہ ملک!“

اس نے طنزیہ لہجے میں مسکراتے ہوئے ارسلان کی طرف دیکھا اور ارسلان کو جواب میں وہی حرکت دہرائی۔

”میری لندن روانگی کا تو انہیں علم ہو گا ہی.....؟“

”ہاں کیوں نہیں بہت خوش ہے وہ کہ پٹھاپورپ کی سیر کر رہا ہے۔ اس کا جال تم پر مزید مضبوط ہو رہا ہے۔ ہاں ایک چکر اس طوائف کے کوٹھے کا بھی لگا لیتا۔ تمہاری جدائی نے بے چاری کو خاصا پریشان کر رکھا ہے اور اسے سمجھا دینا کہ تمہارے بعد یہاں کوئی فون نہ کیا کرے۔ اس کی لگا میں ابھی سے کھینچ دینا“ اس سے پہلے کہ گھوڑی بے قابو ہو جائے.....!“ نجمہ ملک نے جیب کوٹھی کے برآمدے کے سامنے پارک کرتے ہوئے کہا۔

دونوں اکٹھے ڈرائنگ روم میں آ گئے تھے۔

مؤدب ملازم ان کے تعاقب میں ارسلان کا سامان اٹھائے چلا آ رہا تھا جو وہ لندن سے بھرے ہوئے اٹیچی کیس اپنے ہمراہ لایا تھا۔

ڈرائنگ روم کے آرام دہ صوفے میں دھستے ہوئے اس نے نجمہ بیگم کی خواہش پر تمام واقعات بلا کم و کاست بیان کر دیئے تھے۔ ششما کا ذکر وہ گول کر گیا۔ یوں بھی یہ نجمہ بیگم کی پسند کا

مضمون نہیں تھا۔

جیسے جیسے وہ آپ بیتی سنارہا تھا، نجمہ بیگم کی آنکھوں کی چمک بڑھ رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے والے صوفے میں دھنسی سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے فضا میں بکھیر رہی تھی۔

”ٹھیک ہے تم آرام کرو۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ اب مقامی سیاست سے آہستہ آہستہ کنارہ کشی کرو اور ”انٹرنیشنل پالیٹکس“ کی طرف توجہ بڑھاؤ۔“ اس نے انٹرنیشنل پالیٹکس کے الفاظ کہتے ہوئے ارسلان کی طرف دیکھ کر اپنی آنکھ بھی دبا دی تھی۔

ارسلان حسب سابق مسکرا کر رہ گیا۔

○

مختارال کو جب استاد جی نے باؤ ارسلان کی آمد کی خبر دی تو اس کے نحوست زدہ چہرے پر سرخیاں ناچنے لگیں۔ گزشتہ ایک ہفتے سے وہ ہر روز کسی نئی ذلت کا سامنا کر رہی تھی۔ وہ کوٹھا جس پر رونقیں عاشق تھیں، آج کسی اجاڑ خانقاہ کا منظر پیش کر رہا تھا جس کی مختاراں بائی مجاور بن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ابھی تک براہ راست ملک صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی جرأت نہیں کی تھی اور ارسلان کی شدت سے منتظر تھی کیونکہ ارسلان کی طرف سے ایڈوانس کے بعد سے اسے ایک پھوٹی کوڑی بھی ابھی تک نہیں ملی تھی۔

استاد جی کے منہ سے باؤ ارسلان کا نام سن کر بستر سے کہنی کے بل لیٹی نازنین نے اچانک اسی طرح اٹھ کر استاد کی طرف دیکھا جیسے پلنگ میں لگے کسی سپرنگ نے اسے فضا میں اچھال دیا ہو۔

”ذرا سنبھل کے۔“ ہوشیار نائیک نے اپنے ”مستقبل“ کو آنکھ کے اشارے سے سمجھایا۔

دوسرے ہی لمحے وہ پلنگ پر اس طرح دراز ہو گئی جیسے صدیوں کی بیمار لیٹی ہو اور ارسلان کے کمرے میں داخل ہونے تک اسی پوزیشن میں لیٹی رہی۔

”واہ باؤ! ارسلان! تو نے ہمارے ساتھ اچھی نبھائی۔ چپ چاپ کام کروا کے کھسک گئے۔ ہماری خبر تک نہ لی۔ نہ جاتے ہوئے بتایا۔“ مختاراں نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی

شکایتوں کا پٹارہ کھول دیا۔

”بی بی بس چپ ہی بھلی۔۔۔۔۔ جس پر گزرے وہی جانتا ہے بی بی۔۔۔۔۔!“ ارسلان نے نازنین کے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے اس کی خیریت دریافت کی۔

بی بی کو سمجھ نہیں آ رہی کہ یہ ارسلان باؤ نے کیا کہہ دیا؟ اس سے پہلے کہ وہ وضاحت طلب کرتی ارسلان کی طرف سے نازنین کے احوال دریافت کرنے پر وہ پھر پھٹ پڑی۔

”ارسلان باؤ! تمہیں کیا پروا اس بے چاری کی۔ بس یہ سمجھو کہ مرتے مرتے بچی ہے۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ ڈاکٹر کام کامل گیا۔ اس نے تمہاری اچانک گمشدگی کو اپنی جان کا روگ بنا رکھا ہے۔۔۔۔۔ میاں! تین دن سے اس حالت میں لیٹی ہے اور کوٹھا بند ہے۔ کچھ خبر بھی ہے تمہیں۔۔۔۔۔؟“ اس نے ارسلان پر احساس کا بوجھ ڈالنا چاہا۔

اس اثناء میں نازنین اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ چہرے سے واقعی بیمار ظاہر ہو رہی تھی اور ارسلان دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد وہ جو خبر مختاراں کو سنانے جا رہا ہے اس کے بعد تو واقعی ماں بیٹی کا یہی حال ہونے والا تھا جس کی وہ ایکٹنگ کر رہی تھیں۔

”شکر ہے خدا کا میری بچی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو آئی۔“ اس نے نازنین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ذرا چائے پانی کا بندوبست تو کر لوں۔“

یہ کہہ کر ہوشیار نائیک باہر آ گئی۔ اب وہ اپنی ہونہار صاحبزادی کو خنجر آزمائی کے لئے اکیلے چھوڑ آئی تھی اور ماں کے جاتے ہی بیٹی نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے تھے۔ اس نے حسب تربیت ناز و ادا سے ارسلان کو برا بھینٹہ کرنے کی کوشش کی۔ پھر خنجر دکھانے اور اٹھانے شروع کر دیے لیکن آج تو وہ پریشان ہی ہو گئی جب اس نے دیکھا کہ ارسلان ابھی تک ”نارمل“ ہی ہے۔۔۔۔۔ یہ اس کے لئے چونکا دینے والی بات تھی۔

اس سے پہلے کہ صورت حال کی سمجھا سے آتی۔ مختاراں بائی نے گلاسوں میں بوتلیں اٹھ کر برف کی ذیلیوں سمیت اس کے سامنے رکھ دیں۔ اس نے نازنین کو آنکھ کے اشارے سے باہر جانے کی تلقین کی تھی کیونکہ باؤ ارسلان سے بزنس کی بات کر سکے۔ اسے یقین تھا کہ اتنے عرصے میں ہی اس کی بیٹی نے باؤ ارسلان کو آٹے دال کا بھاؤ بتا دیا ہوگا۔

”ارسلان بیٹا! تم نے کچھ ہی کر دی۔ ایک تو میں نے اپنی خاندانی روایات کا ستیاناس

کرتے ہوئے اس بوڑھے بھیڑیے کے سامنے اپنی پھول سی پچی کو صرف تمہارے کہنے پر پھینک دیا اور دوسرے تم اچانک غائب ہو گئے۔ کم از کم رقم تو فوراً پہنچا کر جاتے۔ وہ تمہارا ملک..... وہ تو درندہ تھا درندہ۔ میری بیٹی ابھی تک بیمار ہے۔ ساری زندگی میں اس کے سامنے آنکھیں اٹھا کر بات کرنے کے قابل نہیں رہی..... اور تم ہو کہ..... خیر چھوڑو ان باتوں کو لاؤ رقم نکالو۔“

اس نے ارسلان کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”بی بی! میں نے تو سوچا تھا کہ چلو کچھ میرا بھی بن جائے گا اور تمہارا بھی بھلا ہو جائے گا، لیکن تقدیر کے آگے تدبیر بھی نہیں چلتی۔“ ارسلان نے مردہ سے لہجے میں کہا۔

”کک..... کیا مطلب ہے تمہارا؟“ مختار اس بانی کے ہاتھ سے گلاس گرتے گرتے بچا تھا۔ اس نے بشکل منہ میں رکھی ٹھنڈی سیون اپ کا گھونٹ حلق میں اٹھایا اور گلاس میز پر رکھ کر اس کی طرف گھورنے لگی۔

”دراصل بی بی! کوئی تیسرا ہم کو داؤ لگا گیا.....!“ ارسلان نے کہا۔

”دیکھو ارسلان بیٹا! ہم کبھی لوگ ہیں۔ ہم زمانے کو چارتے ہیں۔ ابھی ہمیں چارنے والا کوئی مائی کالا پیدا نہیں ہوا۔ میرے ساتھ کوئی چکر والی بات نہ کرنا۔ میں سیدھی عورت ہوں لیکن اتنی سیدھی بھی نہیں۔ ہاں! یہ تمہیں پہلے سے بتا دوں۔“ مختار اس کا بلڈ پریشر گفتگو کے آغاز ہی پر بڑھنے لگا تھا۔

”دیکھو بی بی! میں نے آج تک تم سے کبھی ہیرا پھیری کی بات نہیں کی۔ ٹھیک ہے تم طوائف ہو لیکن طوائفوں والی زبان میں مجھ سے گفتگو نہ کرنا۔ کسی سالے کا لے کر نہیں کھاتا کہ کسی کی دھونس میں آؤں گا۔ آج تک تمہارا بھلا ہی کیا ہے۔ تمہارے بڑے بڑے کام کروائے ہیں میں نے..... اور آج بھی تم اس بازار میں میری ہی وجہ سے سر اٹھا کر چل رہی ہو۔ تمہانے والوں کو بھٹک بھی پڑ گئی کہ ملک صاحب نے تمہارے سر پر سے ہاتھ اٹھالیا ہے تو تمہاری بیٹی کی ہڈیاں چبا جائیں گے۔ تم جانتی ہو کہ تمہارے کہنے پر میں نے دو تمہانے داروں کو یہاں سے ذلیل کر دیا کہ نکلوا یا ہے۔“

ارسلان نے بھی مختار اس کے نہلے پر دہلا مارا تھا..... اس بد لے ہوئے روپ نے مختار اس کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے۔ وہ بھی بڑی خراٹ کھینچ رہی تھی۔ کیا مجال جو اس نے

اپنے دلی جذبات کا معمولی عکس بھی چہرے پر باقی رہنے دیا ہو۔

”ارسلان باؤ! تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ ہم نے تو تمہیں ہمیشہ اپنا بچہ سمجھا ہے۔ تم جانتے ہو میں نے بھی نازنین کو تمہائی میں کسی تماش بین کے نزدیک نہیں پھٹکنے دیا اور تم.....“

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اب ارسلان کو اپنے احساسات کا احساس دلانا چاہا تھا۔

”خیر۔ میری بات سنو اور زیادہ جذباتی بننے کی کوشش نہ کرو۔ بی بی! یہ کام میں نے

تیسری پارٹی کے کہنے پر کیا تھا ورنہ میرا دماغ تو خراب نہیں تھا کہ اتنا خطرناک کام اور وہ بھی ملک صاحب کے خلاف کرواتا۔ وہ تو میری ہڈیوں سے کھال اتار کر کتوں کے سامنے ڈلواسکتا ہے۔

اچھی خاصی رقم کی امید تھی لیکن جب میں نے ان لوگوں سے بقیہ کا تقاضا کیا تو وہ حرام خور الٹا مجھے ہی دھمکیاں دینے لگے۔ بی بی یہ سیاست دان لوگ تو ہمارے بھی ”گرو“ نکلے۔ مجھے انہوں نے

گالیاں دیتے ہوئے گھر سے نکال دیا اور دھمکی بھی دی کہ اگر آئندہ کبھی اس مسئلے پر بات بھی کی تو میرا اور تمہارا وہ حشر کروائیں گے کہ ایک زمانہ عبرت حاصل کرے گا۔ میں تو چکر کر رہ گیا۔ ایک تو

اپنے مالک سے احسان فراموشی کی اور دوسری طرف سے جوتے بھی پڑے۔ بی بی! ہماری قسمت ہی بری ہے۔ بس صبر شکر کر لو۔ ان لوگوں نے کہا ہے کہ تمہانے کچھری کا کام کروا دیا کریں گے لیکن

اگر بھولے سے بھی اس بات کا تذکرہ کسی سے کر دیا تو پھر لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

مختار اس بانی کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔

اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا۔ بشکل اس نے سیون اپ کے دو گھونٹ حلق میں اٹھال کر اپنی حالت سنبھالی۔

”بیٹا! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم کہیں.....؟“

”بی بی! قسم لے لو اگر میں جھوٹ بولوں۔ میں خود بری طرح پھنس گیا ہوں۔ ان سالوں نے ہمیں دھوکے میں رکھ کر استعمال کیا ہے۔ اب اگر ہم میں سے کسی نے ان کے سامنے

چوں چراں کی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے کہ اپنے اس احسان کے بدلے ان سے تمہانے کچھری کا کام کروا لیا کریں۔ اس طرح شاید ہمارا نقصان پورا ہو جائے۔“

یہاں ہر دوسرے گھر پر ایک دو مقدمے بنے ہوئے ہیں باقی تمہاری مرضی۔ ہاں یہ رکھ لو۔ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اپنے پاس سے دے رہا ہوں۔ یہ تو میرا مولا ہی جانتا ہے کہ میں نے کتنے گھائے کا

سودا کیا۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹونا نکالا اور ہزار ہزار کے پانچ نوٹ گن کر مختاراں بائی کو تھما دیئے۔

○

لاکھوں کی آس مند مختاراں بائی نے نیم مردہ بازو اس کی طرف بڑھا دیا اور لرزے ہاتھ سے نوٹ پکڑ کر اپنے گریبان میں اڑے ہوئے میں ڈال کر اسے واپس اپنی جگہ رکھ لیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ دل کو روئے یا جگر کو پیٹے۔ جس طرح وہ لٹی تھی کتنے بادشاہوں کو فقیر کیا تھا اس نے۔ ساری زندگی میں اس نے فتح مندیاں حاصل کی تھیں۔ اب عمر کے اس حصے میں ایک ہی شکست نے اسے اوندھے منہ زمین بوس کر دیا تھا۔ اسے اپنے ہاتھوں پیردوں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ رہ رہ کر اس وقت کا ماتم کر رہی تھی جب اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے اور وہ ارسلان کے چکر میں پھنس گئی۔

اگر ارسلان جھوٹ بھی بول رہا تھا تو وہ اس کا کیا بگاڑ لیتی؟ الٹا اس کو نقصان ہوتا۔ خربوزہ چھری پر گر تیا چھری خربوزے پر۔ اسے تو یہ خوف دامن گیر ہونے لگا تھا کہ کہیں کل کلاں یہ ارسلان باؤ ہی اسے بلیک میل نہ کرنے لگے۔

بری طرح پھنس گئی تھی مختاراں.....!

سانپ کے منہ میں چھپکلی والی بات بن گئی تھی.....!

بچھے بچھے دل سے وہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔ اب وہ اس کے سوا کیا کر سکتی تھی کہ ممبر شکر سے کڑھتی رہے یا پھر کوئی تھانے کچھری کا کیس پکڑ کر دالوں کی طرح اپنی کمیشن وصول کر لیا کرے۔ اس کا جی تو چاہتا تھا کہ ارسلان کا منہ نوج لے لیکن ایسا وہ سوچ ہی سکتی تھی۔

ادھر ادھر کی چند اٹنی سیدھی باتیں کر کے ارسلان وہاں سے رخصت ہو گیا۔ جاتے جاتے اس نے مختاراں بائی کو یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ وہ کبھی اسے ٹیلی فون نہ کیا کرے۔ ہاں اگر پولیس والے لنگک کریں تو کوئی بات نہیں۔ تب وہ اسے مطلع کر دیا کرے۔ اس نے مختاراں بائی سے کہہ دیا تھا کہ وہ ایک مرتبہ پھر تھانے والوں کو کہلوادے گا کہ اس کا خیال رکھیں۔

”کتے کا بچہ!“ اس کے رخصت ہوتے ہی مختاراں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

”حرام خور مجھے پولیس کا ٹاؤٹ بننے کا مشورہ دے رہا ہے۔ اچھا بیٹا! جس روز میری داڑھ کے نیچے آگیا ہڈیاں نہ چبالیں تو لعنت ہے میرے جنم پر بھی!“ غصے سے ہانپتے ہوئے وہ چار پائی پر ڈھیر ہو گئی۔

ڈیرے کے ملازم حیرانی پریشانی کے عالم میں بوکھلائے پھرتے تھے۔ عموماً ارسلان باؤ کی آمد پر انہیں بخشیش ملا کرتی تھی لیکن آج بے بھاؤ کی گالیاں مل رہی تھیں۔ اتنی گندی زبان بولتے انہوں نے مختاراں بائی کو کبھی نہیں سنا تھا۔



صیاد اپنے دام میں

ملک صاحب کے لئے مرکزی وزیر کی طرف سے ملاقات کی خواہش اہم اور چونکا دینے والی خبر تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ انکار کرے یا اقرار کر لے۔ اس خواہش کو وہ اب تک کئی معنی پہنا چکا تھا۔ وہ سیاسی آدمی تھا اور اسے بیک وقت دوستوں اور دشمنوں سے تعلقات پر نظر رکھنا ہوتی تھی۔ جس ملک میں وہ سیاست کا گھناؤنا کھیل کھیل رہا تھا وہاں کوئی لگے بندھے نکلے اصول و ضوابط تو تھے نہیں۔ اس بزنس کا ”کوڈ آف کنڈکٹ“ یہی تھا کہ حکومتی ایوانوں تک رسائی حاصل کر دو خواہ اس کے لئے کوئی سا طریق کار بھی اختیار کرنا پڑے۔

انتخابات کا اعلان کسی بھی دم ہوا چاہتا تھا۔

ملک نے پہلے ہی اندازہ لگایا تھا کہ ممکن ہے مرکزی پارٹی اسے کوئی بڑی ”آفر“ دینے جارہی ہو، کیونکہ اس کا اپنا پریشر گروپ بڑا مضبوط تھا اور اس بات کا علم تو ملک کے بچے بچے کو تھا کہ مرکزی پارٹی کو سب سے زیادہ مخالفت کا سامنا اگر کسی سے تھا تو وزیر اعلیٰ کی شخصیت تھی۔

اگر ملک جیسا اہم سیاسی لیڈران کے قابو میں آ جائے تو مرکزی پارٹی کی پوزیشن خاصی مضبوط ہو سکتی تھی۔ ملک نے پہلے تو یہی سوچا کہ وہ معاملات کو خود دیکھ لے۔ آخر ملاقات میں ہرج ہی کیا ہے۔ عین ممکن ہے اسے اگلا وزیر اعلیٰ ہی بنادیا جائے۔

یہی اس کا منشا تھا۔

لیکن.....!

پھر اس نے سوچا کہ آخر وہ ”فلور کر اسنگ“ کرے کیوں؟ اس کا مطلب تو پورا ہو ہی رہا تھا۔ اس صوبے میں کوئی حکومت اس کی مرضی کے خلاف نہ بن سکتی تھی نہ چل سکتی تھی..... اس کے ہاتھ میں ”سنیڈنٹ پاور“ تھی اور اس مضبوط ہتھیار کو وہ جب بھی چاہتا تھا اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا تھا۔

حالات ایسے تھے کہ اگر اس ملاقات کی معمولی سی بھٹک بھی پریس کے کان میں پڑ جاتی تو اس کا سارا سیاسی کیریئر تباہ ہو کر رہ جاتا۔

فی الوقت اس نے خاموشی ہی اختیار کرنا مناسب جانا اور جس ذریعے سے مرکزی حکومت نے اس سے رابطہ کیا تھا اس کو ملک صاحب نے معذرت کر دی۔

لیکن.....!!

دوسرے ہی روز جب اس کے فون پر ایک انتہائی ذمہ دار شخصیت نے براہ راست اس سے بات کی تو وہ چونکا۔

”ملک صاحب! آپ سیاست دان ہیں۔ حالات و واقعات کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھیے۔ اس ملاقات میں فائدہ آپ کا ہی ہے۔ جذباتی فیصلے بسا اوقات نقصان دہ بھی ہوتے ہیں۔“

آخری الفاظ مخاطب نے خاصے چبا کر ادا کئے تھے۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ آپ مجھے دھمکا رہے ہیں؟“ ملک کو غصہ آ گیا۔

”نہیں ملک صاحب میں آپ کو حالات کی سنگینی سے باخبر کر رہا ہوں۔ اطلاعاتاً عرض ہے کہ یہ دونوں مقتول لڑکوں کا کیس ہے جن کے اغوا پر آپ نے خاصی ہنگامہ آرائی کر رکھی ہے۔ سیکورٹی ایجنسی نے ان کے قتل کا سراغ لگا لیا ہے اور اس مسئلے پر گفتگو کے لئے آپ سے زیادہ ذمہ دار اور مناسب شخص اور کون ہو سکتا ہے۔“

دوسری طرف سے کہا گیا۔

ملک صاحب ایک مرتبہ چکر اکر رہ گئے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی یہ کیا معاملہ ہے اور ان

کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ مخالف نے گوکہ بڑے احترام سے یہ خبر ان تک پہنچائی تھی لیکن اس احترام کے پس پردہ موجودہ دھمکی کو ان سے زیادہ اور کون سونگھ سکتا تھا۔

اس کے لئے فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا۔

”ٹھیک ہے بھئی۔ صاحب ہم سیاسی لوگ ہیں۔ ملاقات کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔“ ملک نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

”شکر یہ ملک صاحب۔ اگر آپ کے پاس کل کوئی وقت ہو تو میں ارنج کر دوں۔ وزیر داخلہ کل آپ سے بات کریں گے۔“

”کل پانچ بجے کا وقت رکھ لو۔“ ملک صاحب نے مردہ سے لہجے میں کہا۔

”شکر یہ جناب! مجھے آپ سے یہی امید تھی۔“ کہہ کر ذمہ دار نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

فون رکھنے کے بعد ملک صاحب نے سب سے پہلے ارسلان کو طلب کیا تھا۔

”ارسلان کہاں ہے؟“ اس نے مسز ملک سے دریافت کیا جو ڈرائنگ روم میں ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔

”کسی کام سے گیا ہے۔ ایک میٹنگ کا بندوبست کرنے۔“ نجمہ بیگم نے لا پرواہی سے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”اے فوراً بلاؤ۔“ ملک صاحب کا لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا۔

”ملک صاحب! اپنے آپ میں رہا کیجئے۔ آج کل آپ کچھ زیادہ ہی لفٹ لینے لگے ہیں۔ آپ جانتے ہیں میں ڈرنے یا دبنے والی نہیں ہوں اور اب دھمکیوں اور دھونس کا وقت بھی

کبھی کا گزر چکا۔ میں آپ کے پائے کی سیاسی لیڈر ہوں۔ اس نوعیت کی دھمکیاں ہمیں نے اس وقت بھی پسند نہیں کی تھیں جب میں عام عورت تھی۔ ملک صاحب ارسلان میرا پرسل سیکرٹری ہے

اور اب بزنس پارٹنر بھی۔ آپ کو میرے ”بزنس“ کا علم تو ہو گا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ میرے بزنس کا خیال رکھیں اور اپنے بزنس کا بھی۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑے کنٹرول کے

ذریعے ٹی وی آف کر کے ملک کو قریب آڈانٹے ہوئے کہا۔

”اوہو! نجمہ بیگم.....! میں بہت پریشان ہوں۔ اس کی ضرورت ہے بہت شدت سے۔“ ملک نے ہوا کے رخ کو پچانتے ہوئے کہا۔

فی الوقت ان کے لئے حالات کے سامنے ہتھیار ڈالتے رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

”مجھے کچھ معلومات درکار ہیں۔ جیسے ہی وہ آئے میرے کمرے میں بھیج دینا۔“ اس نے زبردستی ہونٹوں پر مسکراہٹ چمکاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے لیکن اب آپ اس کو فری کر دیں۔ ہمارا کام خاصا بڑھ گیا ہے۔ میں نے اس مرتبہ انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے مجھے بھی خاصا ”ہوم ورک“ کرنا ہے۔“ اس نے ملک صاحب کو خبردار کر دیا۔

دل ہی دل میں اپنی جیتی کو ایک بڑی سی گالی نکال کر وہ اپنے کمرے میں لوٹ گیا۔

ملک بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ ہارنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

”ایک ایک سے نمٹ لوں گا۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی مونچھوں کو حسب عادت تاؤ دیا۔

○

اگلے ہی روز..... ملک کے ایک بڑے اخبار میں جس کے چیف رپورٹر کی ملک نے ”بڑی فرمائش“ پوری کرنے سے معذوری ظاہر کی تھی اس کی ذاتی زندگی کے متعلق ایک چار کالمی خبر صفحہ اول پر لگا دی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ ملک صاحب کے بیگم صاحبہ سے تعلقات خاصے کشیدہ ہیں اور کسی بھی لمحے ان دونوں کے درمیان علیحدگی ہو سکتی ہے۔ اخبار نے مسز ملک کے قریبی حلقوں کے حوالے سے یہ انکشاف بھی کر دیا تھا کہ اس کا ذاتی بزنس ملک سے باہر تک پھیلا ہوا ہے۔

اس خبر کی ایسے موقع پر اشاعت نے جب انتخابات سر پر آرہے تھے ملک صاحب کے لئے بہت سے مسائل پیدا کر دیئے تھے اور اب وہ پریس کو کم از کم اپنی بیگم کے حوالے سے کوئی خبر دینے کے تحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

سب سے پہلے ملک کو اب اس خبر کا نوٹس لینا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے دوسرے بڑے اخبار کا نمبر ملایا اور تھوڑی دیر بعد وہ اس اخبار کے سٹاف رپورٹر سے جو گفتگو تھا۔

”سیلیبی صاحب! آپ جانتے ہیں کہ ہم یاروں کے یار ہیں۔ یہ تو بڑی گھٹیا حرکت

ہوئی ناں۔ ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے اگر ہماری پجڑی اچھالیں گے تو پھر ہم سے خیر کی توقع کرنا تو بے انصافی ہے ناں سائیں۔“

”بجائے فرمایا ملک صاحب! اصل میں کالی بھیڑیں ہمارے پیشے میں بھی گھس آئی ہیں۔ یہ ذیل کر اس لوگ ہیں ملک صاحب جدھر سے زیادہ ہڈی پڑی اس طرف منہ اٹھا کر دم ہلانے لگے اور پھر ملک صاحب آپ نے بھی تو چیف رپورٹر صاحب کو زیادہ ہی سر پر چڑھا لیا ہے۔ ہمیں تو آپ نے بھلا ہی دیا تھا ملک صاحب۔“ سلیسی کو اس سے بہتر موقع کب ملنا تھا۔

واقعی ملک نے آج چھ ماہ کے بعد اس سے براہ راست بات کی تھی۔ اس سے پہلے تو اس نے کبھی چھوٹے رپورٹرز کو گھاس ڈالنا پسند نہیں کیا کرتا تھا۔ حالانکہ سلیسی اس کا سب سے پرانا نمک خوار تھا اور اس نے ملک کی شان میں قصیدے لکھ لکھ کر اسے وہاں پہنچا دیا تھا جہاں پہنچ کر ملک اپنی اوقات بھول گیا تھا۔

”سلیسی صاحب! اگر آپ بھی مجھ سے ناراض ہیں تو میں معذرت خواہ ہوں۔ آئندہ انشاء اللہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ آپ تو سائیں اپنے آدمی ہیں ناں اور گھر کے لوگوں کو بھلایا نہیں جاتا۔“ ملک نے ایک لمحے کے لئے بھی سلیسی صاحب کو ناراض کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

”ملک صاحب ہم چھوٹے لوگ ہی برے وقت میں آپ جیسے بڑے لوگوں کے کام آیا کرتے ہیں۔ حکم کیجئے۔“

”بس سائیں آپ خود سمجھدار ہیں۔ جو ہرزہ سرائی اس گھنیا شخص نے بیگم صاحبہ کے حوالے سے کی ہے۔ اس کی شاندار سی تردید کر دو۔ بیگم صاحبہ کی طرف سے بیان آنا چاہئے اور ایسا بیان آئے کہ اس کو بھی ثانی یاد آجائے۔ باقی میں خود منٹ لوں گا اور ہاں! بچوں کی مٹھائی تھوڑی دیر تک آپ کے گھر پہنچ جائے گی۔“ ملک صاحب نے مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔

”شکریہ ملک صاحب! بس آپ بے فکر ہو جائیں۔“ سلیسی کی باچھیں کھل گئیں۔ اتنی موٹی مرغی دوبارہ اس کے جال میں پھنسی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس معاملے میں کم از کم ملک صاحب ضروریاروں کے یار ہیں۔

ملک صاحب کے فون رکھنے کے بمشکل پندرہ منٹ بعد ہی اس کو گھر سے فون آ گیا تھا

کہ اس کے نام کا لفافہ بڑی خطیر رقم کے ساتھ موصول ہو گیا ہے۔

سلیسی نے فوراً ہی خبر تیار کر دی تھی۔ صوبائی لیگ اس کی ”بیٹ“ تھی اور اس نے ملک صاحب کی بیگم کی طرف سے ایک لمبا چوڑا تردیدی بیان تیار کر دیا تھا جس میں نہ صرف مخالف اخبار کی خبر کی سختی سے تردید کی گئی تھی بلکہ اسے زرد صحافت کی مثال قرار دے کر اخبار کو نوٹس بھیجنے کی بات بھی شامل کر دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ خبر کا آخری حصہ اس کے اخبار کے مالک کو جو اخبار کا مدیر بھی تھا بہت پسند آئے گا۔

○

ارسلان ملک صاحب کے سامنے موجود تھا اور اس کے ذہن میں اپنی بیگم کی یہ ”اطلاع“ گونج رہی تھی کہ اب ارسلان اس کا بزنس پارٹنر ہے اور ملک کو اپنی بیگم کے ”بزنس“ کا بخوبی علم تھا۔ اس کی ایک اور سالی اور نزدیکی رشتہ دار عورت پہلے ہی اس کی بیگم کے ”بزنس“ کی بھیٹ چڑھ چکی تھیں اور آج کل لندن کی مختلف جیلوں میں اپنے کئے کی سزا بھگت رہی تھیں۔ خیریت تو یہ گزری کہ ابھی کسی اخبار والے تک یہ بات نہیں پہنچی تھی.....!

ملک صاحب کے ساتھ پانچ سال بسر کرنے کے بعد اب نجمہ بیگم بھی اس کی بہت سی ”آف دی ریکارڈ“ باتوں کی عینی شاہد بن چکی تھی اور اگر وہ اس کے خلاف کوئی اقدام اٹھاتا تو نہ جانے وہ کیا کر گزرتی۔

اسے رہ رہ کر اس دن کا پچھتاوا ہو رہا تھا جس روز اس نے ایک گھر یلو تقریب میں سجاد خان کا تعارف اپنی بیوی سے کروا دیا تھا۔ اس نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ معمولی سی استانی خود ہی سجاد خان سے اپنی لائن سیدھی کر لے گی۔

اسے بہت دیر بعد اس حقیقت کا احساس ہوا تھا کہ دراصل اس نے نجمہ کا شکار نہیں کھلیا تھا بلکہ خود اس کا شکار ہوا تھا.....!!

اس مڈل کلاس سانولی سی لڑکی نے جس کو رونق محفل بنا کر ملک صاحب سیاست کے میدان میں اپنے مہرے آگے بڑھانے جارہے تھے دراصل ملک صاحب کی شہرت، عزت اور دولت کی بیساکھیوں کے سہارے اپنے قدم اتنی مضبوطی سے گاڑ لئے تھے کہ اب اسے اکھاڑنا خاصا مشکل دکھائی دے رہا تھا..... اب وہ ملک کی ضرورت ہی نہیں، کمزوری بھی بن چکی تھی۔

اور.....!

یہ لڑکا ارسلان..... جسے اس نے زمین سے اٹھا کر سر پر بٹھایا تھا۔ وہ بھی اب اس کی بیوی کا ”شکار“ بن چکا تھا۔ ملک کے لئے سوائے اس کے فی الوقت کوئی سکوپ نہیں تھا کہ وہ اپنا گھوڑا اپنے میدان میں بھگائے۔ اگر اس نے نجمہ بیگم کے ٹریک میں قدم رکھا تو شاید اسے توقع سے بڑھ کر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔

”ارسلان بیٹا! اگر تمہارے پاس اختر اور جاوید کے متعلق کوئی اطلاع موجود ہے جو تم نے ابھی تک مجھے منتقل نہیں کی تو وہ مجھے بتا دو..... دوسری صورت میں خدا خواستہ کوئی مصیبت آگئی تو شاید میں بھی تمہاری مدد نہ کر سکوں۔ سیکورٹی والوں کو شاید کوئی کھول گیا ہے اور اس سے پہلے کہ بات فائلوں سے آگے نکلے۔ میں اس کیس کو ختم کر دینا ہی بہتر سمجھتا ہوں۔“

ملک صاحب نے ہوا میں تیر چلا کر شاید ارسلان کو خوفزدہ کرنا چاہتا، لیکن وہ اندازہ نہ کر پایا کہ اب ارسلان بھی کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں رہا۔ اس نے بھی اب بچوں کے بل کھڑے ہو کر کندھوں سے اوپر جھانکنا شروع کر دیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ ملک صاحب جھوٹ بول کر اسے خوفزدہ کرنا اور اپنا الوسیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ان تک ایسی کوئی اطلاع پہنچی ہوتی تو وہ ضرور اس کے علم میں بھی آگئی ہوتی۔

”ملک صاحب! مجھے افسوس ہے کہ آپ نے میرے متعلق یہ غلط رائے کیسے قائم کر لی؟ ملک صاحب میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ میں کبھی آپ سے غداری کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور آپ سے کچھ چھپانا آپ سے غداری کے مترادف سمجھتا ہوں۔“ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں دیکھ لوں گا۔ تم بے فکر رہنا۔“ ملک نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

وہ بڑا محتاط ہو گیا تھا۔

اس نے بہت سوچ سمجھ کر ہی اگلا کوئی بھی قدم اٹھانا تھا۔ وہ اپنے منہ سے کوئی ایسی بات نہیں نکال سکتا تھا جو اشارتاً بھی اس کے عزائم کی عکاس ہوتی۔ اس مرتبہ وہ کوئی مزید دھوکا کھائے بغیر میدان مارنا چاہتا تھا۔ اس نے نجمہ بیگم کے منہ سے اگلنے والا سارا زہرا اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تھا اور اب اسے بیک وقت کئی محاذوں پر لڑنا تھا۔

سب سے پہلے تو اسے خود کو ارسلان سے بے نیاز کرنا تھا جس کے لئے اس نے ابھی سے منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔

○

اگلے روز جب اس نے اخبار میں اپنی بیگم کی طرف سے ایک زبردست تردیدی بیان پڑھا تو اس کا موڈ خاصا خوشگوار ہو گیا۔

سیلی نے خوب خوب حق نمک ادا کیا تھا۔ ملک اندازہ کر سکتا تھا کہ مخالف اخبار کے رپورٹر کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے کیونکہ اس کا مالک کسی بھی نوٹس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

اب اسے خود کو آنے والی ملاقات کے لئے تیار کرنا تھا۔ اس کے علم کی حد تک دونوں لاشوں کا علم جو ناقابل شناخت قرار دلا کر اس نے دفن کروادی تھیں سوائے اس کے اور کسی کو نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے اطمینان کے لئے کرائمر براؤنچ میں اپنے ایک دیرینہ دوست آفیسر کوفون کر کے باتوں باتوں میں مختلف طریقوں سے اس کیس کے متعلق کسی نئی اطلاع سے متعلق جاننا چاہا لیکن کوئی کام کی بات اس کے پلے نہ پڑی۔

دوسری بڑی سرکاری ایجنسی جو اس کیس کو دیکھ رہی تھی، اس کے سٹوڈنٹس معاملات کے انچارج کا تبادلہ ہو چکا تھا اور ابھی تک کسی اور نے باقاعدہ چارج اس ڈیسک کا نہیں سنبھالا تھا۔ ملک سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ آخر کیا گیدڑ نکلتی ان لوگوں کے ہاتھ لگ گئی ہے۔

مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے اس نے ملاقات کے مقام کا تعین بھی کر دیا۔ وہ بڑا محتاط ہو کر گھر سے نکلا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو معمولی سی بھٹک بھی اس ملاقات کی پڑے۔

وہ ریٹ ہاؤس جس میں ملک صاحب اور مرکزی وزیر داخلہ کی ملاقات طے پائی تھی، شہر سے خاصا دور تھا اور ملک کی ہدایت پر ریٹ ہاؤس خالی کروا لیا گیا تھا۔ اپنی بیچارہ جیب میں وہ ایک باڈی گارڈ کے ساتھ آیا تھا۔ ریٹ ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں وزیر داخلہ اس کا منتظر تھا۔

”ملک صاحب! اصل میں آپ وہاں ”مس فٹ“ ہیں اور آپ جیسے تجربہ کار راہنماؤں کی جتنی ضرورت ہماری پارٹی کو ہے وہ اور کسی کو نہیں۔ سو ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کو اپنا لیڈر بنا کر رہیں گے۔“ وزیر داخلہ نے حال احوال دریافت کرنے کے بعد اپنا بریف کیس

کھولتے ہوئے ملک صاحب سے کہا۔

ایک مؤدب و میٹران کے سامنے مشروبات رکھ کر باہر چلا گیا تھا اور اب کمرے میں ملک صاحب اور وزیر داخلہ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

”لیکن میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ یوں بھی آپ جانتے ہیں کہ چھوٹی کشتیاں اگر کنارے کے نزدیک ہی رہیں تو ہی سلامت رہتی ہیں۔ ہم تو سائیکس معمولی سے بندے ہیں۔ یہ بڑے کھیل کھیلنا ہمارے بس کاروگ نہیں۔“ ملک نے بھی مسکراتے ہوئے چائے کا گھونٹ حلق میں اٹھیل کر کہا۔

”ملک صاحب! مجھے وزیر اعظم کی طرف سے حکم ملا ہے کہ آپ سے بات کروں۔ ہم چاہتے ہیں کہ مستقبل میں آپ ہمارے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلیں۔ اس صوبے میں اگر آپ جیسے محترم اور بااثر لوگ ہمارے ساتھ تعاون کریں تو انشاء اللہ ہم مل کر اس ملک کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ہماری طرف سے آپ کو یہ بھی آفر موجود ہے کہ اگر آپ صوبے کی وزارت اعلیٰ چاہیں یا اپنی مرضی سے وزارت بنوانا چاہیں تو ہم حاضر ہیں۔ اگر آپ مرکز میں آنا چاہیں تو بھی آپ کے مطلب کی منسٹری آپ کو مل جائے گی۔“ وزیر داخلہ نے ایک ایک کر کے اس کے سامنے پتے پھینکنے شروع کئے۔

”سائیکس آپ مجھے معاف ہی رکھیں۔ ابھی میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ دال روٹی جیسے تیسے چل رہی ہے۔“

وزیر داخلہ نے اندازہ کر لیا تھا کہ ملک ایسے سنہری جال میں پھنسنے والا نہیں۔ بلاخراس نے تروپ کا پتہ پھینک ہی دیا۔

”ملک صاحب یہ دو تصاویر آپ کے معائنے کے لئے حاضر ہیں۔“ اس نے مقبول نواز اور اختر کی تصاویر اس کے سامنے رکھے ہوئے کہا۔ ”پولیس رپورٹ کے مطابق یہ دونوں لڑکے ڈکیتی کر کے فرار ہو رہے تھے کہ آپس کے مقابلے میں مارے گئے۔ انہوں نے بینک کی جس وین کو لوٹا تھا اس کے تمام سواروں کو بھی مار ڈالا تھا۔ پولیس کا خیال ہے کہ ان کا کوئی تیسرا ساتھی بھی تھا کیونکہ رقم وہاں سے غائب ہے۔ بہر حال یہ پولیس کا مسئلہ ہے۔ وہ ڈین ایس پی جس نے آپ کے حکم سے ان لاشوں کو ناقابل شناخت قرار دے کر دفنانے کی ہدایت کی تھی اور وہ

مجسٹریٹ جس نے یہ احکامات جاری کئے تھے آپ کے خلاف تحریری بیان دے چکے ہیں۔ بیانات کی نقول بھی ملاحظہ فرمائیں۔“ اس نے ایک فائل میں لگے فوٹو سٹیٹ کاغذ ان کی طرف بڑھا دیئے۔

○

ملک نے کپکپاتے ہاتھوں سے باری باری ان سب چیزوں کا جائزہ لیا۔ اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہوتی جا رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کیا ہے۔

کوئی خواب ہے.....!

کوئی واہمہ ہے یا کچھ اور.....!

لیکن.....!!

یہ بڑی تلخ سچائی تھی جس کا ادراک اب ملک صاحب کو ہونے لگا تھا۔ وہ بری طرح پھنس گئے تھے۔ مخالفین نے بڑی محنت سے کیس تیار کیا تھا اور ملک صاحب کے فرار کی کوئی راہ باقی نہیں چھوڑی تھی۔

”گویا آپ مجھے بلیک میل کرنے جا رہے ہیں۔“ نجانے ملک کے حلق سے کیسے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

”نہیں ملک صاحب ہرگز نہیں۔ یہ تو ”ڈیل“ ہے۔ ہماری آفر ہے، پیشکش ہے۔ سیاست میں کوئی کسی کو بلیک میل نہیں کرتا۔ ہر کوئی اپنی ضرورت اور اہمیت کا سودا کرتا ہے۔ ملک صاحب کمال ہے آپ اسے بلیک میلنگ کہہ رہے ہیں۔ یہ تو دوطرفہ معاہدہ ہے۔ ہم آپ کو بہت کچھ دے رہے ہیں۔ بہت کچھ ”لوڑ“ کر رہے ہیں۔ اتنا کچھ شاید آپ کی پارٹی آپ کو کبھی نہ دے سکے۔ آپ کی اطلاع کے لئے یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اس مرتبہ جھنڈر بھی خاموش نہیں بیٹھے گا..... آپ کے وزیر اعلیٰ نے اگر آپ ہی کو خوش رکھا تو وہ لوگ ہمارے ساتھ آملیں گے۔ آپ یہ تو مانیں گے کہ اس کے بعد اس صوبے میں کم از کم آپ کی پارٹی کی حکومت نہیں بنے گی اور جہاں تک ہمارا سوال ہے تو ملک صاحب ہمارے دروازے تو سب کے لئے کھلے ہیں۔ سیاست میں کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا بلکہ نئے راستے تلاش کئے جاتے ہیں۔“ وزیر داخلہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

”لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس طرح انقلابی طلباء تنظیم میرے ہاتھ سے نکل جائے گی۔“ ملک نے اپنا عندیہ ظاہر کیا۔

”ہرگز نہیں۔ ہمارے پاس تمام منصوبہ تیار ہے۔ آپ آج رات کو ہی اجلاس طلب کر لیں۔ طلباء تنظیم میں دو واضح گروپ موجود ہیں۔ نوید گروپ کو آپ نے ابھی تک نظر انداز کیا ہے۔ ان لوگوں کو ہاتھ میں رکھیں اور سجن گروپ کی پرواہ نہ کریں۔ ان لوگوں کی قیمت پانچ لاکھ سے زیادہ تو نہیں ہوگی۔ پیسوں کی آپ فکر نہ کریں..... یہ دوسرا بریف کیس آپ کے لئے ہے۔ ملک صاحب! جیسے بھی ممکن ہو سجن گروپ کے کچھ لوگوں کو خرید لیجئے۔ اول تو اس کے بعد صوبائی لیگ کے لئے کچھ باقی نہیں بچے گا۔ اگر ایسا ہوا بھی تو بے فکر رہئے۔ ہمارے پاس متبادل منصوبہ بھی موجود ہے۔“ وزیر داخلہ نے پائپ کے دھوکے کے مرغوعے بناتے ہوئے کہا۔

”کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ مجھے اس سے بھی آگاہ کر دیں۔ اس طرح میں زیادہ بہتر پلاننگ کر سکوں گا۔“ ملک نے یہ کہتے ہوئے دوسرا بریف کیس اٹھا کر اپنے نزدیک کر لیا۔

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب ملک صاحب ان کی ”ڈیل“ میں پھنس گئے ہیں۔

”یہ اختر اور جاوید کے قتل کی کہانی بھی تو ابھی منظر عام پر نہیں آئی۔ اس الزام میں دس بارہ سر پھروں کو تو گرفتار کیا ہی جاسکتا ہے۔ ہم اس ڈکیتی کو ”باغیوں“ کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ ملک صاحب جب 302 کے تحت چالان کی دھمکی ملی تو بڑے بڑے شیر بھی گدھے بن کر آپ کے سامنے دم ہلانے لگیں گے۔ یہ تو آپ کو علم ہو گا ہی کہ پولیس نے ان کے خلاف کتنے کیس رجسٹر میں دبا رکھے ہیں۔“

ملک کی کامیابی کا راز ہی یہی تھا کہ اس نے وقت سے سمجھوتے کے سنہری اصول کو حرز جان بنالیا تھا اور ہمیشہ حالات سے مفاہمت کر کے آگے نکلنے کی کوشش کی تھی۔

ملک صاحب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب انہیں سیاست میں اپنی ترجیحات کو بدلنا ہو گا بصورت دیگر ان کے لئے جیل کا دروازہ کھل جائے گا اور ایک مرتبہ وہ جیل میں پہنچ گیا تو اس کو یقین تھا کہ پھر کبھی باہر نہیں آ سکے گا، کیونکہ صوبائی لیگ کے لوگ بھی اس کی حمایت اس کے ”پریشر“ کی وجہ سے کرتے تھے اور جیسے ہی اس کا پریشر گروپ ختم ہوتا ہے۔ وہ اس کی جان کو آ جاتے۔ ملک صاحب جانتے تھے کہ صوبائی لیگ میں ان کے دوست کم اور منافق نما دوست اور

حاسد زیادہ ہیں۔ وہ جانے کب سے کسی ایسے موقع کے منتظر رہتے ہوں گے۔ اس نے دو تین روز میں ہی اپنی نئی سیاسی حکمت عملی کا اعلان کرنا تھا اور یہ احتیاط بھی ملحوظ خاطر رکھنی تھی کہ وقت سے پہلے کھیل ان کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ وزیر داخلہ سے اس کی ڈیل طے پا گئی تھی.....!



انکشاف

گھر پہنچ کر انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد نیگم کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔
”میں نے مرکزی پارٹی جو آئین کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ اس نے نجمہ نیگم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن کیوں؟“ نجمہ نیگم کا سوال خلاف توقع نہیں تھا۔

”ایک تو ان لوگوں کی طرف سے ”آفر“ بہت اچھی ہے۔ دوسری طرف صوبائی لیگ میں میری مخالفت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اگر پارٹی صدر نے میری حمایت جاری رکھی تو بھنڈر اپنے گروپ سمیت مرکزی پارٹی سے جاملے گا اور صوبائی لیگ کے اس طرح مستقبل میں اس صوبے میں اپنی وزارت بنانے کے چانسز بھی ختم ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ بھنڈر مرکزی پارٹی سے ہاتھ ملانے میں خود کیوں نہ باعزت پیشکش قبول کر لوں۔“

اس نے نجمہ نیگم کو اپنی اور وزیر داخلہ کی ملاقات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”اور مجبوری بھی ہے کہ ان لوگوں نے میرے خلاف اختر اور جاوید کے اغوا کا کیس خاصا مضبوط تیار کر لیا ہے۔ تمہیں شاید علم نہ ہو کہ ان دونوں کی لاشیں لاوارث قرار دے کر دفنائی جا چکی ہیں اور مرکزی حکومت کی انٹیلی جنس ایجنسی نے میرے خلاف اندر ہی اندر مجھے پھانسنے کے

لئے خاصے ثبوت بھی جمع کر لئے ہیں۔“
اس نے اپنی بات مکمل کی۔

”ملک صاحب! آپ جیسے گھاگ جہاندیدہ کا کوئی سیاسی فیصلہ غلط تو ہونے سے رہا۔ ظاہر ہے آپ نے کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا لیکن اس بات کی ضمانت مرکزی پارٹی سے ضرور حاصل کر لیں کہ وہ اگلی اسمبلی میں خواتین کی مخصوص نشستوں میں سے ایک میرے لئے مختص رکھیں گے اور سوشل ویلفیئر منسٹری بھی..... آپ جانتے ہیں کہ میں ویلفیئر کے کاموں میں دن رات مصروف رہتی ہوں اور اس وزارت پر مجھ سے زیادہ اور کسی کا حق بھی نہیں۔“ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے ملک صاحب سے کہا۔

نجمہ نیگم جانتی تھی کہ ملک صاحب نے اس سے ضرور کوئی بات چھپالی ہے۔ اس کے ذہن نے اپنا مستقبل محفوظ کرنے کی راہ اسے سب سے پہلے بھائی تھی۔
”ارے نجمہ نیگم سائیں! ہم تو سیاست ہی تمہارے لئے کر رہے ہیں۔ تم اپنی ”پورٹ فولیو“ محفوظ سمجھو۔“ اس نے نجمہ کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

اب وہ ارسلان کا منتظر تھا.....!

اس نے اپنی ہونہار ریفیقہ حیات سے مشاورت شروع کر دی تھی اور اسے بتا دیا تھا کہ انقلابی طلباء تنظیم کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لئے اس نے کیا منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس سلسلے میں اسے ارسلان کی مدد درکار تھی اور تھوڑی دیر بعد ارسلان وہاں موجود تھا۔

ملک صاحب نے اس کے ساتھ وزیر داخلہ کی ملاقات کا ذکر کیا اور یہ بھی بتا دیا کہ پولیس نے ڈکیتی کے مفروضہ ملزم کے خلاف بھی مقدمہ درج کر لیا ہے، البتہ ایف آئی آر فی الوقت سر بہرہ کر دی گئی ہے اور مناسب وقت پر دوبارہ فائل کھول دی جائے گی۔

○

ارسلان تھوڑی دیر بعد اپنی گاڑی لے کر ہنگامی آپریشن کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی دایسی رات دیر گئے تک ہوئی تھی، لیکن اکیلے نہیں۔ اس کے ساتھ انقلابی طلباء تنظیم کے اہم لیڈر بھی موجود تھے۔ ان لوگوں کا تعلق ارسلان والے گروپ سے تھا جب کہ جن گروپ کے لوگ دوسری جیب میں پہنچے تھے۔ آج پہلی مرتبہ طلباء تنظیم کے دس لیڈروں کو ایک ساتھ ملک صاحب نے اپنے

بچکے پر اکٹھے کیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ملک صاحب ان کو حالات کی اونچی نیچ سے آگاہ کر رہے تھے۔ انہوں نے سٹوڈنٹس لیڈروں کو بتا دیا تھا کہ اختر اور جاوید ڈکیتی کی ایک واردات میں مارے جا چکے ہیں اور پولیس نے ان کی لاشیں لاوارث قرار دے کر دفن بھی دی ہیں۔

ملک صاحب نے انہیں بتایا تھا کہ پولیس کو ان نوجوانوں کی بھی تلاش ہے جو ان کے ساتھ تھے اور بعد میں رقم لے کر فرار ہو گئے۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت کی طرف سے صوبائی پولیس پر پریشر بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اور وہ انقلابی طلباء تنظیم کے تمام سرکردہ ممبران کے خلاف درج شدہ مقدمات کی فائلیں کھول کر انہیں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔

یہ لوگ جو یہاں جمع تھے جانتے تھے کہ وہ تمام کے تمام پولیس کو ڈکیتوں، اغوا، غنڈہ گردی اور توڑ پھوڑ کے واقعات میں مطلوب ہیں لیکن اختر اور جاوید والی واردات میں ان میں سے کسی نے حصہ نہیں لیا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے پر شک کر رہے تھے۔

یہ بات تو وہ بھی جانتے تھے کہ ان میں سے ہی کسی نے ڈکیتی کی رقم اڑائی ہوگی۔ یہ بات تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ ان میں سے کوئی اس واردات کا ذمہ دار نہیں؟

ملک صاحب نے انہیں ساری اونچ نیچ بتا کر ان کے پاؤں تلے سے پہلے تو زمین سرکائی اور انہیں باور کروایا کہ اب صورت حال ایسی ہو گئی ہے کہ اگر انہوں نے حکومتی پارٹی کی پیشکش قبول نہ کی تو وہ سب جیلوں میں چلے جائیں گے اور صوبائی لیگ ان کی مدد نہیں کر سکے گی کیونکہ ان سب کے خلاف بڑے سنگین نوعیت کے الزامات کے تحت مقدمات درج کئے گئے ہیں۔

○

یہ نوجوان جو یہاں جمع تھے ان کا تعلیم سے کبھی دور کا بھی واسطہ نہیں رہا تھا۔ ان کا تعلق کالجوں اور یونیورسٹیوں سے اگر کچھ تھا تو صرف اتنا کہ یہاں حاضری سے متعلق رجسٹروں میں ان کے ناموں کا اندراج تھا۔ خود تو وہ مہینوں کا لچ یونیورسٹی کی شکل نہیں دیکھا کرتے تھے۔ ان میں غالب تعداد ان نوجوانوں کی تھی جنہوں نے شہر میں باقاعدہ بد معاشی کے مراکز قائم کر رکھے تھے۔ یہ لوگ اپنا معاوضہ لے کر مکانات کے قبضے دلایا کرتے تھے۔

لوگوں کی جائیداد پر ناجائز قبضے کیا کرتے تھے۔ ویگن سٹینڈ سے اپنا بھتہ وصول کرتے

تھے یا پھر موقع ملنے پر ڈکیتی کی وارداتوں کا ارتکاب کرتے تھے۔

یہ لوگ سیاستدانوں کی ضرورت تھے اور ان کی ضرورت سیاستدان تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی کمزوری دوسرے کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس لئے دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوط کرتے رہتے تھے۔

ملک صاحب نے دو تین داؤ ہی ایسے لگائے کہ تمام لوگ منہ کے بل زمین پر آ گرے۔ جب لوہا گرم ہو گیا تو ملک صاحب نے چوٹ بھی لگادی اور بریف کیس کھول کر اس میں موجود آدمی رقم بڑی ایمانداری سے ان سب میں برابر تقسیم کر دی۔ آدمی رقم انہوں نے اپنے لئے رکھ لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے ”نوجوان دوستوں“ کو مطلع کیا کہ وہ ان لوگوں کی بہبود کے لئے اپنا سیاسی کیریئر داؤ پر لگانے جا رہے ہیں۔ انہوں نے حاتم کی قبر پر لات مارتے ہوئے نوجوانوں سے کہا کہ ان کے جیتے جی پولیس کسی کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے یہ ان کے لئے ناقابل برداشت ہے اور اب وہ محض اپنے نوجوان دوستوں کے لئے مرکزی پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں۔

جیسے ہی ملک صاحب کے منہ سے یہ بات نکلی۔ ارسلان نے تالیاں بجا دیں۔ باقی کہاں پیچھے رہنے والے تھے۔ وہ بھی اس جشنِ مسرت میں شامل ہو گئے۔ ان لوگوں نے باری باری ملک صاحب کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور کہا کہ ہمیشہ کی طرح اب بھی وہ ان کے اشاروں پر کھ پتلوں کی طرح ناپچڑے رہیں گے اور انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی نوید گروپ اور بجن گروپ کے لوگوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بغل گیر ہو کر ملک صاحب کو یقین دہانی کروادی کہ ان کے درمیان کوئی اختلاف باقی نہیں رہا اور وہ مستقبل میں مل کر اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلیں گے۔

ملک صاحب نے انہیں یقین دلایا کہ وہ ہمیشہ کی طرح خود کو کبھی اکیلا محسوس نہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے نوجوان دوستوں سے یہ درخواست بھی کر دی کہ وہ کچھ عرصے کے لئے ذرا محتاط ہو جائیں کیونکہ مرکزی پارٹی اور صوبائی لیگ کے درمیان اینٹ کتے کا بیر ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ ان کے لئے مشکلات پیدا کرے۔

”ملک صاحب! دیکھیں ہم پر ایسی کوئی پابندی نہ لگائیں۔ گھوڑے بھاگتے ہی اچھے

کلتے ہیں۔“

ججن نے بد معاشوں کے سے لہجے میں بڑھک ماری۔

اس کے ساتھ ہی سب نے مل کر قہقہہ لگایا۔ ملک صاحب نے بھی پھپھڑوں کا پورا زور لگا کر اس میں حصہ لیا تھا۔ یہاں سے وہ الگ الگ گروپ میں واپس گئے تھے۔ جاتے ہوئے ایک ٹولی نے راستے میں آنے والے ایک پٹرول پمپ پر ہاتھ صاف کر دیا تھا۔

دوسرے روز دوپہر کو ایک فائیو سٹار ہوٹل میں انقلابی طلباء تنظیم کے دونوں گروپوں کی ایک مشترکہ پریس کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنس چونکہ لُنج پر بلائی گئی تھی اس لئے خاصی بارونق تھی اور ہر اخبار کار پورٹرز اور فوٹو گرافر یہاں موجود تھا۔ تنظیم کے جنرل سیکرٹری ارسلان نے ایک ٹائپ شدہ بیان رپورٹرز میں تقسیم کر دیا جس میں صوبائی قیادت پر سنگین الزامات لگاتے ہوئے مستقبل میں صوبائی لیگ کے مکمل بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا تھا اور اس عزم کا اعادہ کیا گیا تھا کہ ماضی کی طرح آئندہ بھی انقلابی طلباء تنظیم کے نوجوان کسی سیاسی پارٹی کے آلہ کار نہیں بنیں گے اور طلباء کے حقوق حاصل کرنے کے لئے اپنا جہاد جاری رکھیں گے۔

اس بیان کے بعد اختر اور جاوید کے غائب ہونے کا الزام صوبائی قیادت پر عائد کرتے ہوئے یہ عندیہ ظاہر کیا گیا تھا کہ پولیس نے دونوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں غائب کر دادی ہیں۔

رپورٹرز میں سے کسی نے بھی کوئی سوال کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو تھی جو ان کے سامنے میزوں پر سجائے جا رہے تھے اور دوسری اہم وجہ ان لفافوں کی امید تھی جو ان میں تھوڑی دیر بعد تقسیم ہونے والے تھے۔

پریس کانفرنس کے خاتمے پر دو تین مرکزی شخصیات نے ملک صاحب کو فون کر کے مبارک باد دی تھی۔

○

صبح کے اخبارات نے اس پریس کانفرنس کو نمایاں کوریج دی تھی۔ گو کہ سیکورٹی ایجنسیوں نے وزیر اعلیٰ کو اس کانفرنس کی ساری رپورٹ رات ہی کو پہنچا دی تھی، لیکن ابھی تک صوبائی لیگ کے لوگوں کو شاید ”سیاسی سانحے“ کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

صوبائی قیادت یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ملک صاحب جیسا ان کا خاص آدمی بھی ایک

روز ”ہارس ٹریڈنگ“ کا شکار ہو جائے گا۔

رات دیر گئے جب صوبائی لیگ کے لوگوں نے ملک صاحب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو انہیں مطلع کیا گیا کہ ملک صاحب ایک ضروری کام کے سلسلے میں دارالحکومت گئے ہیں۔ وہ رات کو ”ٹائٹ کوچ“ سے دارالحکومت روانہ ہو گئے تھے۔ اس بات کی تصدیق بعد میں ایئر لائن کے کاؤنٹر نے بھی کر دی۔

صبح جب وزیر اعلیٰ ناشتے کی میز پر تشریف فرما تھے۔ انہیں بھنڈر صاحب کی آمد سے مطلع کیا گیا۔ بھنڈر کے لئے تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تھا۔ وہ ایسا موقعہ کیوں ہاتھ سے جانے دیتا۔ رات ہی اس کے ایک ”صحافی ٹاؤٹ“ نے اس کو جب نیند سے جگا کر اس پریس کانفرنس کی اطلاع دی تو وہ سناٹے میں آ گیا۔ اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ یہ سچ بھی ہو سکتی ہے، لیکن یہ شخص جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا۔

بھنڈر کی نیند تو حرام ہوئی ہی تھی۔ اس نے راتوں رات اپنے گروپ کے پانچ چھ سرکردہ ممبر اپنے گھر اکٹھے کر لئے اور آدھی رات تک وہ لوگ اگلا لائحہ عمل طے کرتے رہے۔ بھنڈر ایک مرتبہ پھر مات کھا گیا تھا۔

اس نے اندر ہی اندر مرکزی پارٹی میں شامل ہونے کی تیاریاں شروع کر رکھی تھیں، لیکن ایک مرتبہ پھر ملک اس پر بازی لے گیا۔

”پھر کیا ہوا؟“

اس نے اپنے آپ کو تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ کم از کم وہ ملک کو اب اس قابل نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ کبھی صوبائی لیگ میں واپس آ سکے۔

وزیر اعلیٰ نے بھنڈر گروپ کو ناشتے کی میز پر ہی طلب کر لیا۔ وہ بھی اس صورت حال سے خاصے پریشان دکھائی دے رہے تھے گو کہ اس سے پہلے وہ پارٹی معاملات میں اس کے مقابلے میں ملک کا ساتھ دیا کرتے تھے، لیکن اب اچانک ہی انہیں نئی سیاسی حکمت عملی اختیار کرنی پڑی تھی۔

”بہت بچ حرکت کی ہے ملک صاحب نے۔“ اس نے اپنے دل کے پھپھو لے پھوڑتے ہوئے کہا۔ ”جناب والا! میں تو پہلے روز ہی سے اس شخص کی رگ رگ سے واقف ہوں۔

افسوس پارٹی نے ہماری آواز پر کبھی کان ہی نہیں دھرے۔ جناب والا! یہ آفر تو میرے پاس گزشتہ تین ماہ سے پڑی ہے۔ مرکزی پارٹی والے مجھے اپنی مرضی کی دو وزارتیں مرکز میں دے رہے تھے اور صوبے کے معاملے میں تو سب کچھ ہم پر چھوڑ دیا تھا لیکن ہم خاندانی لوگ ہیں..... ہم نے کبھی گھٹیا سیاست کا تصور بھی نہیں کیا۔ سوچا تک نہیں کہ ہم کبھی اتنا بھی کر سکتے ہیں۔“ یہ بات کہتے ہوئے بھنڈرول ہی دل میں خود پر لعنت بھی بھیج رہا تھا کہ اس نے اب تک مرکزی پارٹی سے رابطہ کیوں نہ کیا اور ملک کو ایک مرتبہ پھر کیوں نمبر لے جانے کا موقع دے دیا۔

”بھنڈر صاحب! اقتدار تو آتی جانی شے ہے۔ سیاست میں بے اصولی کو عوام کبھی پسند نہیں کرتے۔ آپ دیکھیں گے کہ ملک صاحب ایک روز معافی مانگ کر واپس آئیں گے۔ یوں بھی ابھی تک انہوں نے کوئی اعلان نہیں کیا دوسری پارٹی میں شامل ہونے کا۔ ابھی ہم کوئی رائے کیسے قائم کر سکتے ہیں۔“ وزیر اعلیٰ نے انتہائی منافقت سے کام لیتے ہوئے خود کو اب بھی غیر جانبدار رکھنے کی کوشش کی۔

”جناب والا! اب باقی کیا رہ گیا ہے۔ اعلان بھی وہ آج کل میں کر دے گا۔ وہاں دارالحکومت میں وہ کوئی لڑکے کا چھوہارہ تو ڈالنے نہیں گیا۔“ اس نے آج پہلی مرتبہ اس جرات سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

وزیر اعلیٰ نے ایک ٹاپے کے لئے اس کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا کہ یہ وہی شخص ہے جو ملک کی موجودگی میں بھیگی بلی بن کر بیٹھا رہتا تھا۔

”بھنڈر صاحب! پارٹیاں اپنے پروگرام کے بل پر چلا کرتی ہیں۔ عوام انہیں لوگوں کو اپنے نمائندے منتخب کریں گے جو ان کے دکھ درد کو جانتے ہوں۔ ان کا مداوا بھی کر سکیں۔ میری آپ ایسے سینئر لوگوں سے یہی درخواست ہے کہ آپ سب لوگ اپنے آپس کے اختلافات ختم کریں اور اس مرتبہ بل کر پوری ہمت سے انتخابی میدان میں اتریں۔ آپ کے ہوتے ہوئے ہم نے ملک صاحب جیسے لوگوں کی نہ کبھی پہلے پروا کی تھی نہ اب کریں گے۔“

وزیر اعلیٰ نے دو تین ایسی ہی باتیں کر کے بھنڈر کو خوش کر دیا۔ ان کے درمیان ٹاٹے کی میز پر یہ بات طے پا گئی تھی کہ صوبے میں کامیابی کی صورت میں تین اور مرکز میں کامیابی کی

ابھی الیکشن کا اعلان نہیں ہوا تھا اور ان سیاسی بندروں نے بندر بانٹ شروع کر دی

تھی۔

ان کی موجودگی ہی میں یہ اطلاع بھی مل گئی کہ ملک صاحب نے دارالحکومت میں ایک پرجہوم پریس کانفرنس کے دوران مرکزی پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دیا ہے۔

○

”بڑی مشکل سے قابو آئی کجخت۔ دس ہزار دے کر بھی جان چھڑانی مشکل تھی۔ آپ جانتی ہیں مسز ملک کہ یہ کجخر لوگ اتنی جلدی بے وقوف بننے والے تو نہیں۔“ ارسلان نے نجمہ ملک کو دوسرے روز اپنی کارگزاری کی رپورٹ پیش کی۔

”پروا نہ کرو۔ معمولی بات کو اتنی اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب تم اسے بھول جاؤ۔ لعنت بھیجو۔ صرف مستقبل پر نظر رکھو ارسلان۔ ماضی کی بات کمزور لوگ کرتے ہیں۔ حال کو اپنا بناؤ اور مستقبل کو اپنے قابو میں رکھنے کی فکر کرو۔ جو کام ہم نے اس طوائف سے لینا تھا وہ لے لیا۔ اب وہ بیکار ہے۔ ملک نے مرکزی پارٹی سے سودا بازی کر لی ہے۔ ہم چاہیں تو صوبائی لیگ سے اتنی بڑی ڈیل کر سکتے ہیں کہ ملک کے لئے سوائے ملک چھوڑ کر بھاگنے کے اور کوئی راستہ باقی نہیں بچے گا اور یہی میں چاہتی ہوں۔“ اس نے آخری فقرہ بڑا چپا کر کہا تھا۔ ”میں اس کو بھگا بھگا کر مار دوں گی۔“

ارسلان کو اس کی آواز میں چھپے قہر کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ”وہ تصویر کم از کم دکھا تو دیجئے۔“ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ دیا۔

”فضول۔ بالکل فضول بات ہے یہ۔ تمہیں اس سے کیا لینا دینا۔ 50 ہزار تمہیں اس کا مل گیا..... حالانکہ جو حربہ میرے کہنے پر تم نے اس طوائف پر اپنایا ہے وہی میں تم پر بھی استعمال کر سکتی تھی۔“

اس کی بات نے ارسلان کو لرزا کر رکھ دیا۔ نجمہ بیگم کے ہونٹوں پر مخصوص مسکراہٹ چمکی ہوئی تھی اور اس سانو لے رنگ کی خوبصورت ڈائن کا یہ روپ ارسلان کی رگ رگ میں خوف بن کر ٹرائٹ کر گیا۔ اس نے اندازہ لگالیا کہ یہ عورت اس کے تصورات سے بڑھ کر خطرناک ہے۔ واقعی وہ کبھی بھی لہجہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ ملک کا تہ اور حاصل کر کے اس نے ملک کو زندہ دہر کر دیا تھا

اور ارسلان کے ذریعے یہ کارنامہ کروا کر اس نے ارسلان کو اپنے لئے دم ہلانے والا کتا بنا کر رکھ دیا تھا۔

”اف میرے خدایا!“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ”میں کس عذاب میں پھنس گیا ہوں.....!“

”خیر چھوڑو۔ کس چکر میں پڑ گئے۔ میں ذرا باتھ لے لوں۔ تم تیار ہو جاؤ۔ آج مجھے دو اہم تقاریب میں شامل ہونا ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ ہاتھ روم کی طرف چل دی۔

ارسلان بالکل لاشعوری انداز میں چلتا ہوا اس کے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ اس کے دماغ میں ابھی تک نجمہ بیگم کا وہ فقرہ گونج پیدا کر رہا تھا۔ کمرے میں چھوٹی سی میز پر کل کی ڈاک رکھی تھی۔ اس نے معمول کے مطابق ڈاک چیک کرنا شروع کر دی جب اچانک ہی تصاویر کا ایک لفافہ اس کے ہاتھ لگ گیا۔

لاشعوری طور پر ہی اس نے اپنی چھٹی حس کے کہنے پر لفافہ میں سے تصاویر نکالیں۔ یہ اس کے دورہ انگلستان کی تصاویر تھیں۔ اچانک ہی ایک تصویر نے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔ اسے یاد آ گیا جب وہ فرینکفرٹ میں اپنا بریف کیس سجادول خان کے حوالے کر رہا تھا۔ اگر یہ تصویر انٹر پول یا مقامی پولیس کے ہاتھ لگ جاتی تو اس کی ساری زندگی جیل کی سلاخوں کی نذر ہو جاتی۔ کیونکہ اس تصویر میں وہ سجادول خان سے بریف کیس وصول کرتا صاف دکھائی دے رہا تھا اور وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ سجادول کے ساتھ جو آدمی نظر آ رہا ہے وہ بھی یقیناً کوئی بین الاقوامی سمگلر ہو گا۔

پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ تصویر کو دیکھ رہا تھا جب اچانک ہی اس کے پیچھے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ ارسلان نے کسی میکا کی عمل کے تحت گردن گھمائی۔ مسز ملک اس کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ تصاویر کا لفافہ اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔

○

”گھبرا گئے کیا؟“

بیگم نجمہ نے کمال بے اعتنائی سے کہا۔

”یہ..... یہ کیا ہے؟“ ارسلان نے غصے اور حیرت سے ملی جلی آواز بشکل حلق سے

نکالی۔

”اچھا! اب یہ بھی مجھے ہی بتانا ہو گا۔“ سر پر تو لیے سے اس نے بالوں کو سکھاتے ہوئے

کہا۔

”مسز ملک! آپ نے یہ.....“ ارسلان کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

”میں ابھی نہیں چاہتی تھی کہ تم یہ سب کچھ دیکھو، لیکن اچھا ہوا بروقت آگاہ ہو گئے تم۔“

یہ بہت ضروری تھا ارسلان۔ دیکھو بھی! انسانی فطرت بھی بڑی عجیب ہے۔ ایک بل میں جانے انسان کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ کیا کر بیٹھے اس کی سوچ کیا ہو جائے۔ ماضی کے تلخ تجربات نے مجھے تو بہت حقیقت پسند اور احتیاط پسند بھی بنا دیا ہے۔ تم بہر حال سیاسی آدمی ہو اور ظاہر ہے میں نے بھی اس میدان میں جھک ماری ہے۔ جانے کل تم کیا کر بیٹھو۔ جیسے میرا کوئی اہم راز تمہارے پاس محفوظ ہے اسی طرح تمہاری بھی کوئی کمزوری میرے پاس محفوظ ہونی چاہئے تاکہ مستقبل میں ہم ایک دوسرے کے خطرات پیدا نہ کر سکیں۔ تم نہیں جانتے ارسلان انسان کمینگی پر اتر آئے تو کتنا گر جاتا ہے۔ اب مجھے ہی دیکھ لو۔ ملک صاحب نے مجھے کتنی عزت دے رکھی ہے۔ اپنی اولاد تک سے ماطہ توڑ رکھا ہے میرے لئے، لیکن میں نے انہیں بھی بلیک میل کرنے کے لئے ”سنف“ محفوظ کر لیا ہے حالانکہ وہ میرے مجازی خدا بھی ہیں اور میری مرضی اور منشا کا پورا پورا احترام بھی کرتے ہیں، لیکن اس خوف سے کہ جانے کل کوئی عورت انہیں مجھ سے زیادہ پسند آ جائے اور وہ..... بہر حال اپنا مستقبل محفوظ رکھنے کا..... حق تو سب کو حاصل ہونا چاہئے۔ میں سوچتی ہوں ارسلان اگر میرے جیسی پڑھی لکھی عورت بھی اتنی کمینگی کا مظاہرہ کر سکتی ہے تو اور کوئی کیسے نہیں کرے گی.....؟“

ارسلان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ عورت پاگل ہے یا اسے پاگل بنا دینے پر تلی ہوئی ہے۔ اتنی اذیت پسند عورت اس نے زندگی میں اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ وہ یوں اطمینان سے اپنا فلسفہ بگھا رہی تھی جیسے کلاس روم میں کوئی استاد اپنے سنوڈش کو لپکچر دے رہا ہو۔

”آپ نے بجا فرمایا مسز ملک۔ انسان کمینگی پر اتر آئے تو کتنا گر سکتا ہے۔ ویل ڈن! بہت اچھا کیا آپ نے کہ ہیل کے آغاز ہی میں اس کے اصول بھی بتا دیئے۔“ ارسلان کا لہجہ خاصا طنزیہ تھا۔

”یہ میرا فرض تھا ارسلان۔ آخر تم دھوکے میں کیوں مارے جاؤ۔ کیوں نہ تمہیں پہلے ہی سے تمام ”روٹرائیڈ ریگولیشنز“ سے آگاہ کر دیا جائے.....!“ وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

اور.....!

ارسلان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس کا نینوادا باکر اسے مار ڈالے.....!

”مسز ملک کیا آپ ان ذات شریف کا تعارف کروانا پسند فرمائیں گی۔“ اس نے اپنے اور سجادول خان کے درمیان کھڑے ایک انگریز کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ تصویر اس نے زمین سے اٹھالی تھی۔

”جیفری..... جیفری ہاؤ۔ خدا جانے اس کا اصل نام ہے یا نہیں لیکن کجخت نے نام بڑا زبردست اپنایا ہے۔ انٹر پول کے پاس اس کا مکمل ریکارڈ اس تصویر کے ساتھ موجود ہے۔ عام حالت میں یہ اس حلیے میں نہیں رہتا..... صرف تمہارے لئے پیچا رہا اتنا خطرہ مول لے کر اس روپ میں تھوڑی دیر کے لئے سامنے آیا تھا..... اصل میں ارسلان یہ بہت ضروری تھا۔ اس طرح کبھی پولیس کو یہ یقین نہیں دلایا جاسکتا کہ تصویر نقلی ہے اور تمہیں پھنسانے کے لئے بنائی گئی ہے اور یہ ہے بھی ایمانداری کی بات کہ تصویر بہر حال اصلی ہے۔“ آخری فقرے پر اس نے اذیت ناک تہقہ بھی لگایا تھا۔ ”خیر لعنت بھیجوان تصویروں میں کیا رکھا ہے۔ چلو مجھے شام کو پھر پریس کانفرنس سے خطاب کرنا ہے تیاری کرلو۔“

یہ کہتے ہوئے ارسلان کو اسی حالت میں چھوڑ کر وہ باہر نکل گئی۔

اس نے ارسلان کو یہ نہیں کہا کہ وہ تصویریں یہیں رکھ دے..... یوں بھی نیکٹو جانے کہاں محفوظ تھے اور ان کی ہزاروں کاپیاں تیاری جاسکتی تھیں۔

○

اپنی کار کی طرف جاتے ہوئے اسے آج نجانے کیوں ہمارا کبر علی ٹوٹ کر یاد آئی۔ ہمارا کبر شیردانی نے اس سے کہا تھا کہ جس دنیا میں وہ داخل ہو گیا ہے اس سے باہر جانے کا راستہ شاید اسے کبھی نہ مل سکے۔ اس نے ارسلان سے کتنی منت سماجت کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اس دلدل سے باہر نکل آئے کیونکہ جیسے جیسے وہ آگے جائے گا دلدل اور گہری ہوتی جائے گی۔

تب وہ کتنا محسوس تھا.....!

ملک صاحب اور مسز ملک نے اس کی مصمصیت کا خون کیا تھا۔ دونوں قاتل تھے۔ ارسلان عزیز و دلدادہ محمد عزیز قوم جٹ سکنہ چک انہتر کے قاتل۔

ان لوگوں نے ارسلان سے اس کی شناخت چھین لی تھی۔

اسے درندہ بنانے پر قتل کئے تھے۔

اس کا گھربار خویش قبیلہ سگلی، ساتھی، لڑکپن، جوانی، کچھ بھی تو اس کا نہیں رہا تھا۔ اسے یاد آ گیا۔ باپ نے مرنے سے پہلے لکھ دیا تھا۔ اخبارات میں شائع کر دیا تھا:

”ہر گاہ کہ مسی ارسلان عزیز جو کہ میرا حقیقی پسر ہے، میرا نافرمان ہو چکا

ہے۔ میں اسے اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے عاق کرتا ہوں۔ اس

کے کسی لین دین کا ذمہ دار نہیں ہوں گا۔ میرا یا میرے دیگر خاندان کا اس

سے کوئی تعلق نہ ہے۔“

جانے آج اسے رہ رہ کر ساری بھولی بھری باتیں کیوں یاد آ رہی تھیں۔ تب تو اسے اشتہار پڑھ کر غصہ آیا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ اب جیتے جی وہ کبھی اپنے باپ کا منہ نہیں دیکھے گا۔

لیکن.....!!

اس روز جب اچانک کچھ دیر کے لئے اس کا ضمیر جاگا اور اس نے چاہا کہ باپ سے معافی مانگ لے تو گاؤں کے چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر ہی اسے علم ہو گیا کہ محمد عزیز ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ محکمہ ریلوے کا انتقال ہو چکا ہے۔

اس کے باپ کو مرے ہوئے تو تین ماہ ہو چکے تھے۔

کیسا غیر مت مندانسان تھا اس کا باپ!

کیسا شاندار عہد نبھایا تھا اس نے!

واقعی جیتے جی اس نے ارسلان کا چہرہ نہ دیکھا۔

”ارسلان تم پر لعنت ہو۔ خدا تمہیں ذلیل و خوار کرے۔ دفع ہو جاؤ۔ تمہاری سزا یہی ہے کہ تمہیں معافی نہیں مل سکتی۔ میں تمہیں اپنے دودھ کی دھاریں کبھی نہیں بخشوں گی۔ تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ نکل جاؤ دفع ہو جاؤ۔ لعنتی! تم رائدہ درگاہ ہو۔ تم نے اس شخص کی جان لے

لی جس کے وجود سے اس گھر کے اینٹ پتھر سانس لیا کرتے تھے۔ وہ زندہ تھا تو ہم سب بھی زندہ تھے۔ تم ہم سب کے قاتل ہو۔ چلے جاؤ اس سے پہلے کہ میری نسلی غیرت جاگ اٹھے اور میں اپنے مجازی خدا کے قاتل کی جان لے لوں..... چلے جاؤ..... نکل جاؤ.....!“

اس کی ماں نے اس کی شکل پر تھوک کر گھر کا دروازہ اس پر بند کر دیا تھا۔ اس پر لعنت بھیج کر اس سے ناطہ توڑ لیا تھا۔

”ماں اتنی ظالم نہیں ہوتی۔“ اس روز انٹیشن کی طرف لوٹتے ہوئے ارسلان نے سوچا۔

”شاید یہ میری ماں ہی نہیں۔ شاید مرنے والا میرا باپ ہی نہیں تھا۔ شاید میرا کبھی کوئی وجود ہی نہیں رہا۔ شاید میں ارسلان عزیز جٹ کبھی تھا ہی نہیں۔“

یہ کڑھ زندہ وجود والا شخص جس کا سایہ میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے جانے کون ہے؟ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے الوداعی نظران کھیتوں اور کچے راستوں پر ڈالی جہاں قدم قدم پر اس کی معصومیت بکھری پڑی تھی۔ جہاں اس کا بچپن سکیاں لے رہا تھا۔ اس زمین میں اس کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ جانے شہر کے ظالم لوگوں نے اس پر کیا سحر پھونک دیا تھا کہ ارسلان عزیز نے اپنی جڑوں پر خود ہی کلبھاڑا چلا لیا۔

اسے سمجھ نہ آ سکی کہ جس مقدس زمین سے اس کا رشتہ جڑا تھا اس نے ارسلان کے کینسر زدہ وجود کو خود سے کاٹ کر اس لئے پھونک دیا تھا کہ کہیں اس کا زہر ساری زمین میں سرایت نہ کر جائے۔

اس کا سیم تھوڑا زہر وجود اس مٹی کو بانجھ کر ڈالتا۔

لیکن.....!!

اس کے بہادر باپ نے زمین کی آبرو بچالی۔ اس نے اپنی زمین کی ہریالی کو موت نہیں آنے دی۔ اپنے وجود کے کینسر زدہ حصے کو کاٹ کر پھینک دیا۔

توبہ کے سارے دروازے ایک ایک کر کے بند ہوتے چلے گئے۔ آج اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وہ تو حالات کے ہاتھوں میں اپنی بد اعمالیوں کے سبب کھ پتی بن کر رہ گیا تھا۔

یہ سانولی سی..... کسی کمین گھرانے کی فاحشہ عورت جو اپنی حرام کاری کے ہاتھوں ملک

صاحب کی داشتہ سے بیوی بن چکی تھی۔

اب یہ عورت اسے نچائے گی۔

اور وہ بندر کی طرح اس کی ڈمگڈگی پر ناچے گا۔

”نہیں مسز ملک! نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ تم دو کوڑی کی عورت۔ تم مجھے ارسلان عزیز جٹ کو اپنا بندہ بے دام بنانے چلی ہو۔ تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ میرا حسب نسب کیا ہے..... میں تمہیں اوقات یاد دلا دوں گا نجمہ بیگم۔ کوئی بات نہیں آج اگر میری لگائیں تقدیر نے تمہارے ہاتھ میں دے دی ہیں تو کیا ہوا۔ میں گدھا گاڑی میں بندھنے والا گدھا نہیں ہوں۔ میں شہ زور منہ زور گھوڑا ہوں۔ تمہیں کس نے حق دیا ہے میری پیٹھ پر سواری کرنے کا؟“

جانے وہ عالم وحشت میں کیا کیا خواب دیکھتا رہا۔

جانے وہ کب تک دشت اتان میں بھٹکتا رہا۔

کہ اچانک اس کی پشت پر نجمہ ملک کی آواز بلند ہوئی۔

”ارسلان چلو! دیر ہو رہی ہے۔“

”ہاں دیر ہو گئی مسز ملک..... ہمیں چلنا چاہئے۔“ اس نے مڑتے ہوئے کہا۔

نجمہ کی زمانہ ساز نظروں نے اس کے اندر درتک جھانک کر دیکھ لیا تھا کہ گھوڑا بے لگام ہونے جا رہا ہے۔

”بے چارہ!“ وہ دل ہی دل میں مسکرائی۔

○

ملک صاحب کی سرکاری لیگ میں شمولیت کوئی معمولی خبر نہیں تھی۔

انقلابی سٹوڈنٹس فیڈریشن دو واضح دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک دھڑا جس کی قیادت نوید گروپ کر رہا تھا، ملک صاحب کے ساتھ تھا جبکہ دوسرا گروپ جس کی قیادت گجر کے ہاتھ تھی ابھی تک صوبائی لیگ سے جڑا تھا۔

ملک کو پہلے ہی سے امید تھی کہ گجر شاید اس کے قابو نہ آ سکے کیونکہ وہ اپنی قسم کا نوجوان تھا۔ آج تک ملک صاحب کو اس نے کبھی تھانے پکچہری کی زحمت نہیں دی تھی۔ یہ تو ملک صاحب پر بہت دیر بعد منکشف ہوا کہ اصل میں گجر کو بھنڈر کی پشت پناہی حاصل تھی۔

اور.....!

یہ بھنڈر ہی تھا جس نے کبھی گجر کے نزدیک پولیس کو پھنکنے ہی نہیں دیا تھا۔ پہلے تو ملک نے یہی چاہا کہ اپنے ”بالکون“ کی ایک پولیس کانسٹیبل بلا کر گجر پر سنگین الزامات کی فہرست جاری کروائے اور اس کی چھٹی کروادے۔

لیکن.....!

وہ صرف سوچ سکتا تھا۔ یہ کڑوا گھونٹ تو اسے بہر حال بھرنائی تھا کیونکہ فیڈریشن کے کھاتے میں وہ صوبائی لیگ سے اچھا خاصا ”خرچہ“ بٹور سکتا تھا۔ یہ تو اس کی اپنی لیاقت تھی کہ اس نے ذاتی اثر و رسوخ و جوانوں میں اتنا پیدا کر لیا تھا کہ اب وہ اور انقلابی فیڈریشن لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے تھے۔ ورنہ تنظیمی طور پر اس کا فیڈریشن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ صوبائی لیگ کی شروع ہی سے یہی پالیسی رہی تھی کہ فیڈریشن سے براہ راست کوئی تعلق کبھی نہ رکھا جائے۔ لیکن درپردہ اس کی مکمل پشت پناہی کی جائے۔ کیونکہ مروجہ سیاست میں لوگ نو جوانوں کی اہمیت کا بخوبی ادراک رکھتے تھے۔

انہیں علم تھا کہ سیاسی غنڈہ گردی کے بغیر سیاست اور سیاست دانوں کی حیثیت وہی ہے جو کسی بھی محلے میں رہنے والے ایک شریف شہری کی ہوا کرتی ہے۔ جس پر محلے کے بدمعاش سے لے کر علاقے کا تھانے دار تک رعب ڈال سکتا ہے۔

○

بھنڈر کو اب وزیر اعلیٰ کی مکمل آ شیر باد حاصل ہو چکی تھی۔

اس نے اپنی ماضی کی خدمات کے حوالے دے دے کر سٹوڈنٹس ونگ کا چارج سنبھال لیا تھا اور وزیر اعلیٰ کو یقین دلادیا تھا کہ چند ہفتوں کے اندر ہی اندر وہ ملک صاحب کو چھٹی کا دودھ یاد دلادے گا۔

وزیر اعلیٰ نے بھی یہ سوچ کر ”سانپ کو سانپ لڑے تو زہر کس کو چڑھے“ بھنڈر کی باگیں کھلی چھوڑ دیں۔ وہ بھی اس بات کو سمجھتے تھے کہ اصل میں بھنڈر کا ٹارگٹ ملک کی ذات ہے۔ اگر بھنڈر ملک کو نیچا دکھانے میں کامیابی حاصل کر لیتا تو یہ صوبائی لیگ کی فتح تھی اور آنے والے انتخابات میں اس کے بہت مثبت نتائج برآمد ہوتے۔ صرف ملک کے سیاسی منظر سے

ہٹانے کا مطلب تھا ایک شاندار فتح.....!!

اور اس شاندار فتح کے تصور میں سرشار صوبائی لیگ کی لیڈر شپ اب بھنڈر کی ڈگڈگی پر بالکل اسی طرح ناچ رہی تھی جس طرح کبھی وہ لوگ ملک کی ڈگڈگی پر ناچا کرتے تھے۔ بھنڈر نے پارٹی فنڈ کو ”حلوئی کی دکان اور ناناجی کی فاتحہ“ میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ آئے روز کوئی نہ کوئی کارروائی ڈال کر فنڈ زاپے قبضے میں کر رہا تھا اور صوبائی لیگ کی قیادت آنے والے انتخابات سے خوفزدہ اس کے اٹلے سیدھے مطالبات پورے کرتی رہی۔

نہلے پہ وہ ہلا

نیشنل چوک پر ویگن سٹینڈ سے پہلے ارسلان گروپ کے لوگ براہ راست غنڈہ ٹیکس وصول کیا کرتے تھے اور ویگن مالکان ہر مہینے ایک لگی بندھی رقم ان کے ہینڈ آفس میں پہنچا دیتے تھے۔ ایک دو مرتبہ انہوں نے مقامی بدمعاشوں کی خدمات بھی حاصل کیں کہ کسی طرح ان لوٹڈوں سے جان چھوٹ جائے۔

لیکن ناکام رہے.....!!

اڑے کی حد تک تو مقامی بدمعاشوں نے فائرنگ کر کے انقلابی تنظیم کے ”جھکوں“ کو بھگا دیا لیکن ویکٹوں کے روٹ بہر حال کالجوں کے سامنے سے گزرتے تھے اور کالجوں کی سامنے

والی سڑکوں پر جب طلباء نے دو تین دیکھوں کو نقصان پہنچایا تو مالکان نے پھر ان سے صلح کر لی۔ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ اس ضمن میں نہ تو پولیس ان کی مدد کر سکتی ہے نہ کوئی اور۔ جانے کتنی مرتبہ انہوں نے اعلیٰ افسران سے رابطے کئے اور ان کے ناز و خیرے اٹھائے تھے لیکن ہنڈیا سرے چڑھتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

جس روز انقلابی طلباء تنظیم دو حصوں میں تقسیم ہوئی تو دو تین مالکان کے لئے گویا ملی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اس سے پہلے وہ نوید گروپ سے ہی زیادہ ذلیل کیا کرتے تھے۔ انہوں نے پولیس کانفرنس کے اگلے ہی دن گجر گروپ سے ملاقات کی اور انہیں مقررہ سے آدمی رقم ماہوار وصول کرنے پر رضامند کر لیا۔ گجر گروپ کی طرف سے انہیں اس بات کی ضمانت دے دی گئی کہ ان کی دیکشیں بہر صورت محفوظ رہیں گی اور نوید گروپ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

دو تین مالکان کی یونین کے نمائندوں نے گجر گروپ سے رابطہ بھنڈر صاحب کے ذریعے کیا تھا اور یقین دہانی کروادی تھی کہ وہ ہر ماہ ایمانداری سے رقم بھنڈر صاحب کے کسی بھی مقررہ نمائندے کے حوالے کر دیا کریں گے۔

بھنڈر بھی ملک کے دانت دیکھنا چاہتا تھا۔

یہ بہترین موقع تھا اس کے لئے اپنے جانباڑوں کی صلاحیتیں آزمانے کا۔

اس نے گجر سے کہہ دیا تھا کہ بھلے وہ لوگ تعداد میں کم ہیں، لیکن صوبے میں ان کی بادشاہت ہے اور بادشاہت بھی ایسی کہ چڑیا پر نہیں مار سکتی۔ اس لئے گجر نے ان کی کوئی بات نہیں۔

”میں نے آئی جی سے کہہ دیا ہے اپنا بندہ ہے۔ بس ذرا بچ بچا کر کام کرنا اور ہاں زیادہ..... منہ مارنے کی ضرورت نہیں۔ ایک دو بڑے کام کر لیا کرو۔ آئندہ مجھے کسی اخبار میں کم از کم دکانداروں کے ساتھ تمہارے لڑکوں کے لڑائی جھگڑے کی خبر نہیں ملنی چاہئے۔ ذرا میری پوزیشن کا بھی خیال رکھا کرو.....!“ اس نے گجر سے کہا۔

”بھنڈر صاحب! آپ فکر ہی نہ کریں جناب۔ میں لڑکوں کو سمجھا دوں گا۔“ گجر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تین چار روز بعد جب معمول کے مطابق نوید گروپ نے دو تین اڈے کے مالکان سے رابطہ کیا اور ماہانہ کا تقاضا کیا تو ان کی طرف سے اڈے پر آ کر رقم وصول کرنے کی ہدایت ملی۔ گویہ

بات خلاف معمول تھی لیکن ارسلان سے مشورے کے بعد انہوں نے دلوڑوں کو بھیج دیا۔ دو تین اڈے والے جانے کب سے تاؤ کھائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے دونوں ”ہر کاروں“ کو قابو کر لیا اور پہلے تو مار مار کر ان کا بھر کس نکالا۔ پھر پولیس کو ٹیلی فون کر دیا۔

○

پلان کے مطابق انہوں نے کلاشکوف اور ماؤزر سمیت دونوں کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

ان کے خلاف غنڈہ گردی، فائرنگ اور زبردستی ٹیکس وصول کرنے کے الزامات لگائے گئے تھے۔ ان کا موٹر سائیکل دو تین والوں نے لوہے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا تھا۔

جب پولیس ملزمان کو گرفتار کر کے لے جا رہی تھی، عین ان لمحات میں اخبارات کے فوٹو گرافرز اور رپورٹرز بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ یہ لوگ بھنڈر صاحب کی خصوصی درخواست پر تشریف لائے تھے۔ انہوں نے موقعہ واردات پر ملزموں کی اسلحہ سمیت رگے ہاتھوں گرفتاری کی تصاویر اور خبریں مقامی ڈرائیور یونین کے نمائندوں کے بیانات کے ساتھ اگلے روز کے اخبارات میں نمایاں کر کے شائع کی تھیں۔

دو تین والوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر پولیس نے ملزموں کے ساتھیوں کو گرفتار نہ کیا جو بقول ان کے موقعہ واردات سے فرار ہو گئے تھے اور آئندہ اگر کسی دیکشن پر حملہ کیا گیا تو وہ پیسہ جام بڑتال کر دیں گے اور ان حالات کی ذمہ داری پھر سرسرا نظامیہ پر ہوگی۔

طے شدہ منصوبے کے مطابق گرفتار شدگان کی طرف سے پولیس نے بیان جاری کیا تھا کہ ان کا تعلق طلباء تنظیم کے نوید گروپ سے ہے اور انہیں مرکزی لیگ کے بعض لیڈروں کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ ایس ایس پی صاحب نے پولیس کانفرنس میں ان شخصیات کے نام صیغہ راز میں رکھے تھے جن کی پشت پناہی ان غنڈہ عناصر کو حاصل رہی تھی۔

○

ملک کے سامنے اخبارات پھیلے ہوئے تھے.....!

یوں تو اسے ”اپنے بندوں“ سے جو اخبارات میں موجود تھے، خبر کی اشاعت سے پہلے ہی اس بات کا علم ہو گیا تھا، لیکن اس نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ ملک جانتا تھا کہ فی الوقت

وہ اس پوزیشن میں نہیں کہ اخبارات میں خبر کو شائع ہونے سے روک دے۔

ارسلان نوید اور ان کے گروپ کے کچھ لوگ ملک صاحب کے سامنے بیٹھے تھے۔ ان میں دو تین وہ بھی تھے جن کے گھروں پر پولیس چھاپے مار چکی تھی۔ ملک کو احساس تھا کہ یہ خطرناک کھیل کس نے کھیلا ہے۔ زندگی میں شاید پہلی مرتبہ بھنڈر نے اپنے دل کے پھپھو لے پھوڑے ہیں اور اسے ملک صاحب کو نیچا دکھانے کا موقع ملا تھا۔

”تم دونوں فی الحال ادھر ادھر ہو جاؤ۔“ اس نے دو لڑکوں کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں ہدایت کی۔ ”میں ذرا بھنڈر کے دانت دیکھ لوں۔ ہماری ملی اور ہمیں کو میاؤں.....!“ غصے سے ملک کے ہونٹ پھڑپھڑائے۔

اس نے فوری طور پر پولیس کانفرنس کا بندوبست کیا تھا۔ اس پولیس کانفرنس سے نوید اور ارسلان نے خطاب کرنا تھا، لیکن عین وقت پر مسز ملک کی خواہش پر ملک صاحب نے ارسلان کا نام واپس لے لیا۔

”ارسلان کو اب آہستہ آہستہ سٹوڈنٹس پالیٹکس سے نکال لو۔ میرے خیال سے یہی بہتر ہے۔“ نجمہ نے اسے کہا۔

ملک صاحب جانتے تھے کہ نجمہ ملک اسے لندن کا ایک چکر لگوا چکی ہے اور اس کے دھندے کی نوعیت سے بھی وہ واقف تھے۔ یوں بھی حالات آج کل ان کے لئے سازگار نہیں تھے اور وہ اپنی ہزیمت کے تمام بدلے کسی آنے والے وقت پر اٹھا رکھنا چاہتے تھے۔

نجمہ ملک جانتی تھی کہ اب صوبائی لیگ ایک ایک کر کے ملک کی کمزور بنیوں کو دو بائے گی اور ایک روز وہ ارسلان کو بھی گرفتار کر لیں گے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ارسلان گرفتار ہو۔ اس نے ارسلان کو اس ”معدے کھیل“ سے نکال کر ”بڑے کھیل“ کا کھلاڑی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

نوید اور اس کے ساتھیوں نے پولیس کانفرنس میں صوبائی لیگ پر جوابی الزامات عائد کرتے ہوئے کہا کہ صوبائی لیگ نے ان کو رسوا کرنے کے لئے یہ گھٹیا ہتھکنڈہ استعمال کیا ہے اور ان کے دوستوں کو جو کسی کام سے جا رہے تھے راستے سے اغوا کر کے وٹیکن اڈے پر پہنچایا گیا جس کے بعد ان پر جھوٹے الزامات لگا کر انہیں گرفتار کیا گیا ہے۔ انہوں نے پولیس کو وارننگ دی تھی کہ اگر وہ اسے نہیں سنبھالتے تو اسے گرفتار کر لیا جاتا۔

انتظامیہ پر عائد ہوگی۔

انہوں نے صوبائی لیگ کے لیڈروں سے درخواست کی تھی کہ وہ طلباء کے معاملات میں مداخلت بند کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی ہوشیوں اور کالجوں کو غیر طلباء عناصر سے پاک کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس پولیس کانفرنس کے شرکاء نے صوبائی لیگ پر الزام عائد کیا تھا کہ وہ درس گاہوں کا امن و امان تباہ کر کے انہیں سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

پولیس کانفرنس کے خاتمے پر نوید اور اس کے ساتھی غائب ہو گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اب پولیس ان کو گرفتار کرنے کے لئے سرگرم ہوگی اور فی الوقت وہ پولیس کو گرفتاری نہیں دینا چاہتے تھے۔

پولیس کانفرنس میں انقلابی طلباء تنظیم کی دھمکیاں اعلیٰ قیادت کو پہنچادی گئی تھیں جہاں سے پولیس کو ہدایت کی گئی تھی کہ ان دھمکیوں کو بالکل خاطر میں نہ لائے اور بلیک میلنگ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دے۔

بھنڈر والی کانفرنس کی طرح ملک صاحب والی کانفرنس کی خبریں بھی اخبارات نے..... شہ سرخیوں سے شائع کیں لیکن ان کی وارننگ نظر انداز کر دی گئی اور اسی روز آئی جی نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ پولیس کسی کو امن و امان تباہ کرنے کی اجازت نہیں دے گی اور اگر طلباء نے بھی خلاف قانون حرکت کی تو ان کے ساتھ سختی سے نمٹا جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دفعہ 144 کا نفاذ کر دیا اور چار سے زیادہ لوگوں کے اجتماع کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے اسلحہ لے کر چلنے پر پابندی عائد کر دی۔

علی الصبح پولیس کی لاریوں نے پہلے ہی ان کالجوں کو گھیرے میں لے لیا تھا جہاں نوید گروپ کے لوگوں کی طرف سے شورش کا خطرہ تھا۔

حالات کے پل پل کی خبر ملک صاحب کو مل رہی تھی۔

اس وقت وہ مرکزی لیگ کے ایک وزیر کے گھر میں فروکش تھے جہاں مرکزی لیگ کا اہم اجلاس چل رہا تھا۔ اس اجلاس میں مقامی پارٹی یونٹوں کو فوری طور پر ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کی ہدایات جاری کر دی گئیں۔ راتوں رات نزدیکی شہروں سے پارٹی کارکن اس شہر میں جمع ہونے لگے تھے۔ پارٹی کے جہالوں کو انقلابی طلباء تنظیم کی مدد کرنے کی خصوصی ہدایت جاری کر دی

گئی تھی۔ انہیں ان کے کام سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ مینٹگ درخواست ہو گئی۔

24 گھنٹے گزر گئے.....!

اس دوران پولیس نے دونوں مجرموں کو رہا تو کیا کرنا تھا۔ ان کی ”نشاندہی“ پر ان کے دس بارہ اور ساتھی دھر لئے۔ نوید ملک کے بھی وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے لیکن وہ مفرد تھا۔

24 گھنٹے مکمل ہونے پر مرکزی لیگ کی طرف سے ایک ہنگامی پریس کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ جس سے مرکزی لیگ کے صوبائی صدر نے خطاب کیا اور صوبائی حکومت سے درخواست کی گئی کہ وہ امن عامہ کو تباہ کرنے سے احتراز برتے۔

ملکی خمدوش حالات اور بین الاقوامی صورت حال کی طرف اشارہ کر کے صوبائی حکومت سے درخواست کی گئی کہ اس مرحلے پر وہ طلباء کو مشتعل نہ کریں اور نہ ہی انہیں اپنے سیاسی مقاصد کے لئے آلہ کار بنائیں۔ اس پریس کانفرنس میں ایک ٹرانسپورٹ یونین کے صدر صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ جنہوں نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ انہیں طلباء سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی کیونکہ طلباء اس قوم کا مستقبل ہیں اور مستقبل کی حفاظت کرنا ان سب کی ذمہ داری ہے۔ انہوں نے کہا کہ طلباء کی آڑ میں کچھ غنڈہ عناصر اگر ویگن والوں کو تنگ کرتے ہیں تو اس کے لئے ساری طلباء برادری کو مورد الزام ٹھہرانا سراسر زیادتی ہے۔

صدر صاحب نے مقامی ویگن ڈرائیور یونین کو خود ساختہ اور پولیس کے ٹاؤٹ قرار دیتے ہوئے اخبار نویسوں کو یقین دہانی کروائی کہ ٹریفک کا پیہ جام کرنے والوں کی کوئی حیثیت نہیں اور وہ کبھی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ انہوں نے مرکزی ٹرانسپورٹ یونین کی طرف سے عوام کو بھی یقین دہانی کروائی کہ ان کے ہوتے ہوئے عوام کو کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ صدر صاحب نے طلباء سے اپیل کی تھی کہ وہ اپنی صفوں میں موجود غیر طلباء اور غنڈہ عناصر کو نکال باہر کریں اور ان کے ساتھ تعاون کریں۔ انہوں نے پولیس سے طلباء کو رہا کرنے کی اپیل کی تھی۔

ملک صاحب اپنا ایک ایک مہرہ بڑی کامیابی سے آگے بڑھا رہے تھے۔

”شطرنج کے کھیل کا مزہ ہی تب آتا ہے جب مقابل بھی کم از کم اپنے پائے کا کھلاڑی

ہو۔“

انہوں نے مرکزی وزیر صاحب کے سامنے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”سائیں! اگر

بھنڈر جیسے گدھے ہمیں سیاست پڑھانے لگیں ہمارے لئے تو پھر اس ملک میں کوئی جگہ باقی نہ رہی تاں..... ہمیں تو پھر شاید سیاست ہی کو خیر باد کہنا پڑے گا۔“

○

مرکزی لیگ کے کھل کر سامنے آنے پر صوبائی قیادت نے ایک مرتبہ تو ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کیونکہ اس مرحلے پر طلباء کے ہنگامے جب کہ انہیں مرکزی لیگ کی پشت پناہی بھی حاصل ہوتی، صوبے کے لئے کوئی نیک شگون نہیں تھے۔

لیکن.....!

بھنڈر گر روپ اپنا دباؤ برابر بڑھا رہا تھا۔

انہوں نے سیاسی قیادت کو باور کروا دیا تھا کہ اگر انہوں نے پہلے ہی حملے میں ہتھیار پھینک دیئے تو شاید اگلے الیکشن پر انہیں ٹکٹیں بانٹنے کے لئے ڈھنگ کے امیدوار ہی نہ مل سکیں۔ اس نے اس لڑائی کو اپنی اور ملک کی ذاتی جنگ میں بدل دیا تھا اور وہ صوبے کے امن و امان کی بھینٹ دے کر بھی اس جنگ میں فتح حاصل کرنا چاہتا تھا۔

صوبائی قیادت کو احساس تھا کہ بھنڈر کے ساتھ ایک مضبوط پریشہ گر روپ موجود ہے اور وہی ایک ایسی شخصیت ہے جو مستقبل میں شاید ملک کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کر سکے۔

بادل خواستہ انہیں مضبوط سٹینڈ لینا پڑا۔

آئی جی کا پولیس کو حکم جاری ہو گیا کہ ہنگامہ آرائی کی صورت میں پولیس فورس کو استعمال کر کے سختی سے ہنگامہ کچل دیا جائے کیونکہ وزیر اعلیٰ صاحب کسی کو بھی قانون اپنے ہاتھوں میں لینے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھے.....!

اندر کی ایک ایک خبر ملک کو ”اپنے بندوں“ کے ذریعے مل رہی تھی۔ اس نے اپنے ”گوریلوں“ کو آخری ہدایات جاری کیں اور مرکزی وزیر کے ساتھ ”ٹائٹ کوچ“ سے دارالحکومت روانہ ہو گیا۔

○

اگلے ہی روز ملک صاحب کے گوریلے حرکت میں آ گئے۔

ہنگاموں کا آغاز مقامی کالج کے سامنے ایک ویگن کو روک کر نذر آتش کرنے سے

اس دوران ایک افسوسناک واقعہ بھی ہو گیا۔ جب پولیس کی جوابی فائرنگ سے ایک بے گناہ طالب علم جوانی جان بچانے کے لئے بھاگ رہا تھا مارا گیا.....!!

مرنے والا اپنے والدین کی واحد اولاد نہ تھی۔ وہ مقامی بارکونسل کے عہدے دار کا بیٹا تھا جس کے متعلق ہر شخص قسم کھا کر کہہ سکتا تھا کہ اس نے کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ وہ شاندار تعلیمی کیریئر کا حامل نوجوان تھا اور مستقبل کا ڈاکٹر.....!

پولیس کا موقف تھا کہ اسے گولی پولیس نے نہیں ماری بلکہ وہ طلباء کی فائرنگ سے ہی مرا ہے۔

لیکن.....!!

وہاں پولیس کی بات کا یقین کون کرتا؟ اخبار نویسوں نے پولیس کے اندھا دھند لائچی چارج کی تصاویر اتار لی تھیں۔ ایک ڈی ایس پی صاحب نے جب اپنی پولیس افری کی دھونس میں ایک اخبار کے نوٹروگرافر سے گالی گلوچ کی تو وہ بھی مقابلے پر ڈٹ گیا جس پر پولیس نے اسے بھی ڈنڈوں کی زد پر لے لیا۔ بے چارے کا کیمرا ٹوٹ گیا۔ اس پر لائشیاں برساتے پولیس کے ”شیردل جوانوں“ کی تصاویر دوسرے اخبار کے نوٹروگرافروں نے اتار لی تھیں۔

ہر نوٹروگرافر سے کیمرا چھین کر توڑ ڈالنا پولیس کے بس سے باہر تھا۔ اس واقعے نے اخبار نویسوں میں پولیس کے خلاف جذبات مزید بھڑکا دیئے۔

○

شام ڈھلنے تک ہنگامہ قدرے فرو ہو گیا۔

رات گئے مقامی ایس ایس پی صاحب ایک ایک اخبار کے دفتر جا کر ڈی ایس پی کے سلوک کی معافی مانگتے رہے۔ انہوں نے فوری طور پر ڈی ایس پی کو معطل کر کے لائن حاضر کر دیا تھا۔ ایک دو اخبارات نے ان کی درخواست پر ”ہاتھ نرم“ رکھا۔

لیکن.....!

ملک کے دو تین مقتدر اخبارات نے جن کے تعلقات مرکزی لیگ سے بھی خوشگوار تھے واقعات کی صحیح رپورٹنگ اور تصویر کشی کر دی۔ اخبار نویسوں پر پولیس کے لائچی چارج نے اخباری برادری کو الگ مشتعل کیا تھا۔ بے گناہ طلباء اور خصوصی مقامی بارکونسل کے عہدے دار کے ہونہار

ہوا۔ طلباء نے ونگین کی ساریوں پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر جان بچا کر بھاگ گئے اور طلباء نے پولیس کی آنکھوں کے سامنے ونگین کو نذر آتش کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی دوسرے مقامی کالج کے طلباء حرکت میں آئے اور انہوں نے کالج کے سامنے موجود پولیس پر خشت باری شروع کر دی۔ نجانے ان لوگوں نے اتنے اینٹ پتھر کیسے کلاچ کی چھت پر جمع کر لئے تھے۔ شاید وہ ایک عرصے سے اسی موقعے کے منتظر تھے۔ جب پولیس نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے طلباء پر آنسو گیس پھینکنی شروع کی تو کالج کی چھت سے پولیس پر فائرنگ شروع ہو گئی۔

اس فائرنگ کرنے والے کو کسی نے نہیں دیکھا..... اس نے اپنا کام مکمل کیا۔ پولیس پر تین چار برسٹ مارے اور کالج کی چھت سے اتر کر چپ چاپ غائب ہو گیا۔

پولیس نے اس دوران جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔

جواب میں نوید گروپ کے طلباء بھی پولیس پر پستولوں سے گولیاں چلانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی مقامی مجسٹریٹ نے پولیس کو کالج میں داخل ہونے کا حکم دیا اور ڈنڈا بردار پولیس فائرنگ کی آڑ میں کالج میں داخل ہو گئی۔ پولیس کو کالج پر حملہ آور ہوتے دیکھ کر شریہند طلباء یوں غائب ہوئے جیسے انہیں زمین نکل گئی ہو۔ خدا جانے انہوں نے فرار کے لئے کون سا راستہ منتخب کر رکھا تھا۔

بے گناہ طلباء جو بے چارے اپنی کلا سوں میں منہ پر گیلے رومال رکھے آنسو گیس کا عذاب بھگت رہے تھے۔ ان لوگوں نے فرار ہوتے ہی اپنی جانیں بچانے کے لئے جیسے ہی کلا سوں سے باہر نکلے پولیس کے ڈنڈا بردار جیالوں کے قابو میں آ گئے۔

پولیس والے ابھی جانب کب سے تاؤ کھائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے چند منٹوں میں ہی انہیں روٹی کے گالوں کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔

پندرہ بیس دھ موئے طلباء کو اپنی لاری میں ٹھونس کر پولیس کا ایک گروپ حوالات کی طرف روانہ ہو گیا۔

○

یعنی کہانی دوسرے دو مقامات پر دہرائی گئی.....!

بیٹے کی موت نے عوام میں پولیس کے خلاف خاصا جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔
ہسپتال سے مقتول طالب علم کی لاش وصول کرنے اس کے غزدہ لواحقین بھی گئے تھے
لیکن وہ منہ دیکھتے رہ گئے۔

لاش غیظ و غضب سے پھرے مرکزی لیگ کے درکروں نے وصول کی اور ان کے
صوبائی صدر کے جو شیلے خطاب کے فوراً بعد لاش کو وہ جلوس کی شکل میں اٹھا کر گورنر ہاؤس کی طرف
روانہ ہو گئے۔

سیکورٹی کے ذمہ دار پل پل کی خبر اعلیٰ حکام کو پہنچا رہے تھے۔

پھرے ہوئے ہجوم کو گورنر ہاؤس کی طرف بڑھتے دیکھ کر پولیس نے راستے ہی میں
ناکہ بندیاں کر لی تھیں۔ دو تین ناکہ بندیاں تو پارٹی کے جیالوں نے روند ڈالیں، لیکن گورنر ہاؤس
سے کچھ فاصلے پر پولیس چوکس تھی۔ پولیس افسران نے پھرے ہوئے ہجوم سے لوٹ جانے کی
درخواست کی اور انہیں یقین دلایا کہ ان کے مطالبات پر عمل ہوگا اور ذمہ داروں کے خلاف
کارروائی ہوگی۔
لیکن.....!

ہجوم لاش کو گورنر ہاؤس تک لے جانے پر بضد رہا۔ وہ لوگ گورنر ہاؤس سے براہ
راست بات کر کے اپنے جذبات پہنچانے اور یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد ہی وہاں سے
واپس جانے کو تیار تھے۔ ان کی اس ہچکچاہٹ خواہش کی تکمیل پولیس کے اختیار میں نہیں تھی۔
بالآخر ایس پی صاحب نے ہجوم کو اس بات پر بھی رضامند کرنا چاہا کہ ان کے ذمہ داروں
چار لواحقین گورنر صاحب کو خود جا کر اپنے جذبات سے آگاہ کر دیں۔
لیکن.....!

یہاں کوئی ان کی سننے کو تیار ہی کب تھا۔ اس دوران ہجوم میں موجود کچھ لوگ اپنی غلط
حرکات سے پولیس کو مسلسل اشتعال دلاتے رہے لیکن پولیس والے صبر و سکون سے کھڑے
رہے۔ اس سے پہلے کہ مقتول کے لواحقین جو خاصے شریف اور صلح پسند لوگ تھے، پولیس کی بات
مان لیں۔ ہجوم نے نعرے بلند کئے اور پولیس پر ڈنڈوں سے حملہ کر دیا۔

پولیس کو بادل خواستہ جوابی حملہ کرنا پڑا۔ جیسے ہی جوابی حملہ کا آغاز ہوا، جیلے دم دبا کر

بھاگ اٹھے۔ انہوں نے جنازہ وہیں سڑک پر رکھ دیا تھا۔ اب ایک اور ستم ظریفی ہوئی جب جلوس
نے شہر کا رخ کیا۔ وہ تو ادھر ادھر بکھر کر پولیس پر خشت باری کرنے لگے جب کہ غزدہ اور بے حال
مقتول کے لواحقین اپنے بچے کی لاش اٹھانے کو آگے بڑھے اور پولیس نے ان پر ڈنڈا بازی شروع
کر دی۔

اخبار نویسوں کے قلم اور کمرے حرکت میں آئے اور ”بے گناہ مقتول طالب علم کے
لواحقین پر پولیس کے وحشیانہ لاٹھی چارج“ کی تصاویر بننے لگیں.....!
پولیس اور ہجوم کی آنکھ بچو لی دو تین گھنٹے جاری رہی۔ جس کے بعد مرحوم کو پولیس کی
نگرانی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

○

اگلے روز کے اخبارات مقتول کے لواحقین پر پولیس کے لاٹھی چارج کی تصاویر کے
ساتھ نئے وزیر اعلیٰ کے سامنے رکھے تھے جو بھنڈر کے ساتھ منہ لٹکائے میٹنگ میں بیٹھے تھے۔
اچانک ہی وزیر اعلیٰ کے خصوصی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے چیف سیکرٹری ان سے مخاطب
تھا:

”جناب والا! آئی جی صاحب کو اسٹیمبلشمنٹ ڈویژن نے واپس بلوا لیا ہے۔ ان کی
خدمات ایک مرتبہ پھر مرکزی حکومت نے حاصل کر لی ہیں اور ان کی جگہ.....“
نوجوان وزیر اعلیٰ نے فون رکھ کر تازہ اطلاع وہاں موجود پارٹی لیڈروں تک منتقل کر
دی۔

”مرکز براہ راست اس لڑائی میں کود پڑا.....!“ بھنڈر نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔
”ہاں بھنڈر صاحب اور آپ کی مہربانی سے مرکز کو فی الوقت عوام کی ہمدردیاں بھی
حاصل ہو گئی ہیں..... کیا خیال ہے آپ کا؟“
وزیر اعلیٰ کا لہجہ خاصا طنزیہ تھا۔

”میرے خیال سے جناب والا ہمیں فی الوقت کوئی اہم فیصلہ کرنا ہے۔ ہم صوبے کے
عوام کی ہمدردیاں کھو کر شاید صوبائی وزارت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔“ جنرل سیکرٹری نے اپنی
رائے پیش کی۔

اس کے بعد مختلف لوگ اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ آخر میں انہوں نے وزیر اعلیٰ کی طرف دیکھا جنہوں نے حتیٰ فیصلہ کرنا تھا۔

تمام گرفتار طلباء کو رہا کر دیا جائے..... اخبار نویسوں اور عوام پر لاطھی چارج کا حکم دینے والے افسران کو فی الوقت لائن حاضر کیا جائے..... سنوڈنٹ لیڈر شپ کے ساتھ فوری طور پر میٹنگ ارجح کی جائے۔“ وزیر اعلیٰ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”لیکن جناب! ٹرانسپورٹ.....؟“ بھنڈر کے منہ سے نکلا۔

وزیر اعلیٰ نے ایک مرتبہ پھر کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا، پھر منہ موڑ کر اپنے سیکرٹری سے مخاطب ہوئے..... ”ٹرانسپورٹروں کے بھی ایک دو ڈھنگ کے نمائندے بلا لیجئے..... بھنڈر صاحب آخر اپنی برادری کو تو نظر انداز نہیں کریں گے.....!“ وزیر اعلیٰ نے آخری فقرہ کہہ کر اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ چپکالی۔

”آئیے حضرات! کھانا تیار ہے۔“ وزیر اعلیٰ کے اشارے پر کسی نے کہا اور وزیر اعلیٰ خود کھانے کی میز کی طرف بڑھے۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ اب فیصلے پر..... اپنے لوگوں کو رائے زنی کا موقعہ دیں نہ ہی وہ اس مرحلے پر کسی اپنے یا پرانے کی ناراضگی مول لے سکتے تھے۔

مستقبل پر نظر رکھنے والے ٹھنڈے مزاج کے نوجوان وزیر اعلیٰ نے لُچ کی میز پر کسی کو موقعہ نہیں دیا تھا کہ وہ اس مسئلے پر بات کرے۔ انہوں نے گفتگو کا رخ موڑ دیا تھا۔

دو گھنٹے کے اندر اندر ہنگامی میٹنگ طلب کر لی گئی تھی۔ اس میں تمام طلباء تنظیموں کے نمائندے شامل تھے۔ اعلیٰ صوبائی افسران کی اس میٹنگ کی سربراہی ایک مقامی وزیر صاحب کر رہے تھے۔ نوید اور گجر بھی دوسرے طلباء لیڈروں کی طرح یہاں موجود تھے..... فضا خاصی خوشگوار تھی۔

قریباً سب ہی لوگ چہروں پر منافقانہ مسکراہٹ سجائے ایک دوسرے کے الزامات سن رہے تھے۔ بلا خرابا ہی افہام و تفہیم کے ساتھ ان کے ساتھ معاہدہ طے پا گیا۔

ذمہ دار پولیس افسران لائن حاضر ہو گئے.....!

گرفتار طلباء رہا کر دیئے گئے۔

اس کے ساتھ ہی وزیر اعلیٰ نے مرکز سے صوبائی معاملات کو خراب نہ کرنے کی اپیل کی تھی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ مرکزی لیگ کے شریک عناصر لاشوں پر سیاست کی عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔ انہوں نے ڈی آئی جی صاحب کو ہدایت کی تھی کہ بد قماش اور مشتبہ عناصر پر نظر رکھی جائے اور مجرم کو مجرم کرنے سے پہلے ہی کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے.....!

○

”واہ ملک صاحب! واقعی سیاست آپ کا میدان ہے.....!“ جیسے ہی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی ”سب اچھا“ رپورٹ مرکز میں موصول ہوئی، وزیر داخلہ نے ملک صاحب کی بے ساختہ تعریف کرتے ہوئے کہا۔

اس بات پر کوئی شک بھی نہیں تھا کہ اگر ملک صاحب کی جگہ کوئی معمولی اعصاب کا آدمی ہوتا تو پانسہ ان کی طرف پلٹ جاتا۔ ملک نے کمال حرام کاری سے اپنے مہرے ایک ایک کر کے آگے بڑھائے تھے لیکن وزیر اعلیٰ نے جس دانشمندی سے معاملات کو سنبھالا تھا، اس پر مرکزی لیگ کو ضرورت و تشویش لاحق ہو گئی تھی اور وہ سمجھنے لگے تھے کہ مستقبل میں وزیر اعلیٰ ان کے لئے خطرات پیدا کر سکتا ہے۔

”سائیں! دیکھتے جاؤ۔ ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔“ ملک صاحب نے مونچھوں کو تڑپاتے ہوئے کہا۔

وہ اسی روز شام کی فلائٹ سے واپس اپنے شہر آ گئے۔ جب ہوائی اڈے کے لاؤنج میں ایک رپورٹر نے ان سے صوبے میں ہونے والے حالیہ واقعات پر تبصرہ کرنے کو کہا تھا تو ملک صاحب نے فرمایا کہ وہ چونکہ دار الحکومت میں موجود تھے اس لئے مقامی حالات پر تبصرہ نہیں کر سکتے، البتہ ان کا ”محاط ترین تبصرہ“ یہی تھا کہ کسی کو قانون ہاتھوں میں لینے کی اجازت نہیں دینی چاہئے اور تعلیمی درسگاہوں میں سیاسی جماعتوں کی مداخلت بند ہونی چاہئے۔ انہوں نے مرکزی لیگ کی طرف سے آئندہ انتخابی حکمت عملی سے متعلق سوالات کے جوابات دینے سے انکار کر دیا۔ ملک جانتا تھا کہ صوبائی لیگ نے فی الحال اس کی طرف سے آنکھیں بند کی ہیں، لیکن یہ لوگ مستقبل میں اسے نظر انداز نہیں کریں گے اور اب اس کو بہت سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھانا پڑے

آتش فشاں

ارسلان کے لئے نجمہ ملک ایک مستقل ذہنی عذاب بنی ہوئی تھی۔ اس کا ضمیر رہ رہ کر اس کی مردانگی پر کچھ کے لگا رہا تھا کہ وہ ایک عورت کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہا ہے۔ خود وہ بہت کچھ کر گزرتا چاہتا تھا لیکن ابھی وہ بے بس تھا۔ بھارتی سفیر کا تبادلہ اچانک ہی کئی دوسرے ملک میں کر دیا گیا تھا۔ کانتا نے روانگی سے پہلے اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ اس نے ارسلان سے کہا تھا کہ وہ جلد ہی اس سے رابطہ قائم کرے گی۔

انٹیلی جنس کے لئے اس میں اگر کوئی دلچسپی تھی تو اسی حوالے سے تھی۔ جب یہ حوالہ چھٹ گیا تو وہ لوگ بھی پیچھے ہٹ گئے۔ رضوی صاحب اس سے کبھی بکھار مل لیا کرتے تھے۔ اپنی حب الوطنی اور وطن دوستی کے حوالے سے یہ شخص ارسلان کو پسند کرتا تھا۔ رضوی صاحب نے بھی اسے ایک دوست کے ناطے سے یہی مشورہ دیا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو وہ طلباء سیاست سے کنارہ کشی کر لے۔

ایک دو مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کسی روز اعتماد میں لے کر وہ رضوی صاحب کو نجمہ ملک کے کروتھ اور خود پریتنے والی قیامت سے آگاہ کر دے لیکن وہ کبھی خود میں اتنا حوصلہ نہ پاسکا۔ پھر

گا۔

اور یہ تھی بھی حقیقت! صوبائی قیادت نے اس کے خطرے کو نظر انداز نہیں کیا تھا اس کے لئے پیش بندی شروع کر دی تھی۔



اس نے ان لوگوں کے قریب سے دیکھ کر اندازہ کر لیا تھا کہ اپنی سطح پر یہ سب لوگ بے بس ہیں اور صرف احکامات کی تعمیل کرتے ہیں۔ انہیں اپنی رائے دینے کا حق حاصل نہیں..... یوں بھی ایک انسپکٹر بے چارہ اس کے لئے کیا کر سکتا تھا؟

اس کے لئے فی الوقت خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑے رکھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ”میرے خیال میں تم سٹوڈنٹس پالیٹکس سے علیحدگی کا اعلان کر دو، کیونکہ معاملات بہت بگڑ چکے ہیں۔ یوں بھی اب تمہیں اپنی لائن تبدیل کر لینی چاہئے.....!“ نجمہ ملک نے گھر پہنچتے ہی اسے رائے دی۔

”لیکن ملک صاحب کو اس طرح اچانک چھوڑ دینا.....“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔
”نہیں ایسی بات نہیں۔ تم مجھے یا ملک صاحب کو نہیں صرف طلباء سیاست کو خیر باد کہہ رہے ہو۔ میں نے اور ملک صاحب نے مل کر تمہارے مستقبل کی بہتری کے لئے ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔“ نجمہ ملک نے اس کی بات کاٹ کر سرگرمیٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”آج کل آپ میری بہتری کی کچھ زیادہ ہی فکر کرنے لگی ہیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے نکل گیا۔

”تم ہمارے اپنے جو ہو.....!“ نجمہ ملک نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

وہ ارسلان کو بچوں کی طرح بہلا رہی تھی.....!
شاید اسے ارسلان کی صورت میں کوئی کھلونا ہاتھ لگ گیا تھا۔ کتنی اذیت پسند تھی وہ.....!

”یہاں کی آب و ہوا بھی کچھ سازگار نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ ایک آدھ چکر لندن کا اور لگالو..... کچھ تمہارا دل بھی بہل جائے گا۔“
اس کی تجویز معقول تھی۔

گو کہ اس ”چکر“ کا مطلب ارسلان اچھی طرح سمجھتا تھا لیکن وہ کم از کم کچھ عرصے کے لئے اس سے دور تو رہ سکتا تھا۔ یوں بھی اب اس نے لاشعوری طور پر شاید اس ملک کو چھوڑ دینے کا فیصلہ ہی کر لیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شاید دنیا کے کسی دوسرے ملک میں اپنے حالات سے کٹ کر وہ ایک الگ اور مطمئن زندگی کا آغاز کر سکے گا.....!

”ٹھیک ہے.....!“ اس نے کہا۔
”کل تم پریس کانفرنس میں طلباء سیاست سے علیحدگی کا اعلان کر دو۔“ نجمہ ملک نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

○

اگلے روز ایک ہوٹل میں ارسلان کی طرف سے کچھ اخباری نمائندوں کے سامنے طلباء سیاست سے علیحدگی کا اعلان ہو گیا۔ اس نے کہا کہ کالجوں میں سیاسی جماعتوں اور غیر طلباء عناصر کی مسلسل مداخلت کے خلاف ایک عرصہ تک جنگ جاری رکھنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اس..... گمنامی سیاست کو خیر باد کہہ دے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی توجہ سیاست سے ہٹا کر صرف تعلیم پر مرکوز کر دیں اور اپنے والدین کا سہارا بنیں جو نجانے کیا کیا تم جھیل کر اپنے مستقبل کا سہارا بناتے ہیں۔ ارسلان نے اپنے مستقبل کے عزائم سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ اب اس کی زندگی کا مقصد معاشرے کے پسماندہ طبقات کی خدمت ہے اور اس نے اپنی باقی زندگی اصلاح معاشرے اور خدمت خلق کے لئے وقف کر دی ہے..... اس ضمن میں اس نے نجمہ ملک صاحبہ کی ”فلاحی فاؤنڈیشن“ سے منسلک ہونے کا اعلان کیا تھا۔

ارسلان نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ فلاحی فاؤنڈیشن عنقریب غریب اور نادار مریضوں کے لئے ایک فری جنرل ہسپتال قائم کر رہی ہے جس کے لئے زمین حاصل کر لی گئی ہے۔ اس فاؤنڈیشن کے تحت پہلے ہی سے غریب اور بیوہ عورتوں کے لئے ایک سلائی کڑھائی سیکھنے کا مرکز قائم ہے۔ اس کے علاوہ یتیم بچوں کے لئے وہ لوگ ایک گوشہ عافیت بھی قائم کرنا چاہتے ہیں۔
پریس کانفرنس کے خاتمے پر وہ جب گھر کی طرف آ رہا تھا تو ایک ٹریفک سگنل پر اسے روک لیا گیا۔

وہ اندازہ نہ کر سکا کہ پریس کانفرنس کے فوراً بعد ہی جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوا تو ایک جیب اس کا تعاقب کرتی اس کے ساتھ ہی یہاں تک آئی تھی۔ شاید اس جیب کے وائر لیس سیٹ سے ہی اگلے چوک میں پولیس کو ہدایت ملی تھی کہ وہ اس کا روک روک لے۔

”لائسنس دکھائے جناب!“ ایک سارجنٹ نے اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔

”لیکن کیوں.....؟“ ارسلان کو غصہ آ گیا۔

”میں بتاتا ہوں..... آپ ذرا گاڑی سے باہر تشریف تو لائیں۔“ اس کے تعاقب میں آنے والی جیپ سے ایک شخص نے باہر نکلے ہوئے کہا۔

جیپ انہوں نے اس طرح اچانک اس کی گاڑی کے ساتھ لگا کر کھڑی کی تھی کہ وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کون ہو تم لوگ.....؟“

خطرے کا احساس ہوتے ہی اس نے کار کے ڈیش بورڈ میں اپنے پستول کو پکڑنا چاہا۔ جیسے ہی اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی جیپ سے اترنے والے نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر اسے جھک مارا اور کار کا دروازہ دوسرے ہاتھ سے کھول کر اسے باہر نکال لیا۔

ارسلان کی مدافعت سے پہلے ہی باقی جیپ سوار اس کے سر پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے بڑی پھرتی سے پستول نکال کر اس کی کینٹی سے لگا دیا۔

”خبردار! زیادہ ہوشیاری نہ دکھانا۔“ اس نے لکارتے ہوئے کہا۔

پولیس والے اس دوران بڑے اطمینان سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ارسلان کو غصے کے ساتھ حیرانی بھی ہو رہی تھی کہ یہ لوگ اس کی مدد کیوں نہیں کرتے۔

اس نے دو تین مرتبہ پولیس والوں کو گالی دے کر اپنا تعارف بھی کروایا تھا، لیکن کسی نے اس کی طرف منہ موڑ کر دیکھا بھی نہیں تھا۔

”الو کے پٹھے۔ ہم بھی پولیس والے ہیں اور تمہیں گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں۔“ سفید پوشوں نے اسے دھکے دے کر جیپ کی طرف گھسیٹے ہوئے کہا۔ انہوں نے اسے قریب آٹھا کر ہی جیپ میں پھینکا تھا۔ تین آدمی اس کو سنبھال کر بیٹھ گئے۔ چوتھے نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور جیپ چل پڑی۔

ارسلان پاگلوں کی طرح کبھی انہیں گھورتا، کبھی ان سے پوچھنے لگتا کہ آخر وہ اسے کیوں پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔ اس نے اب تک نجائے کتنی مرتبہ انہیں دھکیا دی تھیں کہ وہ ان کی پیشیاں اتروادے گا۔

جب اس کی زبان کسی طرح بند ہی نہ ہوئی تو ان میں سے ایک نے اس کی کینٹی پر ایسا زوردار تھپڑ رسید کیا کہ ارسلان کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

”سالا چپ ہی نہیں کرتا.....!“ دوسرے نے زوردار گھونسا اس کے منہ پر جڑ دیا۔ اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا۔

غصے اور تکلیف سے پیچ و تاب کھاتے ارسلان نے جب مزاحمت کرنا چاہی تو تینوں اس پر پل پڑے اور چند منٹ ہی میں اسے آلے دال کا بھاد بتا دیا۔

○

جہاں وہ لوگ اسے لائے تھے وہ شاید ان کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہ سفر اس نے شدید تکلیف میں کاٹا تھا۔ وہ قریباً نیم بے ہوش تھا۔ جیپ ایک قلعہ نما کونٹھی کے لان میں داخل ہو رہی تھی جس کے دروازے پر ایک مسلح سپاہی موجود تھا۔ اس نے گیٹ کھولا تھا۔

گیٹ سے اندر داخل ہو کر انہوں نے گیٹ کے ساتھ بنی ایک چمک پوسٹ کے رجسٹر میں کچھ اندراج کیا اور جیپ آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دور جا کر جیپ پھر ایک جگہ رک گئی۔ انہوں نے قصائی کے بکرے کی طرح اسے گریبان سے پکڑ کر نیچے کھینچا اور زمین پر گرتے ہی اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔

خدا جانے یہ کیوں کی جگہ تھی۔ یہاں انسان بستے تھے یا درندے..... ارسلان نے دیکھا کہ اسے مار پڑتے دیکھ کر سامنے کی بیرک سے دو اور سفید پوش ڈنڈے تھامے بھاگتے ہوئے وہاں آ گئے۔ وہ ارسلان پر اس طرح لاٹھیاں برسا رہے تھے جیسے وہ گوشت پوست کا انسان نہیں، کوئی آہنی قلعہ ہے جسے وہ سر کرنے جا رہے ہوں۔

اسے اپنے بدن کی ساری ہڈیاں چٹختی محسوس ہو رہی تھیں۔

خونفردہ بچوں کی طرح وہ گڑگڑا رہا تھا۔ ان سے معافیاں مانگ رہا تھا۔ اس کا سارا طنطنہ دم توڑ چکا تھا لیکن یہ لوگ اس کی منت سماجت پر دھیان دیئے بغیر اسے جانوروں کی طرح پیٹ رہے تھے۔ مارتے مارتے وہ اسے گھسیٹے ہوئے بیرک کے سامنے بنے سیلوں کی طرف لے جا رہے تھے۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے آخری منظر یہی دیکھا۔ ان سیلوں سے خونفردہ

دے رہے تھے اسے جھانک رہے تھے۔

اس کے ہمراہیوں نے انہیں بھی گالیاں دے کر اپنے منہ دوسری طرف کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے ہنسنے کے ساتھ چلنے والی مشینوں کی طرح اپنے منہ دیواروں کی طرف پھیر لئے۔

ارسلان اب چیختے چیختے بے ہوش ہو چکا تھا.....!

انہوں نے ارسلان کے نیم مردہ جسم کو گھسیٹا اور اسے ایک سیل میں ردی کے ڈھیر کی طرح پھینک کر اسے باہر سے تالا لگا دیا۔

○

تھوڑی دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو اس نے محسوس کیا جیسے اس کے بدن کی ساری ہڈیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ اسے اپنا بدن گوشت کا بے جان لوتھڑا محسوس ہو رہا تھا۔ منہ میں خون کا ذائقہ ابھی تک محفوظ تھا اور جہاں تک وہ اپنی گردن گھما کر دیکھ سکتا تھا، اسے اپنے بدن پر نیل ہی نیل دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے حلق میں جیسے کسی نے کانٹے دار جھاڑیاں اگا دی تھیں۔ اس کے لئے تھوک نگھٹنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

اس بات کا اندازہ تو اسے ہو گیا کہ یہ بھی سیکورٹی کے لوگ ہیں لیکن اسے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر وہ اسے یہاں کیوں لائے ہیں؟

وہ تو ان کے لئے کام کرتا آیا ہے اور یہ لوگ اسے مارنے کے لئے یہاں لائے ہیں؟
”اوئے اٹھ اوئے۔ ہاتھ باہر نکال۔“ اچانک ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ ایک شخص پانی کا ڈول لئے سیل کے باہر کھڑا تھا۔ ارسلان سہمے ہوئے چوڑے کی طرح سیل کی سلاخوں کے نزدیک آ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیر باہر نکال دیئے تھے۔ آواز دینے والے نے اسے منہ کھولنے کی ہدایت کی..... اور..... ارسلان نے اس کے حکم پر جانوروں کی طرح منہ کھول دیا۔ اس شخص نے وحشیانہ تہقیر لگایا اور پانی کا ڈول اس کے منہ پر پھینک دیا۔ کچھ پانی اس کے حلق میں چلا گیا اور زیادہ اس کے کپڑوں پر۔

گھبرا کر اس نے اپنے ہاتھ پیچھے کر لئے۔

لیکن..... جواب میں دو چار گالیاں کھا کر وہ دوبارہ اسی ایکشن میں واپس آ گیا۔ ایک مرتبہ پھر اس پر پانی پھینکا گیا۔ تیسری مرتبہ اس شخص نے باہر سے پانی اٹھایا اور اس کے حلق میں

ڈال دیا۔

”کیوں بھئی! ہوش آ گیا؟“ یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔

ارسلان کا حلق تو تر ہو گیا لیکن گیلے کپڑے اب تک اس کے زخموں سے چمٹ رہے تھے۔ ابھی بمشکل تین چار منٹ ہی گزرے تھے جب وہاں تین بٹے کئے ملازم آن دھمکے۔ ان کے تعاقب میں وہی شخص آ رہا تھا جس نے جیب میں اس کی ٹھکانی کی تھی۔

ارسلان اہم گیا.....!!

”باہر نکالو! اس لیڈر کی اولاد کو۔ اس کی کمبل پر یڈ کراؤ ذرا۔“ اس نے تینوں کو حکم

دیا۔

ان میں سے ایک نے اس کے سیل کو کھولا اور باقی دونوں نے اسے جانوروں کی طرح باہر نکال لیا۔

ارسلان چیختا چلاتا ہی رہ گیا..... وہ اسے گھسیٹتے ہوئے ایک کمرے کی طرف لے گئے۔ تیسرا جس نے اس کے سیل کا تالا کھولا تھا، اب اپنے ہاتھوں میں ایک کمبل پکڑے وہاں کھڑا تھا۔ ان لوگوں نے کونے میں رکھے بڑے بڑے ڈنڈے تھام لئے۔

اچانک ہی تیسرے نے دھکا دے کر اسے زمین پر گرادیا۔ چیختے چلاتے ارسلان کو یوں لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ اس نے چاہا کہ اپنے ہاتھ پاؤں ہلا کر کمبل سے نجات حاصل کر لے کہ اچانک اس کے بدن پر عذاب نازل ہونے لگا۔ تینوں نے اس کو ڈنڈوں سے پٹینا شروع کر دیا۔

ارسلان کی چیخیں بھی گھٹ کر رہ گئی تھیں۔

اسے یوں لگا جیسے وہ مر رہا ہے.....!

آہستہ آہستہ اس کے بدن سے جان نکل رہی ہو.....!

لیکن وہ زندہ رہا.....

○

انہوں نے اسے مرنے نہ دیا..... بے ہوش ہونے پر اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے پھینک کر وہ اسے ہوش میں لے آتے۔

جب تینوں تھک گئے تو اسے ہوش میں لا کر خود اپنے انچارج کے اشارے پر باہر چلے گئے۔

اب دونوں اندر اکیلے ہی بیٹھے تھے۔ یہ وہی شخص تھا جو اسے اغوا کر کے لایا تھا۔
”کیوں بے دماغ ٹھکانے آ گیا ہے یا نہیں..... اگر لیڈری کا بھوت دماغ سے نہیں نکلا تو ایک آدھ کورس اور کرا دوں؟“

”نہیں جناب..... خدا کے لئے نہیں.....“ وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگا۔
”اب کان کھول کر سن لو۔ جو سوال کروں اس کا صحیح جواب دینا۔ اگر ذرا سی بھی ہوشیاری دکھائی تو دونوں بازو اور ٹانگیں توڑ کر جیل میں بھیںٹکوا دوں گا اور ساری زندگی ابا جوں کی طرح ریگتے ریگتے مرجاؤ گے۔“

ارسلان کو احساس ہو رہا تھا جیسے یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کرنے پر قادر بھی ہے۔ ”م..... میں بتاؤں گا.....!“ وہ کھکھکیا۔

”تم انڈیا کے لئے کب سے جاسوسی کر رہے ہو؟“ پہلے سوال نے اس کی جان نکال دی تھی۔

”ک..... کیا مطلب؟ کیا مطلب؟“ جیسے اس کے کانوں میں کسی نے پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔

اس کا مطلب ہے کہ ابھی تمہارا دماغ ٹھکانے پر نہیں آیا۔ ابھی تھوڑی کسر باقی ہے۔
انچارج افسر نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

”دیکھئے جناب! میں اس وقت آپ کے اختیار میں ہوں۔ جو چاہے آپ میرے ساتھ کر سکتے ہیں، لیکن ایسا گھناؤنا الزام مجھ پر نہ لگائیے..... مجھے گولی مار دیں لیکن آپ مجھ سے ایسے جرم کا اقبال نہیں کروا سکتے جو مجھ سے سرزد ہی نہیں ہوا۔“

انچارج حیران تھا۔

کہ جیسے اچانک ہی اس کا واسطہ بدلے ہوئے ارسلان سے پڑا ہو۔ اس الزام نے جیسے اچانک ہی ارسلان کو دلیر بنا دیا ہو۔ ورنہ کچھ دیر پہلے تک تو وہ سب سے ہونے چوزے کی طرح اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ ایک دو لمحے کے لئے وہ بے یقینی کے سے عالم میں اس کی طرف دیکھتا

رہا۔ شاید وہ کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتا تھا۔
”اچھا گویا تم اس طرح نہیں مانو گے.....؟“ یہ کہہ کر اس نے کمرے کے ایک کونے میں گھٹنی کاٹن دبایا۔

دو ملازم ایک ساتھ اندر آئے.....!

”اسے لاؤ اوئے ذرا..... موہن لال کو.....!“

اس نے دونوں کو حکم دیا۔

”ابھی پتہ چل جاتا ہے بیٹا.....!“ انچارج نے ارسلان پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔
تھوڑی دیر بعد ہی ایک ادھ موآ دی آ گیا۔ جس کو وہ موہن لال کہہ کے مخاطب کرتے تھے۔

”اسے جانتے ہو.....؟“ اس نے ہاتھ باندھے موہن لال کو مخاطب کیا۔
”ہاں جناب! اس کا نام ارسلان ہے۔ میں ان سے ہی ملنے جا رہا تھا۔“ موہن لال نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

ارسلان ہکا بکا ہی رہ گیا.....!

اس کا سر چکرانے لگا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دن میں تارے ناچتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے زندگی میں کبھی اس شخص کی جھلک نہیں دیکھی تھی جس نے ارسلان کی حیثیت سے نہ صرف شناخت کیا بلکہ اس کے سارے ٹھکانے، فون نمبر، ماضی کے خاصے واقعات بھی بیان کر دیئے۔

ارسلان کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے؟ کدھر جائے؟ یہ شخص کون تھا؟ اسے کس نے اس کے متعلق اتنا کچھ بتا کر یہاں بھیجا تھا؟

”لے جاؤ اسے!“ انچارج نے حکم دیا اور وہ لوگ موہن لال کو واپس لے گئے۔

”دیکھو بچو! یہاں تو گونگے بھی بولنے لگتے ہیں۔ تمہاری تو پھر بھی زبان ہے۔“

اچانک ہی ارسلان کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔

”کہیں کانتا نے تو اس شخص کو نہیں بھیجا؟“ اس نے رضوی صاحب کے کہنے پر کانتا کو

ایسا تاثر دیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ ملنے کے لئے تیار ہے۔“

”آفسر تم غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہو..... پہلے میری پوری بات سن لو۔ اس کے بعد جو دل چاہے کر لیتا۔“

”بکو!“ انچارج نے اسے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

ارسلان نے اسے کانتا کے ساتھ ملاقات کی ساری کہانی سنا دی اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ رضوی صاحب کا آدمی ہے۔ انچارج اس کی تمام باتوں کے نوٹس لے رہا تھا۔ اس نے رضوی صاحب کا نمبر نوٹ کیا اور اسے کچھ سوچتے ہوئے واپس سیل میں بھیج دیا۔

اس مرتبہ وہ لوگ اسے آرام سے لائے تھے۔ سیل میں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد اسے کاغذ قلم مہیا کیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ تمام واقعات بلا کم و کاست لکھ دے۔

کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے کہانی لکھنی شروع کر دی۔

رات تک اس نے ساری کہانی لکھ دی۔

رات کا کھانا اسے ایک سیل میں دیا گیا.....!

آدھی رات کو پھر وہ لوگ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس مرتبہ اس کے سامنے تین آدمی بیٹھے تھے۔ دوبارہ اسے سارے واقعات سنانے کے لئے کہا گیا تھا۔ تینوں اس سے باری باری سوالات کرتے رہے..... قریباً دو اڑھائی گھنٹے بعد انہوں نے اسے کافی پلائی۔ اب ان کا رویہ خاصا ”مہربانہ“ ہو گیا تھا۔ کافی پینے کے بعد ارسلان کو ہوش نہ رہا.....!

○

جب ہوش آیا تو وہ شہر کے ایک پارک میں ایک بچ پر لیٹا تھا۔ کسی نے اسے جھنجھوڑ کر بیدار کیا تھا۔ شاید یہ اس باغ کا کوئی مالی تھا۔

دھوپ میں اس کا بدن جلنے لگا تھا..... سارا جسم پسینے سے شرابور اور دکھتا ہوا پھوڑا بن رہا

تھا۔

”باؤ جی! کوئی لمبا ہی کش لگایا ہے..... دوپہر ہو گئی ہے اور آپ دھوپ میں سو رہے

ہیں۔ شاید نشہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا.....!“ مالی نے طنز سے کہا۔

”شکر کرو باؤ جی۔ کسی پولیس والے نے نہیں دیکھا ورنہ.....“ اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ

گیا۔

ارسلان نے جان لیا کہ انکوائری پر اس کا بیان سچ ثابت ہوا تھا اور وہ لوگ اسے یہاں پھینک کر چلے گئے۔ شاید اس کا اندازہ صحیح تھا اور کانتا کے حوالے سے بھارتی انٹیلی جنس نے کسی جاسوس کو اس کے پاس بھیج دیا تھا۔

اور شاید اس کے ملک کی کاؤنٹر انٹیلی جنس نے تفتیش کے لئے یہی طریقہ مناسب سمجھا تھا۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہاں لوگوں کے متعلق کیا رائے قائم کرے۔

بڑبڑاتے ہوئے اس نے بے شمار گالیاں دیں اور ایک رکشہ کے ذریعے گھر پہنچا۔ رکشے والے کو بھی اس نے دھمکی دے کر جانے پر رضامند کیا تھا۔ ورنہ اس کی حالت دیکھ کر تو کوئی اسے بٹھانے کے لئے بھی رضامند نہ ہوتا۔ گھر پر نجمہ بیگم بے چینی سے اس کی منتظر تھی.....!! اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔

دوسرا روپ

”کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟“ اس نے ایک ہی سانس میں بہت کچھ

پوچھ لیا۔

”ٹھیک ہے کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی۔“ ارسلان نے صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

”کیسی غلط فہمی..... تمہاری یہ حالت کیسے؟ کل سے تم کہاں غائب ہو؟“ مسز ملک کی

بیقراری بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

”چائے کے لئے کہہ دیجئے۔ بتاتا ہوں۔“ اس نے پہلو بدل کر کہا تو منہ سے کراہ نکل

گئی۔

مسز ملک اب اس کے نزدیک پہنچ کر گہری اور تشویشناک نظروں سے اس کا جائزہ لے

رہی تھی۔

”زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟“ اس نے دونوں ہاتھوں سے ارسلان کے کندھوں پر دباؤ

ڈال کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

ارسلان اس کی طرف دیکھ کر صرف مسکرا کر رہ گیا۔

وہ جانتا تھا مسز نجمہ ملک کو یہی فکر دامن گیر ہو گئی ہوگی کہ کہیں ان کا گھوڑا زخمی ہی نہ ہو گیا

ہو۔

بیرے کو طلب کر کے اس نے چائے وہیں لانے کو کہا تھا۔ ارسلان نے اس سے درد کی گولیاں بھی منگوائی تھیں۔ ابھی تک اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ ایک دو منٹ وہ چھت کو اور مسز ملک کو گھورتا رہا۔ پھر ہاتھ روم کی طرف چل دیا۔

اس نے چپ چاپ چائے کے ساتھ دو گولیاں نگلیں۔ پھر نجمہ ملک کی طرف متوجہ ہوا۔ ”مجھے علم نہیں وہ لوگ کون تھے۔ انہوں نے مجھے کارروک کر اغوا کر لیا اور اپنے آفس میں لے گئے۔ اس کے بعد میری یہ حالت بنائی اور رات ہی کسی وقت باغ میں پھینک کر چلے گئے۔“ اس نے مختصر بات کرنا چاہی۔

”مخالف تنظیم کے لوگ تھے کیا؟“ نجمہ ملک کو الجھن سی ہونے لگی۔

”نہیں سرکاری لوگ تھے۔“

”کیسے کہہ سکتے ہو تم؟“

”میں بھائی ہوش و حواس ہوں مسز ملک۔“ اسے نجانے کیوں غصہ آ رہا تھا، لیکن وہ

سنجھل گیا۔

نجمہ ملک صرف مسکرا کر رہ گئی۔

”آخر کوئی الزام تو ہوگا تم پر؟ کچھ تو وہ کہتے ہوں گے؟“ نجمہ ملک نے اس کے نزدیک

بیٹھ کر بڑی اپنائیت سے دریافت کیا۔

”ہاں۔“ ارسلان نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا پھر کہا۔ ”شاید آپ سننا پسند نہ

کریں۔“ اس نے اندھیرے میں تیر چلا دیا۔

”تم کہو ارسلان! میں ہر وقت ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتی

ہوں۔“ اس نے سگریٹ کا گہرا کش لگایا۔

”ان کا کہنا تھا کہ میں نے لندن کا چکر آپ کے کام سے لگایا ہے۔“ ارسلان کو اچانک

ہی نجانے کیا سوچھی۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔

”کس کام سے؟“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

ارسلان نے اندازہ لگالیا تھا کہ اس کا اندھیرے میں چھوڑا تیر نشانے پر لگا ہے۔ مسز

ملک کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لئے بدلا تھا، لیکن فوراً ہی اس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔
”کس کام سے! یہی تو وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ یہی تو وہ مجھ سے اگلوں چاہتے تھے۔“

”پھر؟“

”پھر کیا۔ میں نے سرے سے اس بات کو تسلیم ہی نہیں کیا کہ مجھے آپ نے بھیجا ہے۔ میں نے یہی اصرار کیا کہ میں اپنی مرضی سے گیا ہوں۔ میں نے ان کے سامنے ایک ہی رٹ لگائے رکھی کہ وہ مجھے اعلیٰ حکام کے حکم پر تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں اور مجھے سیاسی اختلافات کی سمیٹ چڑھایا جا رہا ہے۔“

”پھر کیا ہوا؟“ مسز ملک کی بے چینی بڑھتی چلی جا رہی تھی اور ارسلان خاصی تسکین محسوس کر رہا تھا۔

”پھر کیا! وہ مجھے گھما پھرا کر اس طرف لاتے تھے کہ میں نے ضرور کوئی غلط کام کیا ہے اور آپ سے نزدیک ہونے کا کچھ اور ہی مطلب لے رہے تھے۔“

”گدھے..... الو کے پٹھے.....!“ نجمہ ملک نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”گھبرائیے نہیں مسز ملک۔ میں زبان کا مرد ضرور ہوں۔ میں نے آپ پر آنچ نہیں آنے دی۔ اگر وہ مجھ سے کچھ اگلوں میں کامیاب ہو جاتے تو مجھے یوں پھینک کر نہ چلے جاتے۔ میں نے سارا عذاب اپنی جان پر جھیلنا ہے۔“ اس نے دل ہی دل میں نجمہ ملک کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

”کوئی اور چکر تو نہیں تھا؟“ اچانک ہی نجمہ نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”ابھی تو نہیں، مستقبل کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں گاڑی کہاں ہے؟ یہ واقعہ کمیٹی چوک میں پیش آیا۔ شاید گاڑی وہیں موجود ہو یا پھر پولیس کے پاس ہوگی۔“

”تم گاڑی کی فکر نہ کرو۔ جہنم میں گئی گاڑی۔ یہ سارا سیاسی چکر ہے۔ وہ لوگ ملک پر ہاتھ ڈالنے کے لئے کوئی نہ کوئی قربانی کا بکرا ضرور تیار کریں گے۔ آخر حکومت یہ سب کچھ ٹھنڈے پیڑوں تو برداشت کرنے سے رہی۔“ ارسلان جانتا تھا کہ آخری فقرہ اس نے ارسلان سے زیادہ

اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے کہا تھا۔

”اب انہیں یقین ہو گیا ہو گا کہ میں بہر حال قربانی کا بکرا نہیں۔“ اس نے چلتے چلتے اچانک ہی مڑ کر نجمہ ملک کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

نجمہ ملک نے اس کے لہجے کی کاٹ محسوس کر لی تھی، لیکن خلاف معمول وہ مسکرائی نہیں۔ ارسلان خوش ہو رہا تھا کہ اس نے کم از کم نجمہ ملک کو کچھ عرصہ کے لئے تو ذہنی اذیت سے دوچار کیا۔

وہ نہیں جانتا تھا اچانک ہی اس کے ذہن میں عود کر آنے والے اس خیال نے نجمہ ملک کے دل میں ہمیشہ کے لئے تشکیک کا زہر بھردیا ہے۔ یہ خبر کہ حکومت کی انٹیلی جنس ایجنسیاں اس پر کسی دوسرے سلسلے میں بھی شبک کر سکتی ہیں یا اس کا ”غیر ملکی بزنس“ حکومت کے علم میں ہے اس کو پریشان کر دینے کے لئے کافی تھا۔

○

نجمہ ملک کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ سجاد خان سے اس کے روابط کی خبر سرکار دربار تک بھی پہنچ گئی ہے۔

جب ارسلان اپنے کمرے میں کپڑے تبدیل کر کے بستر پر لیٹا خاصا سکون محسوس کر رہا تھا۔

عین ان ہی لمحات میں مسز ملک اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر باغ میں سرو کے پودوں پر نظریں جمائے سگریٹ کے مرغولے فضا میں بکھیر رہی تھی۔ وہ بڑے مضبوط اعصاب کی عورت تھی۔

اگر عام قسم کی عورت ہوتی تو حوادث کے جن طوفانی تھیڑوں سے اس کا ماضی میں واسطہ رہا تھا ان کی زد میں کبھی کی ٹوٹ کر کھرجکی ہوتی۔

لیکن.....!

آج وہ پریشان تھی.....!

ارسلان کی اس اطلاع نے کہ اس سے سیکورٹی والے نجمہ ملک کی ”دوسری حیثیت“ کے متعلق پوچھ گچھ کرتے رہے تھے اسے پریشان کر دیا تھا۔

وہ بہت ہوشیار عورت تھی۔ اس نے کوئی ایسا کھواپے پیچھے نہیں چھوڑا تھا کہ کوئی اس پر شک کر سکے۔ سجاد خان سے اس کے تعلقات کی نوعیت کا صحیح علم تو ملک صاحب کو بھی نہیں تھا۔ ملک کو صرف اتنا علم تھا کہ وہ خاصی اونچی اڑ رہی ہے۔

یورپ اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ملک نے اس کا سبب جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ خوش تھا کہ نجمہ بیگم خوش ہے۔ اس کا علم تو اسے بعد میں ہوا کہ دراصل اس نے نجمہ کو نہیں پھنسا یا تھا، خود وہ اس کے جال میں پھنسا تھا..... اور ایسا پھنسا تھا کہ پھر پھنستا ہی چلا گیا.....!“

نجمہ بیگم نے جب پہلا پھیرا لگایا تو ملک کو بڑے فخر سے اپنے اس ”کارنامے“ سے آگاہ کیا تھا اور ملک نے بھی اسے ”بیگم صاحبہ کی ادا“ سمجھ کر قبول کر لیا۔ وہ جانتا تھا سوسائٹی کی جن بیگمات میں نجمہ کا اٹھنا بیٹھنا ہے، ان میں کچھ ایسی بھی ہیں جو کبھی کبھی بطور شغل یا پھر محض چینیج کے لئے اس طرح کا ایک آدھ پھیرا لگاتی ہیں۔

درجنوں معزز گھرانوں کی بیگمات کو وہ جانتا تھا جو یورپ کی مختلف جیلوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہی تھیں۔ ان میں سے کچھ تو ایسی نوجوان لڑکیاں بھی تھیں جو عمال حکومت کی نزدیکی رشتہ دار تھیں۔

ملک کی اطلاع کی حد تک نجمہ بیگم نے ایک دو پھیرے خود ہی لگائے تھے جس کے بعد سے ارسلان اس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ عین ممکن ہے اس نے ارسلان سے پہلے بھی کسی کو ان ”خدمات“ پر مامور کیا ہو۔

لیکن ملک صاحب کو اس کا علم نہیں تھا کہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا جو گروہ اس کے گرد اکٹھا رہتا ہے، ان میں سے کتنے لوگ نجمہ بیگم کے قریب اور کتنے ”زیادہ قریب“ ہیں۔

بہت ہوشیار اور سیاسی جوڑ توڑ کے ماہر ملک صاحب کو تو اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ اس کی لاڈلی بیگم نے اس شہر کے دو معزز گھرانوں کی لڑکیوں کو یورپ کی جیلوں میں پہنچا دیا ہے۔ ایک پہلے ہی پکڑ میں اور دوسری بد قسمت لڑکی تیسرے چکر میں پکڑی گئی تھی۔

دونوں نے عدالت میں چونکہ رضا کارانہ طور پر اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا، شاید اسی لئے انہیں دس دس سال قید کی سزا کا حکم ملا تھا.....!

ارسلان تو اس کا تیسرا شکار تھا۔

یہ اس کا کمال فن تھا کہ جہاں ایک طرف اس نے ملک ایسے گھاگ سیاستدان کو گھیرا تھا، وہاں اس نے سجاد خان ایسے بین الاقوامی شہرت یافتہ سمگلر کو بھی اپنی زلفوں کا اسیر بنا رکھا تھا.....!

اس کے تعلقات کی نوعیت کچھ بھی ہو، حیرانگی کی بات یہ تھی کہ سجاد خان اس کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔

وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا پانی جانے اس گھاٹ پر پلٹ پلٹ کر کیوں آتا تھا۔ یہ سانو لے بدن والی نجمہ.....!

پنجاب کے ایک پسماندہ دیہات کی رہنے والی بی اے پاس استانی۔ جس نے ایک ”سیاسی دعوت“ میں سجاد خان کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی محبوبہ اور اب ”بزنس پارٹنر“ بننے لگی تھی۔

ایک داؤ اگر سجاد خان اسے بتاتا تو دس داؤدہ سجاد خان کو سکھا دیتی تھی۔

اس کے اعتماد اور بے خوفی کو دیکھ کر کبھی کبھی تو سجاد خان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ یہ عورت اس میدان کی کوئی پرانی کھلاڑی ہے..... اس نے نو دہائیوں کی طرح کبھی ڈنگا تا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔

لیکن.....!

آج زندگی میں شاید پہلی مرتبہ وہ گھبرائی تھی۔

اس کا اعتماد پہلی مرتبہ ڈنگا یا تھا۔

اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ آج تک اس نے جرائم کی دنیا کا سفر بڑے اعتماد سے کسی خطرے کا سامنا کئے بغیر طے کیا تھا۔

پیسہ سفارش، ناز و ادب داب وہ ہر ہتھیار کا بہترین استعمال جانتی تھی۔ اپنے راستے میں آنے والی ہر دیوار کو اس نے پائے حقارت سے ٹھوکر مار کر گرایا تھا۔

لیکن.....!

آج جب اسے علم ہوا کہ ارسلان کو انٹیلی جنس والے اغوا کر کے لے گئے تھے اور انہوں نے اس پر تشدد کر کے نجمہ بیگم سے متعلق کوئی بات اگلوانے کی کوشش کی ہے تو زندگی میں پہلی بار اس

نے سنجیدگی سے حالات کی سنگینی کا ادراک کیا تھا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا تھا کہ اس ملک میں ”ان فیئر میوز“ ہر مرحلے پر کامیابی نہیں دلاتے۔ کبھی شکست بھی مقدر بن جاتی ہے۔ کبھی کبھی تمام ذرائع رکھنے کے باوجود بہترین اثر و رسوخ کے مالک بھی قابو آ جاتے ہیں۔ شاید یہی مکافات عمل ہے.....!

کیا وہ مکافات عمل کا شکار تو نہیں ہونے جارہی؟

اس نے سوچا اور لرز کر رہ گئی۔

اچانک ہی کچھ سوچ کر اس نے سجاد خان کو فون کیا تھا۔ یہ سجاد خان کا خصوصی نمبر تھا جس کا علم شاید نجمہ کے علاوہ بہت کم لوگوں کو رہا ہوگا۔

”کیا بات ہے کچھ پریشان لگ رہی ہو؟“ سجاد خان نے فون پر ہی اس کے تیور پہچانے کا دعویٰ کر دیا۔

”ایک ضروری بات تھی.....!“

”شام کو ”شالون“ میں ملتے ہیں۔“ سجاد خان محتاط آدمی تھا۔

”میں چھ بجے آؤں گی۔“

”اوکے!“ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

○

ارسلان گہری نیند سو رہا تھا جب وہ گھر سے روانہ ہوئی۔ کار وہ خود ہی چلاتی ہوئی شالون ہوٹل آئی تھی۔ اس فائوٹار ہوٹل میں سجاد خان کے لئے ایک کمرہ مستقل بک رہتا تھا۔ کمرے میں سجاد خان پہلے ہی سے اس کا منتظر تھا۔

نجمہ بیگم کی سیاسی اور معاشرتی حیثیت کے پیش نظر یہ احتیاط لازم تھی ورنہ سجاد خان نے خود سے متعلق کسی سیکنڈل کی کبھی پروا نہیں کی تھی، لیکن وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ نجمہ بیگم کے ساتھ کسی سیکنڈل کی خبر اخبارات تک پہنچے۔

ایسی کوئی بھی خبر اس کے بزنس اور خود اس کے لئے نقصان کا باعث ہو سکتی تھی۔ یہ عورت ملک کے ممتاز سیاستدان کی بیوی تھی جس کی آڑ میں اس نے ابھی لمبا شکار کھیلنا تھا۔

سجاد خان نے اس کی ساری بات بہت دھیان سے سنی۔ دو چار سوالات اس سے

دریافت کئے پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ نجمہ ہونٹوں سے کافی کی پیالی لگائے اس پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اچانک ہی وہ چلتے چلتے رک گیا..... یہ اس کا خاص انداز تھا۔ جب اس نے کوئی اہم بات کہنی ہوتی تو اسی طرح چونکا دینے والے انداز میں کہا کرتا تھا۔

”تم نے اس کی بات سے یہ کیسے اندازہ کر لیا کہ تفتیش کرنے والوں کا اشارہ اسی طرف تھا؟ اگر ایسی بات تھی تو وہ براہ راست بھی یہ سوال کر سکتے تھے؟ اور کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ مخالف تنظیم کے ہی لوگ ہوں جنہوں نے بظاہر سیکورٹی والوں کا لبادہ اوڑھ کر اسے اغوا کیا ہو؟“

سجاد خان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کے لئے تو نجمہ بیگم چکر اکر ہی رہ گئی۔

”یہ بھی تو ممکن تھا کہ ارسلان نے اسی کا داؤ اسی پر کھیلنا ہو۔ اس انکشاف کے بعد کہ وہ اسے بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں آ گئی ہے ارسلان کی حالت یقیناً جنجرے میں بند اس شیر کی سی ہو گئی تھی جسے تازہ تازہ افریقہ کے کسی جنگل سے پابند سلاسل کر کے یہاں لایا گیا ہو۔“

نجمہ بیگم کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ وقت سے پہلے ”ہنر والی“ بن گئی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ملک صاحب کے زیر سایہ ارسلان ایسے درجنوں نوجوانوں کی امانیت کب کی دم توڑ چکی تھی اور وہ اپنے منصب سے گر کر ملک صاحب کے بندہ بے دامن بن کر رہ گئے تھے، لیکن شاید ابھی ارسلان میں غیرت کی رقی باقی تھی۔ اس نے نجمہ بیگم کی غلامی کو مصلحتاً قبول کر لیا تھا، لیکن وہ بھی اب اپنے داؤ پر تھا.....!

سجاد خان نے اسے کہا تھا کہ وہ ایک دو دن کے اندر اندر کس ایجنسی نے اغوا کیا اور کیوں؟ کا جواب ڈھونڈ لے گا۔

اور..... نجمہ ملک سمجھتی تھی کہ جو کچھ سجاد خان نے کہا ہے وہ کچھ کرنے پر بھی قادر ہے۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور رسائی بہت دور تک تھی۔

لیکن..... اس بات کا اندازہ تب مسز ملک کو بھی نہ ہو سکا کہ اس مرتبہ معاملات اس کی رسائی سے بھی باہر ہیں۔

گھر آ کر اس نے اپنے چہرے سے کوئی غیر معمولی بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ وہ گاڑی جو ارسلان کے زیر استعمال رہتی تھی، گیراج میں کھڑی تھی۔ ارسلان کے ذریعے اسے معلوم

ہوا کہ گاڑی مقامی تھانے میں موجود تھی۔ کاغذات چونکہ مسز نجمہ کے نام تھے اس لئے پولیس نے اس سے ہی رابطہ قائم کیا تھا اور کار سے قیمتی آلات نکالنے کے بعد یہ کہہ کر انہیں لوٹادی کہ یہ کار نامعلوم مقام پر چھوڑ کر کوئی بھاگ گیا ہے۔

○

نجمہ بیگم کے بعد اب دوسری مسلسل چوٹ نے اسے تمللا کر رکھ دیا تھا۔

ایک لاواسا انتقام کی طرح اس کے اندر دیکھنے لگا تھا.....!

اس نے آج پہلی مرتبہ سنجیدگی سے اپنے ماضی کا جائزہ لیا تھا اور اب ایک پچھتاوا اس کی جان کو آگیا تھا۔

اس کا سب کچھ تو چھن گیا تھا۔ اس کو تواب تسلی دینے والا بھی کوئی نہیں رہا تھا۔ ”میں انتقام لوں گا۔ نجمہ بیگم تم سے اور..... اور.....“

نجانے وہ حالت جنون میں کیا کیا سوچتا رہا۔ جب نوکرانی نے اسے رات کا کھانا تیار ہونے کی اطلاع بہم پہنچائی۔

کھانے کی میز پر نجمہ بیگم اس کی منتظر تھی.....!

”کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ ملک صاحب بہت پریشان ہو رہے تھے۔ انہوں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔“ اس نے اپنی اور ملک صاحب کی تشویش ظاہر کی۔

”شکریہ!“ ارسلان نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

ایک طنزیہ سی مسکراہٹ خود بخود اس کے ہونٹوں پر آگئی تھی۔

”میں نے ڈاکٹر کو بلایا ہے۔ تھوڑی دیر میں آتا ہی ہوگا۔“ اس نے بڑی ہمدردی کا

مظاہرہ کیا۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“ ارسلان نے پلیٹ میں سالن انڈیلے ہوئے کہا۔

”اپنے اطمینان کے لئے میں نے ضروری سمجھا۔ خدا نخواستہ کوئی گہری چوٹ نہ لگی

ہو۔“

”بہت خیال رکھتی ہیں آپ میرا!“ اس کے طنز کی کاٹ گہری تھی لیکن نجمہ مسکرا کر رہ

گئی۔

”یہ میرا فرض ہے۔ تم اس کا جو بھی مطلب لو۔“ اس نے مسکرا کر ارسلان کی طرف دیکھا۔

○

دونوں خاموشی سے کھانے میں مصروف رہے۔ اس دوران ماحول کی یکسانیت سے اکتا کر نجمہ بیگم نے اس کے ساتھ دوسرے موضوع پر بات شروع کر دی تھی۔ کھانا ختم ہو چکا تھا جب گھریلو ملازمہ نے ڈاکٹر کی آمد سے مطلع کیا۔ ارسلان کے نہ نہ کرنے کے باوجود مسز ملک نے ڈاکٹر کو اندر بلا لیا تھا۔ اس نے ارسلان کے جسم کا معائنہ کیا اور دو تین دوائیاں لکھ کر آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلا گیا۔

”میرے خیال سے تم کچھ دن ملک سے باہر گزار آؤ اس طرح اس حادثے کو بھلانے میں بھی مدد ملے گی۔ میرا مطلب ہے اس ڈپریشن سے تو نکلو..... اور ہاں مطمئن رہنا جن لوگوں نے بھی یہ زیادتی کی ہے۔ میں انہیں زمین کی ساتویں تہہ سے بھی نکال لوں گی۔ تم سے زیادتی کر کے کوئی اس ملک میں بچ نہیں سکتا..... ملک صاحب دارالحکومت گئے ہیں۔ آج دوپہر کی فلائٹ سے کل رات کو ان کی واپسی ہوگی۔ اس کے بعد ہم دیکھیں گے اس معاملے کو۔“

ارسلان نے ایک مرتبہ نظریں اٹھا کر اس کے سپاٹ چہرے پر نظر ڈالی اور گردن جھکا لی۔

ایک بات کا اندازہ تو اسے ہو گیا تھا کہ اس نے نجمہ بیگم کو کچھ دیر ہی کے لئے سہی پریشان ضرور کیا تھا۔ شاید وہ اس سے زیادہ اپنے مستقبل کی فکر میں غلطاں تھا اور اب اسے کچھ دنوں کے لئے منظر سے ہٹانے کا سوچ رہی تھی۔

”یہ مدت طویل بھی تو ہو سکتی ہے مسٹر ارسلان۔“ اس کی چھٹی حس نے ارسلان کے کان میں سرگوشی کی۔

”ٹھیک ہے۔ ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ دیکھ لوں گا۔ اب بھاگے ہیں تو دونوں کے سامنے میدان ایک جیسا ہی ہوگا۔“ اس نے اپنی مردانگی کو خود ہی للکارا۔

”آپ میرے متعلق یقیناً بہتر فیصلہ ہی فرمائیں گی۔“ اس نے کہا۔

”تم لندن چلے جاؤ۔ ایک آدھ مہینہ گزار کر آ جانا۔“ نجمہ ملک نے کہا۔

”ٹھیک ہے اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں دو تین روز گزار لوں۔ ابھی جسمانی حالت بھی کچھ زیادہ بہتر نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بھئی میں تمہیں کوئی بھاگ جانے کا مشورہ تو نہیں دے رہی۔ جب دل چاہے چلے جانا۔ میں تو صرف چیخ کی بات کر رہی ہوں۔“ اس نے ارسلان کی گردن میں بازو جمائل کر کے بچوں کی طرح اس کا گال تھپتھپایا۔

”شکریہ.....!! میں ذرا باہر چکر لگا آؤں۔ تازہ ہوا بھی میری صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔“

اس کی اس بات پر نجمہ بیگم قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

○

پیدل چلتا ہوا وہ گھر سے باہر مارکیٹ تک آیا تھا۔

اس دوران اس نے دل ہی دل میں عزم کر لیا تھا کہ اگر وہ گناہ کی اس دلدل میں پھنس ہی گیا ہے تو اسے خود کو اتنا مضبوط اور طاقتور بنانا ہے کہ وہ بھی سرمائے اور اثر و رسوخ کے بل بوتے پر ان مگر چھوٹوں سے ٹکرا سکے۔ میں ”پانڈی“ ہی کیوں بنوں؟ اگر پھیرا لگاتا ہی ہے تو ملازم بن کر کیوں مالک بن کر کیوں نہ لگاؤں۔ خطرہ تو دونوں صورتوں میں ایک جیسا ہی ہوگا۔ گرفتاری کی صورت میں اسے یہ کہنے پر کہ وہ اپنا نہیں کسی اور کا ”مال“ لے کر جا رہا ہے کم سزا تو نہیں ملے گی۔ قانون کی نظروں میں تو وہ مجرم ہی ہوگا۔ خواہ مال اس کا ہو یا نجمہ بیگم کا.....!

لیکن.....!

نجمہ بیگم کا کیوں اس کا اپنا ہی کیوں نہیں..... وہ خود سجاد خان کیوں نہ بنے۔ سب کو اپنے قدموں میں کیوں نہ جھکائے۔ اگر بے ایمانی کا پیسہ ہی کسی کے اعلیٰ نسب، بڑے اور معزز ہونے کا معیار ہے تو وہ خود سب سے بڑا بے ایمان کیوں نہ بن جائے۔ واہ ملک ارسلان! واہ ارسلان جٹ! ونڈ نفل..... شاباش! اب آئے نہ بچو سیدھی راہ پر۔“ اس نے دل ہی دل میں اس شاندار فیصلے پر خود کو داد دی۔

اب اسے اپنے لئے فی الوقت کچھ مصنوعی سہارے درکار تھے۔ ان بیساکھیوں کے بل بوتے پر ہی وہ اپنے مستقبل کی مضبوط بنیادیں استوار کرنے چلا تھا۔

○

مارکیٹ سے ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ سیدھا مختاراں بائی کے کوٹھے پر پہنچا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں جو منصوبہ تیار کیا تھا اس میں مختاراں اور اس کی بیٹی کی ضرورت قدم قدم پر پیش آتی۔ گوکہ اس کے ذریعے مختاراں نے گہری چوٹ کھائی تھی لیکن وہ کنجروں کی نفسیات سمجھنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ پیسے کے لوگ ہیں اور اب اس نے پیسہ لگا کر کمانا شروع کر دیا تھا۔

اتنے عرصے بعد اسے اچانک یہاں دیکھ کر مختاراں بائی کا چونکنا فطری بات تھی۔ ”سناؤ باؤ ارسلان! آج کیسے ادھر کا راستہ بھول گئے۔“ اس کے لہجے میں طنز اور شکوہ عیاں تھا۔

”بی بی! ہم کچی یاری نہیں لگاتے۔ تمہارے نقصان کی فکر میں دبلا ہو رہا ہوں اور دیکھ لیتا اگر ایک کے دس کر کے واپس نہ لوٹائے تو.....!“ وہ سیدھا خاص کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

مختاراں بائی شاید عام حالات میں اس کا وجود برداشت نہ کرتی، لیکن آج کل جس مندے کا شکار وہ ہو رہی تھی اس کا صحیح اندازہ وہی لگا سکتی تھی۔ اس بازار کا بھی عجیب دستور تھا کہ ایک مرتبہ جس کی شہرت خراب ہو جاتی، اس کا بھاؤ گرتا ہی چلا جاتا۔

اور اسی بھیا تک روایت کا شکار ہوئی تھی مختاراں بائی اور اس کی بیٹی۔ شریفاں کا اٹھایا ہوا طوفان کہنے کو تو گزر گیا تھا، لیکن اس کی تباہ کاریاں اپنے مکمل وجود کے ساتھ یہاں موجود تھیں۔ اس بازار کے مستقل آنے والے تھے ہی کتنے۔ جب سے سختی شروع ہوئی تھی فصلی بیڑے تو تب ہی اڑ گئے تھے اور اب تو کوئی بڑے دل گردے کا مالک تماش بین ہی ادھر کا رخ کرتا تھا یا پھر وہ اٹھائی گیرے جو کبھی لمبا ہاتھ لگنے پر اس طرف آ جاتے تھے۔ پہلی قسم کے لوگ تو مختاراں بائی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ شریفاں اور اس کی لڑکیوں نے پولیس سے اپنی درگت تو بنوائی تھی لیکن مختاراں کے لئے ایسے کانٹ بیج دیئے تھے کہ اب وہ نازنین کے ذریعے کبھی ڈھنگ کی فصل نہیں کاٹ سکتی تھی۔

اب تو ڈیرے کے نوکروں نے بھی ایک ایک کر کے منہ موڑنا شروع کر دیا تھا۔ ان حالات میں ارسلان کی دوبارہ آمد ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح تھی۔

”یہ پانچ ہزار رکھ لو۔ بھی لے ناغے کا جرمانہ بھی تو دینا ہی پڑتا ہے ناں..... نازنین کہاں گئی؟“ ارسلان کی آواز مختاراں کے کانوں میں رس گھول گئی۔ عین ان لمحات میں جب

مختار را بائی ”نہ نہ“ کرتے ہوئے نوٹ تھام رہی تھی نازنین کمرے میں داخل ہوئی۔

بازار ہی میں وہ کسی تقریب پر گئی ہوئی تھی۔ ارسلان کو..... وہاں دیکھ کر چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ اپنی ماں کو اس کے ساتھ شیر و شکر ہوتے دیکھ کر اس نے ارسلان کے تئیں اپنا موڈ بدل لیا اور حسب سابق بڑے ناز و داد سے اس کا استقبال کیا۔

ارسلان کی آمد کی خوشی میں مختاراں نے استادوں کو انعام دے کر رخصت کر دیا تھا۔ یوں بھی آج سارے دن کی مصروفیت نے نازنین کو تھکا دیا تھا۔

رات دیر گئے تک تینوں باتیں کرتے رہے۔ پھر مختاراں بائی ارسلان اور نازنین کو تاش کھیلے چھوڑ کر چلی گئی۔

علی الصبح نازنین کی تھکن خاصی اتر گئی تو ارسلان اسے شیشے میں اتار کر اگلے ایک دو روز میں آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔



صبح وہ ناشتے کی میز پر نجمہ بیگم سے پہلے موجود تھا۔ اس نے اپنا موڈ خوشگوار بنا لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وقت سے پہلے نجمہ بیگم کو ہوشیار ہونے کا موقعہ دے۔ ہر قدم اس نے پھونک پھونک کر اٹھا نا تھا۔ اس نے ناشتے پر دوران گفتگو یہی ظاہر کیا تھا جیسے وہ ملک سے باہر جانے کے فیصلے پر بہت خوش ہے۔

”لیکن میری درخواست ہوگی اس مرتبہ مجھے باخبر رکھا جائے۔ میں دھوکے کا شکار نہیں ہونا چاہتا۔“ اس نے نجمہ بیگم سے کہا۔

”نہیں! اس مرتبہ تم صرف انجوائے کرنے جا رہے ہو۔ صرف سیر کرنے۔“ اس نے حسب عادت بچوں کی طرح اس کا گال تپتھپایا۔

”میرا مطلب یہ نہیں تھا مسز ملک۔ میں خوفزدہ نہیں ہوں لیکن میں باخبر رہنا چاہتا ہوں اور دوسری بات کہ اس مرتبہ میں خود خواہش رکھتا ہوں کہ خالی ہاتھ نہ جاؤں۔ مسز ملک میں نے سنجیدگی سے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے اکاؤنٹس میں اضافہ کروں۔ زندگی بہت مہنگی ہو گئی ہے اور شاید مستقبل میں مجھے آپ ایسے محبت کرنے والوں کا تعاون بھی حاصل نہ رہے۔“

”آل راءٹ! اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو اس کا احترام ہو گا مسز ارسلان۔“ اس

نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

اب اسے حوصلے اور جرأت سے آگے بڑھنا تھا۔ مسز ملک نے اس کے ساتھ ہی دو تین پروگراموں پر بات کی اور اسے فی الحال آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلی گئی۔

اس کی روانگی سے کچھ دیر بعد ہی ارسلان نے رضوی صاحب کو فون کیا۔

لیکن وہ حیران ہی رہ گیا جب اسے جواب ملا کہ اس نمبر پر کوئی مسٹر رضوی نہیں رہتے اور یہ تو کسی پرائیویٹ کمپنی کا نمبر ہے۔ اب اسے اس بات کی سمجھ بھی آ گئی تھی کہ اسے اغوا کر کے تشدد کا نشانہ کیوں بنایا گیا؟ شاید رضوی صاحب نے اس کے سر سے ”دست شفقت“ اٹھالیا تھا یا پھر وہ اس کے کیس آفیسر نہیں رہے تھے اور ان کے تبادلے کے بعد نئے آنے والے نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

معاملہ کچھ بھی رہا ہو ایک بات تو صاف ظاہر تھی کہ اب اس کے اور ابجھنی کے درمیان رابطہ فی الوقت تو ختم ہو چکا ہے۔ یہ لوگ اسی طرح اچانک ہی تعلق قائم کرتے اور اچانک ہی غائب ہو جاتے تھے۔

عجب انداز تھا کام کرنے کا۔

شاید اب ان لوگوں کو ارسلان کی ضرورت رہی بھی نہیں تھی یا پھر اس کی سیاسی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اس سے پہلو تہی ہی مناسب جانی تھی۔



تھو گجر نے اسے پہلی نظر ہی میں پہچان لیا تھا۔

”ہم جسے ایک مرتبہ مل لیں اسے بھلاتے نہیں باؤ جی!“ اس نے اپنی مونچھوں پر الٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”اس وقت میں تمہارے پاس کسی حوالے سے نہیں آیا۔ صرف اپنے کام سے آیا ہوں۔ تھو! یہ میری اور تمہاری ”بزنس ڈیل“ ہے۔ میری خواہش ہے کوئی تیسرا ہمارے درمیان نہ آئے۔ تم پیسوں سے غرض رکھو اور میں مال سے۔ یوں بھی تم مال فروخت ہی کرتے ہو۔ یہی گارنٹی چاہئے ناں کہ گاہک اعتماد والا ہے یا نہیں۔ اس ضمن میں تم جیسے چاہو اپنی تسلی کر سکتے ہو۔“

ارسلان نے لگی لپٹی رکھے بغیر مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔ وہ تھو گجر کو سال

ڈیڑھ سال پہلے ملا تھا جب ایک مرتبہ ملک صاحب نے کسی جلسے میں ہنگامہ آرائی کے لئے اس کی خدمات حاصل کی تھیں اور ارسلان کو اس کے پاس بھیجا تھا۔ تھوہیروئن کا مقامی بے تاج بادشاہ کہلاتا تھا۔ ایک جہان جانتا تھا کہ وہ ہیروئن کا دھندا کرتا ہے، لیکن پولیس نہیں مانتی تھی کیونکہ پولیس کو اس کے خلاف ”ثبوت“ نہیں مل سکا تھا اور ہونہار اور قانون کا احترام کرنے والی پولیس کبھی کسی کے خلاف ثبوت حاصل کئے بغیر کارروائی نہیں کرتی تھی۔

ارسلان کو یہ علم تو نہیں تھا کہ اس کے بعد بھی ملک صاحب نے کبھی تھو کی خدمات حاصل کی ہوں، لیکن وہ کم از کم اس سے دوبارہ نہیں ملا تھا۔ آج جب اچانک وہ گاہک کے رڈپ میں تھو کے سامنے آیا تو چند لمحے کے لئے تھو بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اپنی انگارہ نما آنکھوں سے اس کے سراپا کا جائزہ لیا اور اسے دوسرے کمرے میں آنے کی ہدایت کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

جہاں ارسلان اس سے بات کر رہا تھا، دو کلاشکوف بردار اس کے انہیں بائیں موجود تھے جنہوں نے مسلسل ارسلان پر نظر رکھی تھی۔ تھو کے بغلی کمرے میں جاتے ہی انہوں نے ارسلان کے لئے راستہ چھوڑ دیا جو اس کے تعاقب میں اندر داخل ہو گیا۔

”کیا چکر ہے؟ کوئی باہر کی پارٹی ہاتھ لگ گئی کیا؟“ تھو نے دوسرے کمرے میں جے بہترین فرنیچر سے آراستہ کیا گیا تھا، ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے اسے دوسرے صوفے پر سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”چکر تو ایسا ہے۔ پارٹی وہاں جا کر ڈھونڈوں گا۔“ ارسلان نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”مشکل کام ہے بیٹا! وہاں کوئی ملک تمہاری پشت پر موجود نہیں ہوگا۔ نہ ہی ان ملکوں میں رشوت سے کام چلتا ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اس چکر میں نہ ہی پڑو تو بہتر ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری کے چکر میں آدھی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو۔“ اس نے ارسلان کو ٹوٹنا چاہا۔

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے لئے کوئی خطرہ پیدا نہیں کروں گا۔ مجھے صرف مال چاہئے۔“

”میں خطرات کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا برخوردار۔ اگر تم بھند ہو تو ٹھیک ہے بات کرو کتنا لو گے؟“

اور.....!

دونوں میں معاملہ طے پا گیا۔ ارسلان نے رقم وہیں ادا کر دی اور ”مال“ دوسرے ٹھکانے سے حاصل کرنے کی ہدایت مل گئی۔ دوپہر تک وہ مال سمیت گھر واپس پہنچ گیا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اگلے دو تین روز اس نے مسز ملک کے ساتھ معمول کے مطابق گزارے۔ اس درمیان ملک صاحب واپس آ چکے تھے۔ انہوں نے ارسلان کے اغوا کو صوبائی حکومت کے کھاتے میں ڈال کر اسے محتاط رہنے کی تلقین کی تھی۔ اس کے اغوا کو مرکزی حکومت کے ہر قابل ذکر عہدے دار کے سامنے اپنے نمبر ٹانگنے کے لئے اس ظلم کی کہانی بھی سنا دی تھی اور یہ باور کروادیا تھا کہ وہ مرکزی لیگ کے ساتھ اپنی دوستی کی بھاری قیمت ادا کر رہے ہیں۔

ایک چھوٹے سے بیک میں اپنا مال پیک کروانے کی خدمت بھی اسے اسی شہر میں میسر آ گئی تھیں۔ پیکنگ کرنے والے نے پیسے تو اچھے خاصے وصول کئے تھے اور ایک خصوصی بیک تیار کر کے اس کے ہاتھ میں تمہادیا، لیکن ارسلان کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ اس استاد کے ہاتھوں کا تیار کردہ ”تھیلا“ آج تک نہیں پکڑا جاسکا۔ اس کے پاس یورپی کسٹمز کے ہر جوڑ کا توڑ پہلے سے موجود تھا۔ ”حساس کیمرڈ“ سے لے کر ”کتوں“ تک کی دست برد سے تھیلوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اس استاد کو جرم کی دنیا میں سیاستدان کی حیثیت سے مانا جاتا تھا۔

○

یہ بیک بھی بڑی خاموشی سے اس نے اپنے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ اب اسے نجمہ بیگم کے بیک کا انتظار تھا اور تیسرے روز ہی یہ انتظار بھی ختم ہو گیا۔

”تیاری کرلو۔ تم پرسوں رات کی فلائٹ سے جا رہے ہو۔ پہلے والے ایڈریس ہی پر جانا ہے۔“

”بائی دی وے۔ مسز ملک مجھے اس ٹرپ پر کتنا معاوضہ ملے گا؟“

اس کے اچانک سوال نے ایک مرتبہ تو مسز ملک کو بوکھلایا دیا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ چونکی۔

”میں نے بڑی سلیس اردو میں بات کی ہے مسز ملک۔ اس میں سمجھ نہ آنے والی تو کوئی

بات نہیں۔“ وہ سنجیدہ تھا۔

”اوہو! خاصے ہوشیار ہو گئے ہو ایک ہی چکر میں۔“ اس نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر دیکھا۔ ”خیر یوں اچھی خبر ہے معاوضہ پہلے جتنا دولاکھ۔“

”اور مال؟“

”وہ بھی پہلے جتنا۔“

”اس مرتبہ میں پانچ لاکھ لوں گا مسز ملک۔“

”ک ک ک..... کیا مطلب ہے تمہارا؟ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“ اس مرتبہ اس نے

چلا کر بات کی تھی۔

”بالکل نہیں بلکہ میرا دماغ ٹھیک ہو گیا ہے۔ مسز ملک یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جس کا روبرو میں آپ میری جان خطرے میں ڈال کر ایک کروڑ کا منافع ہو رہا ہو اس سے مجھے صرف دو لاکھ ملیں۔ میں اب اتنا گد جا بھی نہیں ہوں۔“

”تم نشے میں ہو یا مذاق کر رہے ہو؟“ نجمہ بیگم اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی اور وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔

”میں سیریس ہوں۔ یہ زندگی موت کا کھیل ہے۔ ممکن ہے آپ اسے مذاق سے زیادہ اہمیت نہ دیتی ہوں لیکن میرے لئے.....“

”ارسلان اپنی اوقات میں رہو۔ زیادہ اونچا اڑنے کی کوشش نہ کرو۔ تم نہیں جانتے کہ.....“ اس نے ارسلان کی بات کاٹ کر ہونٹ چباتے ہوئے کہا، لیکن اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ارسلان نے کاٹ دی۔

”بہی مشورہ میں آپ کو دوں گا مسز ملک۔ اوقات تو میری بہر حال آپ سے زیادہ ہے۔ اگر آپ کا اشارہ خاندان کی طرف ہے تو!“ اس نے پھاڑ کھانے والے انداز سے جواب دیا۔

مسز ملک بڑی گھاگ عورت تھی۔ بڑی زمانہ ساز عورت۔ وقت کے تیور پہچاننے والی۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ ارسلان اب گدھا بننے کو تیار نہیں ہوگا۔ اس کی تمام تر دھمکیوں اور خوف کے باوجود ارسلان اس کے سامنے ڈٹ گیا اور ایسے بد کے ہوئے گھوڑے کو ایک مشاق گھڑسوار کی طرح قابو کرنا تھا اسے..... یہاں سختی سے نہیں نرمی سے بات بنتی تھی۔ اگر اس نے ارسلان کو کوئی

سزا بھی دینی تھی تو اس کا ابھی وقت نہیں تھا۔ مسز ملک نے فی الوقت جھک جانا ہی مناسب سمجھا، وہ ٹوٹنا نہیں چاہتی تھی۔

”ٹھیک ہے لیکن اتنے زیادہ نہیں تین لاکھ ہی مل سکتے ہیں۔“

”پانچ لاکھ سے کم نہیں مسز ملک۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”ضد نہ کرو ارسلان۔ میرا تمہارا تعلق مالک نوکر کا نہیں، ہم دوست بھی ہیں۔“

”بزئس اپنی جگہ مسز ملک اور دوستی اپنی جگہ۔“ اس نے لوفروں کی طرح آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

تین چار منٹ کی سرکھپائی کے بعد نجمہ بیگم نے اندازہ لگایا کہ ارسلان اپنی بات پراڑ گیا ہے اور اب پیچھے نہیں ہٹے گا خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ اس نے پریشانی کے عالم میں یہ تیسرا مسلسل سگریٹ سلگایا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ اگر تم بزئس میں بننے پر تل ہی گئے ہو تو مجھے کیا اعتراض ہے۔“ اس نے بالا خرہ ہتھیار ڈال دیئے۔

”مسز ملک! میں آدمی پے منٹ ایڈوانس چاہوں گا۔ روانگی سے کم از کم چوبیس گھنٹے پہلے۔“ اگلا حملہ پہلے سے بھی زیادہ زوردار تھا۔

”تم جانتے ہو اگر میں چاہوں تو ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے پھینکوا سکتی ہوں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی نجمہ بیگم نے کہہ دیا۔ ضبط کا یار نہیں رہا تھا۔

”جی ہاں، لیکن آپ نے یہ اندازہ کیسے لگالیا کہ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ اگر آپ جیل میں نہ گئیں تو خدا کے فضل سے آپ کو اتنی نیک نامی ضرور مل جائے گی کہ پھر شاید گاؤں میں واپس ضرور جانا پڑے جہاں سے آپ نے اپنی اس ہنگامہ خیز زندگی کا آغاز کیا تھا۔ مسز ملک ڈوبتا ہوا آدمی بسا اوقات بڑے ماہر پیراک کو بھی اپنے ساتھ لے مرتا ہے۔ آپ مجھے انڈر اسٹی میٹ کر رہی ہیں۔ میں نے سٹوڈنٹس پالیٹکس میں جھک نہیں ماری۔ جیسے ہی مجھ پر براقت آیا آپ کی تباہی کا آغاز ہو جائے گا۔ آپ کی کہانی مکمل تفصیلات کے ساتھ ملک کے ہر قابل ذکر اخبار اور رسالے میں شائع ہو جائے گی اور میں مرتا مرتا بھی آپ کو مجرم ثابت کر دوں گا۔ نجمہ بیگم یہ مت بھولنے کہ آپ نے ملک صاحب کو بھی بلیک میل کیا ہے۔ اس کھیل میں ایک طوائف کے رول کو

نظر انداز نہ کیجئے۔ ایک ایسی طوائف جس کو آپ نے دھوکا دیا۔ خدا کا شکر ادا کیجئے کہ میں نے معاملہ دبا رکھا ہے اور اس گھناؤ نے کھیل میں آپ کے کردار کا اسے علم نہیں ورنہ وہ خاندانی طوائف ہے۔ آپ سے کہیں زیادہ داؤ بیچ جانتی ہے وہ اور اسے اپنی عزت بے عزتی کا بھی کوئی خوف نہیں۔ آپ نے میرے ساتھ دو دو ہاتھ کئے ہیں۔ میری اور اپنی محبت کو جنگ میں آپ نے بدلا ہے اور مسز ملک آپ کی اطلاع کے لئے یہ بھی عرض کر دوں کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔“

ارسلان کی زبان سے نکلا ایک ایک لفظ سیسے کی طرح نجمہ بیگم کے کانوں سے دماغ

میں اتر رہا تھا۔

”ٹھیک ہے تم چیک لے لو۔“ اس نے نڈھال ہوتے ہوئے کہا۔
 ”نہیں کیش۔ مجھے آج شام تک یا کل صبح تک کیش دیجئے۔“

○

مسز ملک کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب تک وہ پاگل کیوں نہیں ہوئی۔
 اگلے روز ناشتے کی میز پر اس نے کیش اڑھائی لاکھ روپے ارسلان کو دے دیئے۔ اس نے نگاہ غلط انداز بریف کیس میں سجائے نوٹوں پر ڈالی اور شکریہ کہہ کر بریف کیس بند کر لیا۔
 ”گن لو کہیں.....“

”نہیں مسز ملک۔ اپنے دھندے میں بے ایمانی نہیں چلتی۔ اس کا نقصان فریقین کو ہوتا ہے فریق کو نہیں یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔“ اس نے نجمہ بیگم کی بات مکمل ہی نہ ہونے دی اور کیش اٹھا کر باہر آ گیا۔

کار میں وہ اپنے بینک کی طرف جا رہا تھا۔ بینک میں موجود خطیر رقم کا بڑا حصہ اس نے نکلو الیا اور اب اس کا رخ ایک پراپرٹی ڈیلر کی دکان کی طرف تھا۔

”شیخ صاحب! آپ نے کل جس کوٹھی کی بات کی تھی میں وہ خریدنے کے لئے تیار ہوں۔“ اس نے اگلے روز اپنے اور شیخ صاحب کے درمیان ہونے والی گفتگو کے حوالے سے کہا۔

دو گھنٹے کے اندر کارروائی مکمل ہو چکی تھی اور بیس لاکھ کیش کی صورت شیخ صاحب کی تجوری میں منتقل ہو گئے تھے۔ کوٹھی کی چابی ارسلان کے پاس تھی۔ اس نے اپنے اس وکیل دوست کو جس کے ذریعے کاغذات مکمل ہوئے تھے کچھ رقم اس ہدایت پر دی کہ اس کی لندن سے واپسی

تک کوٹھی میں ضروریات زندگی کا سارا سامان سجا دے۔

خالی گھر کی حفاظت کے لئے چونکدار اسے پراپرٹی ڈیلر کے توسط سے میسر آ گیا تھا۔ اب وہ اپنے منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل کرنے جا رہا تھا۔ وقت کم تھا اور کام زیادہ۔ ابھی تک سب کچھ اس کی پلاننگ کے مطابق چل رہا تھا۔ اپنے وکیل دوست کے ذریعے اس نے اپنی موت کی صورت میں جائیداد اپنی بہن اور ماں کے نام منتقل کرنے کی وصیت بھی تیار کر کے اسے تھما دی تھی۔

○

اس مرتبہ وہ غیر ملکی ایئر لائن سے سفر کر رہا تھا۔

حسب سابق مسز ملک اسے ہوائی اڈے پر رخصت کرنے آئی تھی۔ اس مرتبہ بھی کسی نے اس کے سامان کو کھولنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اس کا سامان تھا ہی کتنا۔ دو بیگ جن میں ضرورت کے کپڑے اور رسالے اخبارات کے علاوہ مٹھائی موجود تھی جو وہ لندن میں موجود اپنے دوستوں کے لئے لے جا رہا تھا۔

وہ بڑا پراعتماد سفر کر رہا تھا۔ مسز ملک سے انتقام کی دھن نے اس کے ذہن سے سارا خوف نکال کر باہر پھینک دیا تھا اور وہ اطمینان سے آنے والے وقت کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

اس مرتبہ اس نے گرین چینل کے بجائے ”ریڈ چینل“ اختیار کیا تھا۔ تلاشی کے کاؤنٹر پر پہنچ کر اس نے اپنے بیگ کھولا اور مٹھائی کا بڑا ڈبہ نکال کر نو جوان کسٹم آفیسر خاتون کے سامنے رکھ دیا۔

”محترم خاتون! میں دوسری دفعہ لندن آیا ہوں، لیکن مجھے علم نہیں کہ یہاں کھانے کی اشیاء لانے کی اجازت ہے یا نہیں۔ میں برنس مین ہوں۔ مقامی دوست بھند تھے کہ ان کے لئے اپنے شہر کی مٹھائی ضرور لاؤں۔ میں نے سنا ہے کہ اکثر لوگ مٹھائی لے آتے ہیں، لیکن اپنے اطمینان کے لئے اسے ڈکلیئر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔“

کسٹم آفیسر خاتون جو شاید حال ہی میں اس سروس میں آئی تھی اس کا پاسپورٹ کھول کر اندراج چیک کئے۔ مٹھائی کا ڈبہ کھول کر دیکھا اسے ایک مشین سے گزار کر اسے واپس کر دیا۔
 ”اور تو کچھ نہیں ڈکلیئر کرنے والا؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

”تھینک یو فار دس کمپلیمنٹ۔“ ارسلان نے کہا اور مٹھائی دوبارہ بیگ میں ڈال کر بائی کہہ کر اپنا راستہ ناپا۔

لاؤنج میں اس مرتبہ کیرن کی بجائے ایک سیاہ فام اس کے نام کی تختی تھامے کھڑا تھا۔
”خیریت ربی جناب؟ آپ نے دیر لگا دی!“ مائیکل نے تعارف ہونے کے بعد کار کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ سیاہ فام نے اپنے تعارف مائیکل کے نام سے کروایا تھا۔
”میں ذرا سو گیا تھا۔“ ارسلان نے کہہ کر قہقہہ لگایا۔

سیاہ فام کا قہقہہ اس سے بلند تھا۔

خلاف توقع یہ شخص بڑا دلچسپ ثابت ہوا۔ دونوں خاصی بے تکلفی سے باتیں کرتے آ رہے تھے۔ لیون جینچے تک مائیکل اس کا گہرا دوست بن چکا تھا۔ اس کی عمر ارسلان سے کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں تھی۔ اس نے ارسلان کی خواہش پر اپنا رابطہ نمبر بھی اسے دے دیا تھا لیکن اس درخواست کے ساتھ کہ اس کا علم مسٹر مارٹن کو نہ ہونے پائے۔

کیرن ایک مرتبہ پھر اس کے استقبال کو کھڑی تھی۔ اس نے حسب سابق ارسلان کا استقبال بڑی گرجوٹی سے کیا اور اس نے گرجوٹی کا مظاہرہ اس وقت تک جاری رکھا جب تک وہ نڈھال ہو کر پلنگ پر ڈھیر نہیں ہو گیا۔ اس نے ہتھرو نہ جانے پر معذرت کی تھی کیونکہ وہ ضروری کام کے سلسلے میں کہیں اور گئی تھی۔

مارٹن کی آمد رات دیر گئے ہوئی۔ دونوں ایک انڈین ریسٹورنٹ سے کھانا کھا کر واپس آئے تھے جب مارٹن وہاں پہنچا۔

تینوں باتیں ہی کر رہے تھے جب اچانک ارسلان کو یاد آ گیا۔ ان سے معذرت کرتے ہوئے اس نے اپنے شہر میں نجمہ ملک کا نمبر ملایا تو مسز ملک کی بوجھل آواز سنائی دی۔ شاید وہ ابھی سو کر اٹھی تھی کیونکہ اس وقت وہاں صبح کے چھ سات بجے تھے اور ارسلان جانتا تھا کہ مسز ملک کو دیگر بیگمات کے برعکس صبح جلدی اٹھنے کی عادت ہے۔

اس کی ایک یہی پرانی عادت تھی جو اس نے نہیں چھوڑی ورنہ تو اس نے اپنے ماضی کے سارے حوالے ختم کر دیئے تھے۔

”ہیلو!“ اس نے گلا کھگارتے ہوئے کہا۔

”مسز ملک آپ کا مال پہنچ گیا ہے۔ مجھے باقی پے منٹ یہاں چاہئے۔“ اس نے چھٹتے ہی کہا۔

”تمہیں کس نے باقی پے منٹ دینے سے انکار کیا ہے۔ سلیم صاحب کل تمہیں ملیں گے وہ باقی ادائیگی کر دیں گے۔ ایسی بے ہودہ بات کے لئے ہی کیا تم نے فون کیا تھا؟“ مسز ملک نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”نہیں نجمہ بیگم صاحبہ۔ میں تو آپ کو ایک زبردست ”سر پرائز“ دینے جا رہا ہوں۔ آپ ہی نے کہا تھا کہ انسان گرنے پر آئے تو پھر گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ مسز ملک جنگ کا آغاز تم نے کیا ہے اسے انجام تک میں پہنچاؤں گا۔“ جانے اس کے اندر نفرت کا لاوا کب سے پک رہا تھا۔

○

مارٹن نے ابھی تک اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ صرف یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ سلیم صاحب کل اس سے کسی بھی وقت ملیں گے۔ وہ گھر پر ہی موجود رہے۔ رات اس بنگلے میں کیرن اور ارسلان نے اکیلے گزاری تھی۔ ساری رات وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اس نے بہت بڑا جوا کھیلنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا جوا بھی ہو سکتا تھا، لیکن اب وہ اس کھیل کو ختم کرنے پر تیار تھا۔

جانے کس برے وقت نجمہ بیگم نے اس کی انانیت پر اتنا گہرا گھاؤ لگا دیا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد کیرن شاپنگ کرنے بازار چلی گئی اور وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا۔

اس نے سجادول خان اور نجمہ بیگم کو ایک دوسرے سے ٹکرا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کھیل میں اس کی جان بھی جاسکتی تھی، لیکن اب اسے اپنی جان کی پروا تھی ہی کب! دوپہر کے بعد سلیم خان بھی آ گیا۔

سجادول کی سلیم کے روپ میں یہ دوسری ملاقات تھی۔ اس نے بڑی گرجوٹی سے ارسلان سے مصافحہ کیا اور اسے ایک اور کامیاب پھیرالگے نے پر مبارکباد دی۔

ارسلان دل ہی دل میں اس کی بہادری سے بہت متاثر تھا۔ اتنا رسوائے زمانہ شخص جس کی تلاش دنیا بھر کی پولیس کو تھی، یہاں کتنے اطمینان سے بہروپ بدلے بیٹھا تھا۔

”کیا بات ہے بھی؟ مسز ملک کو آپ سے شکایت کیوں رہنے لگی ہے؟ کیا معاملہ ہے شاید ہم کوئی مدد کر سکیں۔“ اس نے اچانک ہی ارسلان کو مخاطب کیا۔

اس کا مطلب تھا کہ مسز ملک نے اس سے بات کر دی ہے۔ اس نے سوچا اور پھر تیار ہو کر بیٹھ گیا۔

”ان کی ناراضگی بالکل بے جا ہے سلیم صاحب۔ اصل میں یہ اصول کی بات ہے اور اصولوں پر اختلاف ہو جایا کرتے ہیں۔ میں خود چاہتا تھا کہ آپ سے بات کروں لیکن اس سے پہلے آپ نے چونکہ خود ہی اس طرف اشارہ فرمادیا تو مجھے حوصلہ ہوا ورنہ آپ جیسے بڑے آدمی سے توبت کرنے کی ہمت مجھ میں پیدا نہیں ہو رہی تھی۔“

سجاد خان ہنسنے باندھے بڑے غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ شاید وہاں کچھ تلاش کر رہا تھا لیکن ارسلان بھی کمال کا اداکار تھا۔ کیا مجال جو اس کی آنکھوں یا چہرے کے کٹاثرات سے سجاد خان کو کچھ بھی اندازہ ہو سکتا۔

بڑے ڈرامائی انداز میں اچانک ارسلان اپنی جگہ سے اٹھا اور لمحہ کمرے سے دوسرا بیک اٹھالیا۔ اس نے بیک سجاد خان کے سامنے رکھ دیا۔

”کیا ہے یہ؟“ سجاد خان کو الجھن سی ہونے لگی۔

”میرے اور مسز ملک کے درمیان ناراضگی کا سب سے بڑا سبب۔ سلیم صاحب میں آپ کو جانتا ہوں اور مجھے نجمہ کی حیثیت کا بھی علم ہے۔ ایسی جانے کتنی عورتیں آپ کے تلوے چاٹتی ہوں گی۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اتنی خطرہ رقم آپ کے سبب دیکھی تھی۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ جب آپ ایمانداری سے مجھے میرا حق دے رہے ہیں تو میں آپ کے ساتھ بے ایمانی کیوں کروں۔ جب مسز ملک نے مجھے یہ بیک دیا تو میری چھٹی حس نے کہا جیسے وہ مجھے آپ کو بے خبر رکھ کر استعمال کرنا چاہتی ہے۔ میں نے اپنے عندیے کا اظہار اس کے سامنے کیا تو اس نے صاف بتا دیا کہ واقعی یہ اس کا مال ہے اور اس ڈیل سے آپ کا تعلق نہیں۔ اس نے مجھے کہا۔ ارسلان! میں سجاد کی پارٹنر ہوں کوئی غلام نہیں۔ وہ دراصل مجھے قربانی کا بکرا بنا کر اپنا الو سپدھا کرنا چاہتی ہے۔ اس نے مجھے یہ بیک دے کر کہا کہ اس مال کی فروخت کے لئے میں گاہک خود تلاش کروں اور سجاد خان سے ہٹ کر ہم اپنا کام شروع کر دیں گے۔ جب میں نے انکار کیا تو

اس نے میری فرینکفرٹ پر کھینچی تصاویر دکھا کر مجھے بلیک میل کرنے کی دھمکی دی اور کہا کہ اگر میں نے اس کا حکم نہ مانا تو ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزاروں گا۔

سلیم صاحب! میری جان تو عذاب میں پھنس گئی۔ دولت کس کو بری لگتی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ آخر آپ جیسے شخص کو یہ عورت کب تک دھوکہ دے سکتی ہے۔ جب بھی بات آپ کے علم میں آئی وہ درمیان سے آرام سے نکل جاتی اور میں غریب خواہ مخواہ مارا جاتا۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ کو بہر حال یہ بات بتا دوں گا۔ آج رات جب میں نے مسز ملک کو فون کیا تو اس نے مجھے تنبیہ کی کہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں ہونا چاہئے جس پر میں نے بھی سخت بات کہہ دی۔ اب خدا جانے میرا یہ عمل صحیح ہے یا غلط۔ میرے لئے تو جناب دونوں صورتوں میں موت ہی ہے لیکن میں اتنا بے وقوف نہیں کہ آپ کو دھوکا دینے کا تصور بھی کر سکوں۔ شاید میرے سچ بتا دینے سے آپ میرے متعلق بہتر رائے قائم کریں۔“

ارسلان نے بالآخر اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چلا کر نتیجہ تقدیر پر چھوڑ دیا۔ سجاد خان نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے سگریٹ سلگایا اور اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا۔ شاید کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ نجمہ ملک سے اس کی جذباتی اور جسمانی وابستگی تھی لیکن اسے اپنا بزنس سب سے بڑھ کر عزیز تھا جس کے بل بوتے پر وہ اپنے ملک کا بے تاج بادشاہ بنا ہوا تھا۔ یہ عورت تو اس کی توقع سے بھی بڑھ کر مکار اور ہوشیار ثابت ہوئی تھی۔ اس نے تو اسمگلنگ کو بھی سیاست ہی سمجھ لیا تھا۔

اپنے سناٹوں کے مطابق اچانک ہی وہ چلتے چلتے رک گیا اور گردن گھما کر ارسلان سے مخاطب ہوا۔

”چند روز پہلے تمہیں کس نے اغوا کیا تھا؟ کیوں اغوا کیا تھا؟“

ایک کوند اس اس کے ذہن پر لپکا اور اس نے ایک لمحہ تردد کئے بغیر کہا۔

”خان صاحب یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ میں نے پچھلے چار پانچ سال میں سوائے اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے اور ڈھنگ کا کوئی کام کیا نہیں۔ جانے مخالف طلباء تنظیم کے لوگ کب سے اس موقع کے منتظر تھے۔ اس روز مجھے اکیلے پا کر انہوں نے قابو کر لیا اور میرے ساتھ وہی کیا جو ایک دشمن اپنے دشمن کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اپنی دانست میں تو انہوں

نے مجھے ماری ڈالا تھا۔ رات کو شاید کمپنی باغ میں پھینک گئے تھے جہاں سے اٹھ کر میں پھر گھر چلا آیا، لیکن آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟ میں نے اس حادثے کی خبر اخبارات کو نہیں دی۔ میں تو سنوڈنٹس پالیٹکس سے علیحدگی اختیار کر چکا ہوں۔ آپ جانتے ہیں جناب اس میں سوائے ذلت کے اور رکھا ہی کیا ہے۔ مجھے ملک صاحب کا آلہ کار بن کر جینا بھی پسند نہیں۔ جب خطرے کو سینے سے لگایا ہے تو پھر میں اپنی مرضی کی زندگی کیوں نہ جیوں۔“

اس نے اپنی چرب زبانی کا زبردست مظاہرہ کر کے سجاد خان جیسے بین الاقوامی سمگلر کو بھی گڑبڑا کر رکھ دیا تھا اور وہ بھی چکرا کر رہ گیا تھا۔

سجاد خان سوچ رہا تھا کہ نجمہ نے اس کے ساتھ کتنا دھوکہ کیا۔ پہلے اسے بے وقوف بنانے کے لئے ارسلان کے سیکورٹی کے ہاتھوں اغوا کی کہانی گھڑ دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ سیکورٹی والے اس سے مار مار کے نجمہ بیگم کے دوسرے بزنس کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس نے اپنے ذرائع سے ہر ممکن طریقے سے پتہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ ارسلان کو کس نے اغوا کیا اور اس کے ذرائع نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ اسے کسی سرکاری ایجنسی نے اغوا نہیں کیا اور اگر وہ ارسلان کو اغوا کرتے بھی تو ایک رات ہی اپنے پاس رکھ کر واپس کر دیتے؟

اس کے ایک دو دوستوں سے اشارتا اسے کہا تھا کہ اس عورت سے بچ کر رہے کیونکہ یہ اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کہ اپنے راستے میں آنے والی کسی بھی دیوار کو گرا دے گی۔

لیکن اس نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ سانولے بدن والی یہ عورت جو بلا کی سگریٹ نوش تھی، ایک دن اس پر بھی اپنا داؤ لگانے کی فکر کرے گی۔ اس نے زندگی میں کسی کو آدھے جیسے کا پارٹنر نہیں بنایا تھا۔ وہ خود میدان کا شیر تھا اور ساری زندگی اس نے اکیلے ہی شکار کھیلا تھا۔ یہی اس کی کامیابی کا راز بھی تھا۔

○

جیسے جیسے سجاد خان ٹہل رہا تھا ارسلان کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے حلق میں کانٹے اترنے لگے تھے جب اچانک سجاد خان نے رک کر دوسرے کمرے سے مارٹن کو آواز دی۔ اس نے میز پر رکھے بیک کی طرف دیکھ کر مارٹن کو مخصوص اشارہ کیا اور اس نے گردن ہلا کر بیک کو کھولنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس نے پانچ تھیلیاں نکال کر میز پر رکھ دی

تھیں اور اب ایک تھیلی کھول کر اس نے انگلی سے اس میں مواد کو چکھا۔ پھر باری باری پانچوں تھیلیوں کے مواد کو چکھ کر اثبات میں گردن ہلا دی۔

”فائن“ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”جاؤ!“ اس نے مارٹن سے کہا اور وہ وفادار کتے کی طرح دم ہلا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

سجاد نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سامان کی قیمت کا اندازہ لگایا اور اس کی طرف مخاطب ہوا۔

”اس نے کیا اندازہ لگایا تھا اس کی قیمت کا؟“

”مجھے صرف یہ کہا گیا تھا کہ گاہک بناؤ اور فی الوقت جو بھی قیمت ملے، وہ لے لوں۔“ ارسلان نے بغیر سوچے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ آج سے میری تمہاری دوستی پکی۔ بہادر اور ایماندار لوگوں کو اس وقت تک پسند کرتا ہوں جب تک وہ بے ایمان نہ بن جائیں۔ تم نے اگر خوفزدہ ہو کر بھی بچ بولا ہے تو بھی تمہارے بچ کی قدر کرتا ہوں۔ فی الوقت تم اسے کسی بات کی ہوا نہ لگنے دینا۔ اسے یہی باور کروانا کہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہوا ہے۔ اس بات کا پتہ لگانا تمہارا کام ہے کہ وہاں اپنے ملک میں وہ مال کس سے لیتی ہے۔ اسے قابو میں رکھو۔ جیسے وہ کہے کرتے رہتا۔ اس نے فریڈلنڈ میں تصاویر بھی مجھے لا علم رکھ کر اتروائی ہیں۔ میں اتنا گھٹیا انسان نہیں کہ اپنے جان نثاروں کی بلیک میلنگ شروع کر دوں۔ میرے لئے کوئی خطرے کا باعث نہیں بن سکتا کیونکہ میں نے کبھی کسی کو بزنس پارٹنر نہیں بنایا۔ تمہیں تمہاری توقع سے بڑھ کر ادائیگی ہوگی۔ اس دنیا میں ہر کسی کو ترقی کرنے کا آگے بڑھنے کا حق ہے لیکن مجھے کچل کر میرا ہی کوئی کارندہ آگے بڑھے یہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ میں خود تمہارا یہ مال سیل کروا رہا ہوں۔ تمہیں باقاعدہ اور الگ پارٹی کی حیثیت سے ملواؤں گا۔ گو کہ وہ میرے ہی لوگ ہیں، لیکن تم نجمہ کو یہی باور کرانا کہ تم نے اس کے لئے الگ سے گاہک بنایا ہے۔“

”شکریہ جناب! آپ نے مجھے اس قابل بنانا۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں بھی زندگی کو اپنی مرضی سے بسر کرنا چاہتا ہوں، لیکن آپ کو دھوکہ دے کر نہیں۔ ممکن ہے نجمہ بیگم

کی اس اچھی حرکت نے کہ وہ مجھے بلیک میل کر کے اپنا بندہ بے دام بنانا چاہتی ہے مجھے جذباتی کر دیا ہوا اور اس سچ کے پیچھے میرے انتقام کا جذبہ بھی کارفرما رہا ہو، لیکن یہ بات نہ بھی ہوتی تو بھی میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کا خطرہ کبھی مول نہ لیتا۔“ اس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

”انجوائے یور سیلف.....! پھر ملاقات ہوگی۔ رقم یہاں یا وہاں جہاں بھی چاہو وصول کر لیتا۔ گڈ لک..... گڈ ڈے۔“ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

اس کی روانگی کے بمشکل تین چار منٹ بعد ہی مارٹن اندر آیا۔ اس نے میز پر دھری پڑیاں سلیقے سے بند کیں اور انہیں ایک بڑی تھیلی میں ڈال کر اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لیسٹر جا رہے تھے۔ لیسٹر کے ایک پر تکلف ہوٹل میں اس کی ملاقات ایک ایشیائی سے کروائی گئی جس نے اپنا نام بھی بتایا تھا، یہی ان کا نیا گاہک تھا۔ ساٹھ لاکھ میں اس نے مال اٹھالیا تھا اور ادائیگی ارسلان نے اپنے ملک سے لیتی تھی۔ اس کو کسی غیر ملکی کرنسی کے نوٹ کا ایک ٹکڑا دے دیا گیا۔ یہ ٹکڑا اس کو اپنے ملک میں ایک شخص کو دکھا کر اس سے رقم وصول کرنی تھی۔ یہی نے اسے اپنا رابطہ نمبر اور آئندہ کے لئے کھلا مال خریدنے کی پیشکش کر دی تھی۔

ارسلان کے دل میں خوشی سے لڈو پھوٹ رہے تھے۔ فی الوقت تو معاملات اس کی مرضی کے مطابق ہی طے پار ہو رہے تھے اور اسے امید تھی کہ آئندہ بھی وہ اسی طرح تیزی سے بھاگتا چلا جائے گا۔

ہوٹل سے باہر آ کر اس نے فون کا رڈ حاصل کیا اور انٹرنیشنل بوتھ سے مسز ملک کو فون کیا۔ ”مجھے بے حد افسوس ہے مسز ملک کہ آپ نے میرے معمولی مذاق کا اتنا برا منایا۔ میں نے جس ”سرپرائز“ کا ذکر کیا تھا اس کی تفصیلات جان کر آپ میرا منہ چوم لیں گی، لیکن میں فون پر کچھ نہیں بتاؤں گا۔ باقی بات آنے پر ہی ہوگی۔ اس وقت تو میں نے آپ کی ناراضگی ختم کرنے کے لئے فون کیا تھا۔“

اس سے پہلے کہ مسز ملک کچھ کہے، اس نے اپنی صفائی پیش کر کے اسے مطمئن کر دیا۔

”مجھے تو سمجھ نہیں آ رہی تمہیں آج کل کیا ہو گیا ہے۔ خیر کوئی جلدی نہیں جب دل بھر جائے تب اطمینان سے آنا۔“

”شکریہ! امید ہے کہ آپ ناراض نہیں ہوں گی۔ خدا حافظ۔“

آٹھ دس روز تک اس نے دیار فرنگ کے مزے لوٹے۔ پھر وطن لوٹ آیا۔ مسز ملک خلاف توقع اسے خود لینے ایئر پورٹ پر آئی تھی۔ وہ ارسلان کے منہ سے اس ”سرپرائز“ کی تفصیلات سننے کے لئے بے چین تھی جو وہ اسے دینے جا رہا تھا۔

○

گھر پہنچ کر اس نے چائے پی اور ڈرائنگ روم میں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ مسز ملک کی بے چینی کا اظہار اس کی مسلسل سگریٹ نوشی سے ہو رہا تھا۔

”میں آپ کو زیادہ انتظار نہیں کراؤں گا مسز ملک! دراصل گزشتہ تین چار ماہ میں میں نے زندگی کے اتنے بھیا تک روپ دیکھے ہیں کہ شاید ساری زندگی دوبارہ نہ دیکھ پاؤں۔ یہ تو آپ بھی تسلیم کریں گی بیگم نجمہ کہ انسان تجربے سے سیکھتا ہے۔ میں نے بھی سیکھا کہ اس ملک میں عزت بڑائی اور منصب کا واحد معیار دولت ہے۔ جس کے پاس جتنی زیادہ دولت ہے وہ اتنا ہی بڑا آدمی ہے۔ اپنی جان پر کھیل کر میں جو کام کر رہا ہوں، گو کہ اس کا معاوضہ مجھے اتنا زیادہ ملتا ہے جس کی توقع بھی میں نے زندگی میں کبھی نہیں کی تھی، لیکن سوچتا ہوں کہ جب بازار میں بیٹھ ہی گئے تو پھر گھونگھٹ کیا..... مسز ملک! میں نے تو پچھلے پھرے پر ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اگلی مرتبہ اپنے اور آپ کے لئے کوئی کارنامہ ضرور انجام دوں گا..... مسز ملک جب میں سجادول خان کا مال لے کر جاتا ہوں تو ہم دونوں اپنا سائیز بزنس آخر کیوں نہیں کر سکتے۔ اس کی آڑ میں ہی سہی اور اس پر اصولاً اسے کوئی اعتراض بھی نہیں ہوگا۔ حالانکہ یہ معاملہ کبھی اس کے علم میں نہیں آئے گا.....! ٹھہریئے۔“

اس نے نجمہ بیگم کو بے چینی سے کروٹ بدلتے دیکھ کر کہا۔

”میری پوری بات سننے کے بعد ہی آپ کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گی۔ مسز ملک! میں اپنے ساتھ ہیروئن کی تھوڑی سی مقدار الگ سے بھی لے گیا تھا..... اور کمال کی بات تو یہ ہے کہ میں نے سجادول خان اور اس کے کارندوں کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی اور..... پارٹی الگ سے کھڑی کر لی۔ مسز ملک دس ہزار روپے کے دس لاکھ..... آدھے آپ کے آدھے میرے۔ کیونکہ میں آپ سے پارٹنرشپ کے بغیر کوئی کام نہیں کروں گا۔ آپ کو غصہ تو آیا ہوگا جب اس مرتبہ میں نے آپ سے زندگی میں پہلی مرتبہ اس طرح پیسوں کی بات کی، دراصل وہ پیسے تب میری ضرورت تھے۔ آج

میں ذیل کر کے منافع کے ساتھ لوٹا ہوں۔“

اس نے ایک ہی سانس میں ساری باتیں کہہ کر نجمہ بیگم کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ ہوس کی ماری نجمہ بیگم کی آنکھوں پر ایسی پٹی بندھی تھی کہ اسے پھر سادوں کے اندھے کی طرح ہر طرف ہر اہی ہر ادکھائی دینے لگا۔

”لیکن ارسلان..... خطرہ بہت ہے۔ اگر کبھی سجاو کو علم ہو گیا تو وہ بڑا ظالم آدمی ہے۔“ اس نے اتمام حجت کے لئے کہہ دیا۔

”چھوڑیئے نجمہ صاحبہ! اولاً تو آپ کی زلفوں کے کسی اسیر کی جرأت ہی نہیں کہ آپ کی طرف آنکھ بھر کر بھی دیکھے۔ پھر اسے علم ہو گا ہی کیوں اور اگر ہوا بھی تو بے فکر رہے۔ میں مرتا مرجاؤں گا! آپ کا نام کبھی زبان پر نہیں لاؤں گا۔“ اپنی بات کے خاتمے پر اس نے خاصی بے تکلفی کا مظاہرہ کر دیا تھا۔

”گدھے کہیں گے۔ یہ یورپ نہیں۔ خیال رکھا کرو۔“ نجمہ بیگم نے آنکھوں سے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

چڑیا اس کی سکیم کے عین مطابق اس کے جال میں پھنس گئی تھی۔

”اب میں دیکھوں گا مسز ملک کہ کون کسے بلیک میل کرتا ہے۔“ وہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

○

صبح اس نے نجمہ ملک سے تفصیلاً ساری بات کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ اگر ایک دو کامیاب چکر بھی لگ گئے تو وہ دونوں ہی کروڑ پتی بن جائیں گے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو گی۔ اس نے نجمہ بیگم کو باور کروانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اگر چاہے تو سجاو خان سے بڑا اپنا بزنس قائم کر سکتی ہے اور اپنے ملک ہی میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں اپنے دفتر بھی کھول سکتی ہے۔

نجمہ بیگم نے یوں تو ہر بات پر اثبات میں سر ہلایا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتی جا رہی تھی کہ سجاو خان سے بچ کر رہنا۔

”مسز ملک ہم اس کے خلاف کچھ نہیں کرنے جا رہے۔ کیا وہ بھی پہلے دن ہی ایسا تھا؟ اس نے بھی اپنا اشارت ”پانڈی“ کی حیثیت سے کیا تھا اور آج درجنوں لوگ اس کے لئے کام کر

رہے ہیں۔

یہاں سے اٹھ کر وہ سیدھا مختاراں بائی کے ڈیرے پر آیا تھا۔ اس کے وکیل دوست نے کوٹھی کے فرنیچر اور ضروریات زندگی کے جج جانے کی اطلاع اسے پہنچادی تھی۔ مختاراں کی تو باجھیں اسے دیکھتے ہی کھل گئیں۔ ماں بیٹی کے لئے وہ لندن سے جو تحائف لایا تھا وہ ایک ایک کر کے اس نے دونوں کے سامنے رکھ دیئے۔ ماں بیٹی اس کی ہر ہر ادھر پر قربان ہوتی جا رہی تھیں۔

”بی بی! ابھی اصلی چیز تو تم نے دیکھی ہی نہیں۔ آؤ میرے ساتھ.....!“ اس نے ماں بیٹی کو اشارہ کیا۔

”کہاں؟“

”ابھی بتاؤں گا نہیں۔ بس دیکھو گی تو یقین نہیں آئے گا۔“

حیران ماں بیٹی کو اس نے گاڑی میں بٹھایا اور سیدھا اپنی کوٹھی پر لے آیا۔ چونکدار نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی دروازہ کھول دیا۔ مختاراں کی تو آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”باؤ ارسلان! یہ ہمیں کہاں لے آئے ہو؟“ اس نے شاندار اور سامان قیمیش سے بچے سجائے ڈرائنگ روم کے قیمتی صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا تھا ناں کہ بی بی ذرا صبر کرو۔ سارے دھونے دھودوں گا۔ بی بی! یہ میرا گھر ہے بلکہ میرا نہیں تمہارا..... ہاں یہ اب تمہارا گھر ہے.....!“

مختاراں حیرت سے اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ اس نے فلموں میں تو ایسا کچھ ہوتے دیکھا تھا، عملی زندگی میں بھی ایسا ممکن ہے؟ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

”تم ذرا بچن میں جا کر چائے بناؤ۔ میں بی بی سے ضروری بات کر لوں۔“ اس نے نازنین کو اشارہ کیا۔

اس کے ساتھ ہی مختاراں نے آنکھ دبا کر نازنین کو اٹھ جانے کی تلقین کی۔

”دیکھو بی بی! میں تم سے بہت دنوں سے بات کرنے کی سوچ رہا تھا۔“ نازنین کے جاتے ہی اس نے مختاراں سے کہا۔ ”لیکن میں ہوا میں باتیں کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ یوں بھی آدمی تجربے سے ہی سیکھتا ہے اور تم جانتی ہو کہ میرے ساتھ تصویروں والے معاملے میں کیا دھوکہ ہوا۔ خیر! اس کا ازالہ تو ہو جائے گا۔ فی الوقت میں نے تم سے یہی کہنا تھا کہ اب تم اپنا کوٹھا چھوڑ دو

صاحبزادی کے گانے سے ہی دل بہلانے چلے آتے تھے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ بازار کی سیانی بانیاں جیسے ہی کوئی کام کا گاہک ملتا، ماہوار پر اپنی بچيوں کو ان کے ہاں بٹھا رہی تھیں۔

ارسلان کی پیش کش شاندار تھی۔

اگر کوئی سو سمجھ اس کے دل میں تھا تو وہ ماضی کے حوالے سے..... لیکن وہ بھی ارسلان نے ثابت کر دیا تھا اس نے جان بوجھ کر دھوکا نہیں دیا بلکہ وہ خود دھوکے میں مارا گیا۔ اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد ارسلان کی پیشکش قبول کر لی اور پانچ چھ روز میں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر دونوں ماں بیٹی یہاں منتقل ہو گئیں۔ دونوں کران کی خدمت کے لئے موجود تھے۔ کوٹھا اچھے کرائے پر اٹھ گیا تھا۔ بازار والوں کو اس نے اپنے نئے ایڈریس سے ابھی آگاہ نہیں کیا تھا۔

اب ارسلان کے کھیل کا دوسرا سین شروع ہونے والا تھا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت اب اپنے گھر ہی میں بسر کرتا تھا۔ ملازموں کے نزدیک ان کی حیثیت ایک خاندان کی سی تھی۔ یوں بھی یہ کوئی بہت زیادہ سمجھدار ملازم نہیں تھے کہ ان کی تحقیق کرتے پھرتے وہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔



لندن میں بھٹی کے پاس جو مال اس نے فروخت کیا تھا، وہ رقم اسے یہاں وصول ہو گئی تھی۔ جسے اس نے کمال ہوشیاری سے مختلف کمپنیوں میں سرمایہ کاری کی نذر کیا تھا۔ اب وہ بجا طور پر خود کو کروڑ پتی کہلا سکتا تھا۔

اس روز جب اس نے مسز ملک سے اگلے چکر کی بات کی تو جیسے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ مسز ملک کو ابھی اسکے سجال خان کی طرف سے کوئی ایسا تاثر نہیں ملا تھا جس سے وہ اندازہ کر سکتی کہ سجال خان اس کے تئیں بدظن ہو گیا ہے۔

اس مرتبہ اس نے یہ ضرور کہا تھا کہ ارسلان سے کہو تھوڑا انتظار کرے، لیکن اس اطلاع نے کہ وہ کسی دوسرے پاسپورٹ پر سفر کر رہا ہے، اسے مطمئن کر دیا تھا۔

”اور اپنے مال کی فکر بھی ابھی سے کیجئے۔“ اس نے مسز ملک سے کہا۔

”ہاں۔ تم آج ”شو کے“ سے مل لو۔ سارا بندوبست وہ کر دے گا۔“ منیر ملک نے

جواب دیا۔

اور یہاں منتقل ہو جاؤ۔ دس ہزار روپے مہینے کا خرچ بندھا ملتا رہے گا۔ وہاں بازار میں مکان کرائے پر چڑھا دو..... مختاراں بابائی! میرا پروگرام نازنین کو بہت اونچا لے جانے کا ہے۔ یوں بھی اب بازار میں تمہاری شہرت کچھ اچھی نہیں رہی اور حکومت نے اس کام پر جو سختی شروع کی ہے تو دیکھ لینا کہ اب کوئی ہمت والی ہی کوٹھا سجائے گی۔ میں نے نازنین کو اس گندگی سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کوٹھی اس کے نام لگا دوں گا اور ساری زندگی عیش کرے گی۔ آگے تمہاری مرضی۔ زبردستی کوئی نہیں سوچ سمجھ لو۔ ایک طرف وہی بازار کی ذلالت اور دوسری طرف باعزت زندگی۔ یہاں دو تین نوکر رکھ لو اور عزت سے زندگی بسر کرو اور اس میں دھوکے والی بات بھی کوئی نہیں۔ بازار والا گھر تمہارے قبضے ہی میں رہے گا۔ کون سا بھاگا جا رہا ہے۔“

اس نے پوری تیاری اور ہوشیاری کے ساتھ سنہری جال اس بوڑھی پھلی پر پھینک دیا اور مختاراں اس جال میں پھنس گئی۔ حالات نے ارسلان کو بڑا ماہر نفسیات بنا دیا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہاں مختاراں کا برنس نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ یوں بھی اب بازار صرف نام کا ہی بازار حسن رہ گیا تھا۔ رات بھر میں بمشکل دو گھنٹے بازار کھلتا تھا۔ اس درمیان پولیس کی اتنی نفری وہاں ہوتی تھی کہ عام آدمی تو وہاں جاتے ہوئے بھی خوف زدہ رہتا تھا۔ حیلوں بہانوں سے پولیس ہر طرح اس طرف آنے والوں کی حوصلہ شکنی کرتی تھی۔

یوں تو کسی قسمت والی بانی کے کوٹھے پر ہی اس دو گھنٹے کے وقفے میں کوئی گاہک آتا تھا۔ اگر کوئی آہی جاتا تو پولیس والے بھی اس کے تعاقب میں دھڑ دھڑ کرتے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے آتے۔ نئے ایس پی نے تو ان لوگوں کا ناٹھہ بند کر رکھا تھا۔ کوئی ایسا کوٹھا نہیں تھا جس پر شراب نوشی یا جسم فروشی کا مقدمہ نہ بنا ہو۔ کجیروں نے ہڑتال کر کے دیکھ لی تھی۔ رشوت اور اثر و رسوخ آزمایا تھا۔ اپنے تمام ذرائع استعمال کر کے دیکھ لئے تھے..... سمجھدار بابائیاں اپنے کوٹھے کرائے پر چڑھا کر شہر کی نئی آبادیوں میں رہن بسیرا کر رہی تھیں۔ اگر کوئی چوری چھپے جسم فروشی کا دھندہ کر رہی تھی تو اس کا گزارہ تو ممکن تھا، لیکن خاندانی طوائفوں پر براہِ وقت آیا تھا اور صرف ناچ گانے سے اب زندگی کی گاڑی گھسیٹنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

یہ سارے حالات مختار ابا جی گھاگ اور زمانہ ساز طوائف کی نظروں سے اوجھل نہیں تھے اور نئے حالات میں اب وہ خاندانی تماش بین بھی کم ہی نظر آتے تھے جو اس کی

”اس مرتبہ دو بیک تیار ہوں نجمہ صاحبہ!“
”کیوں؟“

”ابھی آپ یہ بات نہ پوچھیں۔ صرف میرا کام دیکھیں۔ میں زیادہ عرصہ اس دھندے میں رہنا نہیں چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس حوالے سے شہرت کماؤں دولت کی البتہ الگ بات ہے۔“

”ارسلان ذرا سنبھل کر چلنا۔“ مسز ملک نے اس سے مزید پوچھ گچھ مناسب نہ جانی۔ اگلے روز وہ شہر کے دوسرے بڑے اور بدنام ہیروئن فروش شو کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ دونوں بیک اس کی مرضی کے مطابق تیار ہو گئے تھے اور وہ بڑی سرعت سے دوسرے انتظامات مکمل کر رہا تھا۔ ابھی تک شومئی تقدیر سے اس کا ہر پتہ سیدھا پڑ رہا تھا۔

○

اس اطلاع پر کہ وہ مختاراں اور نازنین کو اپنے ساتھ لندن لے جا رہا ہے دونوں ماں بیٹی خوشی سے پھولے نہیں سار ہی تھیں۔ مختاراں تو یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ نازنین سے شادی کے لئے مختاراں کی خوشنودی حاصل کر رہا ہے اور اس چکر میں اسے لندن کی سیر کی رشوت پیش کر رہا ہے۔ ”وہاں اپنا گھر ہے دفتر بھی ہے.....!“ اس نے مختاراں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

مختاراں یہ سمجھ رہی تھی کہ واقعی اس کا ہونہار ہونے والا داماد کوئی بڑا سیٹھ ہے جس کا کاروبار دنیا کے کونے کونے میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ تو وہ بھی سمجھتی تھی کہ یہ ساری حرام کی کمائی ہے لیکن جو کچھ وہ ان ماں بیٹی کے ساتھ..... کرنے جا رہا تھا یہ تو ان دونوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

دونوں کو تیار شدہ بیک تھما دیئے گئے۔ ایک ایچی کیس الگ سے تیار تھا۔ ان دونوں کو لندن سے سپانسر شپ منگوا کر بھیجا جا رہا تھا۔ دونوں بظاہر اپنے عزیز کی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے جا رہی تھیں۔ ارسلان نے انہیں سمجھایا تھا کہ یہاں ہیرا پھیری سے ہی جانا پڑتا ہے ورنہ یہ لوگ ویزہ ہی نہیں دیتے۔

تینوں ایک ہی جہاز میں روانہ ہوئے تھے۔ عین آخری لمحات میں جب اس نے مسز ملک کو اپنی تازہ صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ عیش عیش کر اٹھی۔ ارسلان تو اس کی توقع سے بڑھ کر

کام کا بندہ ثابت ہوا تھا۔ جو کچھ وہ سوچ نہیں سکتی تھی وہ کچھ وہ کرنے جا رہا تھا۔ یہ تو اس کے لئے چونکا دینے والی اور حیرت انگیز خبر تھی۔ احتیاطاً اس نے خود ایئر پورٹ پر نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن.....!

تینوں جہاز پر بغیر کسی روک ٹوک کے پہنچ گئے تھے۔

ارسلان نے جدید فیشن کے مطابق داڑھی بڑھائی تھی۔ چہرے پر خوبصورت فریم کی عینک لگائی تھی اور وہ اس روپ میں ایک اور پاسپورٹ پر تصویر بدل کر سفر کر رہا تھا۔ کیا مجال جو اس کی بدلی ہوئی حالت کی طرف ایک لمحے کے لئے بھی مختاراں کا خیال گیا ہو۔ ایسٹرزڈم تک انہوں نے اپنی آنے سانسے کی سیٹ پر بیٹھی فیملی سے اچھی خاصی دوستی کر لی تھی۔ لوگوں کو لہانے کے انداز تو ماں بیٹی کو خوب آتے تھے۔ ایسٹرزڈم پر ٹرانزٹ میں پہنچ کر اس نے دونوں کو دکھانے کے لئے ایک جعلی فون کیا پھر منہ لٹکائے واپس آ گیا۔

”بی بی! تم آدھ گھنٹے میں لندن پہنچو۔ میں شام تک آؤں گا۔ بے فکر رہنا گھبرانا نہیں۔ وہاں تمہیں لینے کے لئے میزبان آئے ہوں گے۔ اچھا اب چلو وہاں تمہارے نام کی تختی لئے کوئی کھڑا ہوگا گھبرانا نہیں..... ہاں.....!“

اس سے پہلے کہ انہیں کچھ سمجھ آتی جہاز کی روانگی کا اعلان ہونے لگا۔

”بھائی صاحب! مجھے ایک ایمر جنسی کی وجہ سے یہاں دو گھنٹے رکتا پڑے گا۔ آپ برائے مہربانی میری مسز اور ان کی مدر کو ہتھ پر گائیڈ کرتے رہیں۔“

اس نے مختاراں کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اپنے ہم سفر سے کہا۔

”آپ گھبرا ئیں نہیں آنٹی! ہم ہیں ناں۔ ہمارے ساتھ ہی چلیں..... بلکہ آپ ہمارے مہمان رہیں پلزز۔ ہمیں بہت خوشی ہوگی۔ ہم سفر نو جوان خاصا ہمدرد دکھائی دے رہا تھا۔“

”اچھا بیٹا! لیکن جلدی آ جانا۔ نازنین کا دل بہت گھبرائے گا۔“

مختاراں نے گھبراہٹ میں ہتھیرا ڈال دیئے کیونکہ ہم سفر نو جوان نے اسے چلنے کے لئے کہنا شروع کر دیا تھا۔

”خدا حافظ۔“ اس نے نازنین کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

سازش اور ٹکراؤ

”خدا حافظ۔“ نازنین نے زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔
دونوں ماں بیٹی جہاز کی طرف جا رہی تھیں اور ارسلان امیگریشن کی طرف۔ انہیں اس بات کی سمجھ ہی نہ آ سکی کہ اس کی بکنگ ہی ایئر سٹرڈم تک تھی، یہاں سے اس نے دوسرا ذریعہ سفر اختیار کرنا تھا۔



ہیتھرو ایئر پورٹ پر نازنین اور اس کی ماں کی راہنمائی ان کے ہم سفر میزبانوں نے ان کی توقع سے بڑھ کر کی تھی۔ یہ مقامی لوگ تھے جو اپنے رشتے داروں کو ملنے پاکستان گئے تھے اور اب واپس آئے تھے۔ امیگریشن سے کسٹم تک وہ ماں بیٹی سے چپکے رہے۔ انہوں نے کسی مرحلے پر انہیں ارسلان کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ان لوگوں نے دونوں کا سامان خود ریو لوئنگ بیلٹ سے اٹھا کر ٹرالی پر رکھا اور اپنے ساتھ ہی باہر بھی لے آئے تھے۔

گرین چینل سے گزرتے ہوئے اس گروپ کے صرف ایک آدمی کو روک کر کسٹم والوں نے اس کا برٹش پاسپورٹ دیکھا پھر باقیوں سے باز پرس نہیں کی.....!

یہ ان کی خوش قسمتی کی انتہا تھی کہ دونوں ماں بیٹی محفوظ رہیں۔ ان کے ہم سفر تو ابھی تک ان سے چپے ہوئے تھے اور اسی نوجوان نے جس نے اپنا نام اظہار بتایا تھا نازنین کو دو تین مرتبہ الگ الگ کاغذ کے ٹکڑوں پر اپنا فون نمبر لکھ کر دیا تھا۔

لیکن.....!

ان سب کی بد قسمتی کہ نازنین کے میزبان یہاں پہلے ہی سے ماں بیٹی کے منتظر

تھے.....!

ایک نوجوان لڑکی نے نازنین اور اس کی والدہ کے نام کے الفاظ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ان کی سہولت کے لئے لکھے ہوئے تھے۔ اگر صرف انگریزی میں بھی لکھے جاتے تو نازنین کم از کم اپنا نام ضرور پڑھ لیتی۔

جس بے اعتنائی سے وہ اپنے ہم سفر کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر ٹرائی کھینچتی ہوئی اس لڑکی کی طرف بڑھی اس ”حسن سلوک“ نے اس کے ہم سفر کو ایک مرتبہ تو بوکھلا کر رکھ دیا۔

کبخت نے کسی سے سلام لینا تک گوارا نہیں کیا۔ البتہ مختاراں نے بیٹا جی بھائی جی کہہ کر دو تین کو خدا حافظ اور شکریہ کے الفاظ کہتے ہوئے اپنی دانست میں حاتم کی قبر پر لات ضرور مار دی تھی۔

○

نازنین کے ہم سفر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

دونوں ماں بیٹی اپنی ٹرائی سمیت میزبان لڑکی کے سامنے پہنچ گئے جس نے انہیں پہنچانے ہی ”آصفہ“ کہہ کر اپنا ہاتھ باری باری دونوں سے ملایا۔ بڑی گرمجوشی سے ان کی خیریت دریافت کرنے لگی۔

ٹرائی اس نے خود تھام لی تھی اور ماں بیٹی ان کے تعاقب میں لفٹ کی طرف جا رہی تھیں۔ ہیتھرو ایئر پورٹ کی رونقوں نے انہیں گنگ کر دیا تھا۔ لاؤنج ہی میں موجود ”سروس“ سے اس نے دونوں کو جوس پلایا اور وہیں سے فون کر کے کسی کو اپنی آمد سے مطلع کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لفٹ کے ذریعے اوپر کی منزل میں موجود پارکنگ پر کار میں بیٹھ رہے تھے۔ سامان آصفہ نے خود ڈیگی میں رکھا تھا۔ ایک مرتبہ تو سردی نے دونوں کے دانت بجا دیئے لیکن کار کے ہیٹروں نے دوبارہ انہیں نازل کر دیا۔

شیشے کے کمرے میں بند بندروں کی طرح دونوں ماں بیٹی حیرت اور استعجاب کے عالم میں راستوں کی رونقوں سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔

کار انہیں ”سیٹن“ کی ”ہائیڈرولین“ پر واقع ایک شاندار بنگلے تک لے آئی تھی۔ راستے میں آصفہ نے دو تین مرتبہ ان سے معذرت کی تھی کہ ارسلان صاحب کو ایئر سٹرڈم پر ایک ہنگامی

ضرورت کے لئے رکن پڑا..... اس نے ماں بیٹی کو یہی تاثر دیا تھا کہ جیسے ارسلان کوئی بہت معزز اور کاروباری آدمی ہے۔ بنگلے پر ایک انگریز لڑکی ان کی منتظر تھی جس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں انہیں خوش آمدید کہا اور آصفہ بھی وہیں رک گئی۔

○

ان کا سامان اندر رکھ دیا گیا۔ کھانا شاید پہلے ہی سے تیار تھا۔ ابھی وہ کھانے کی تیاری ہی کر رہی تھیں جب انہیں ارسلان کا فون موصول ہوا۔ آصفہ نے فون اٹھایا تھا پھر مختاراں کی طرف بڑھا دیا۔

”بی بی! گھبرانا نہیں۔ اس ملک کا ماحول ہی ایسا ہے۔ میں صبح تک پہنچ جاؤں گا۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی.....؟“ اس نے مختاراں کی دل جوئی شروع کر دی۔

مختاراں کو اب تک اس کے میزبانوں نے اتنا خوش کر دیا تھا کہ اب اس کے لئے گھبرانے کی کوئی بات ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے دو چار باتیں کر کے فون اپنی بیٹی کو تھما دیا اور خود دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

نازنین نے فون پر بھی ناز و ادا دکھانے شروع کر دیئے تھے۔ اس نے بڑے رومانٹک لہجے میں باؤ ارسلان کی غیر موجودگی کا شکوہ کیا۔ ارسلان نے اسے مختاراں سے زیادہ مطمئن کیا تھا اور کہا تھا یہ دونوں لڑکیاں ان کی نوکرانیاں ہیں اور وہ جس طرح بھی چاہیں گے یہ ان کی خدمت کریں گی۔ اس نے نازنین سے کہا تھا کہ جس چیز کو اس کا دل چاہے بلا جھجک انہیں بتا دے۔ پھر اگلے روز پہنچنے کا وعدہ کر کے اس نے فون بند کر دیا۔

دونوں ماں بیٹی کی آنکھ بھٹکل چند منٹ کے لئے لگی پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ان کے فرشتوں کو بھی اس بات کا پتہ نہ چل سکا کہ ان کے دونوں بیگوں سے سارا سامان یہاں پہلے سے موجود دو بیگوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ اس تبدیلی کا اندازہ وہ کبھی کیسے سکتی تھیں۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں رہی ہوگی۔

دونوں نے کپڑے تبدیل کئے اور ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئیں۔

لندن وہ پہنچے تو یہاں صبح ہو رہی تھی اور گھر پہنچنے تک دو پہر ڈھل گئی تھی..... یہاں کا موسم ابھی تک ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ سہ پہر کے بعد آصفہ نے انہیں لندن دکھانے کے لئے

اپنے ساتھ کار میں بٹھالیا۔ دونوں ماں بیٹی کو وہ ایک بڑے سنور پر لے آئی تھی۔ ایسا سنور وہ خواب یا فلموں میں تو دیکھا کرتی تھیں، آج عملی طور پر پہلی مرتبہ دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ دونوں کے لئے یہاں سے آصفہ نے ان کے ساز کے لمبے کوٹ خریدے اور جب وہ گرم اونی کوٹ پہن کر باہر نکلیں تو خواہ مخواہ خود کو معزز خیال کرنے لگی تھیں۔

رات گئے تک آصفہ نے انہیں لندن کی وہ وہ رونقیں دکھا دی تھیں کہ مختاراں اور نازنین دم بخود رہ گئیں۔ ایسے ایسے بازار پارک ہوٹل، سڑکیں، راستے، لوگ، برقی سیڑھیاں، تیز رفتار لفٹیں، انڈر گراؤنڈ ریل ان کے لئے تو یہ کوئی اور ہی دنیا تھی۔ جیسے جیسے وہ لندن کا نظارہ کر رہی تھیں، ان کے دلوں میں ارسلان کی عزت اور رعب بڑھتا جا رہا تھا۔

دونوں جانتی تھیں کہ یہاں کا ایک پاؤنڈ کتنے پاکستانی روپوں کے برابر ہے اور دونوں نے دیکھ لیا تھا کہ آصفہ نے کس طرح بے رحمی سے پاؤنڈوں کو ان پر خرچ کیا تھا۔

”جانے باؤ ارسلان نے یہاں کیا دھندہ شروع کر رکھا ہے؟“ نازنین نے رات کا کھانا ایک شاندار ہوٹل میں کھاتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں اپنی ماں سے کہا۔

”بچی آم کھا۔ تجھے گھلیوں سے کیا لیتا۔ شکر کر مولانا نے سن لی ورنہ تو میرا بڑا ہاپارل

جاتا۔“

رات کو دونوں ماں بیٹی دیر گئے تک ٹی وی سے چٹنی رہیں۔ وہ نندیدے بچوں کی طرح یہاں کے ایک ایک منظر کو ایک ایک لمحے کو انجوائے کر رہی تھیں۔ آدھی رات کے بعد بمشکل مختاراں نے نازنین کو سونے کے لئے راضی کیا.....!

○

ایمسٹرڈم ایئر پورٹ سے باہر آ کر اس نے ڈرائیور کو ایک ایڈریس سمجھایا اور اب ٹیکسی اس کے بتائے ہوئے ایڈریس کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی۔ ایمسٹرڈم کے براڈوے پر تیرہویں سٹریٹ پر واقع ایک پلازہ پر پہنچ کر ٹیکسی رک گئی۔ بڑے بڑے خوبصورت شیشوں سے مرصع اس بلڈنگ کی پانچویں منزل کے ایک کمرے کے سامنے وہ لفٹ کے ذریعے پہنچا اور باہر لگی گھنٹی بجانے پر اندر دروازے کے سوراخ سے ایک آنکھ نے اس کا جائزہ لیا۔

”کہان ہو تم؟“ دروازے سے باہر مائیک کی آواز آئی۔

”ارسلان!“ اس نے اپنا نام بتایا۔

”کس سے ملو گے؟“ اگلا سوال ہوا۔

”سلیم صاحب سے.....!“

”او کے!“

دروازہ کھل گیا۔

جس نسوانی آواز نے اس سے انگریزی میں بات کی تھی، اسی نے دروازہ کھولا تھا۔

یہ ایک آرام دہ اور جدید ترین سہولیات سے مزین فلیٹ تھا۔ ایک کمرے میں اپنا مختصر سا سامان پھینک کر وہ لڑکی کو نظر انداز کرتا بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

لڑکی نے بھی ایک نگاہ غلط اس پر ڈالی اور اب وہ فون پر سلیم صاحب کو اس مہمان کی آمد سے مطلع کر رہی تھی۔

”تھوڑی دیر بعد وہ خود رابطہ کریں گے سر!“ اس نے کسی مقامی زبان میں فون پر بات کرنے کے بعد انگریزی میں ارسلان کو مطلع کیا۔

ارسلان کو امید تھی کہ وہ شام کی فلائٹ سے لندن جائے گا، لیکن سلیم صاحب شاید کسی ”لبی مار“ پر نکلے ہوئے تھے۔

شام ڈھلنے تک میزبان لڑکی نے ”حق میزبانی“ خوب خوب ادا کر دیا تھا اور ارسلان کی تھکاوٹ بھی اب اتر چکی تھی۔ اسی درمیان اسے فون پر لندن رابطہ قائم کرنے پر یہ خوشخبری بھی مل چکی تھی کہ اس کے ”دونوں پارسل“ بخیر و عافیت اپنے ”ایڈریس“ تک پہنچ چکے تھے۔

اس اطلاع نے اس کے تنے ہوئے اعصاب کو خاصا پرسکون کر دیا تھا..... رہی سہی کسر ہالینڈ کی شراب اور لڑکی نے پوری کر دی۔

رات اپنے پرائیویٹ ایمسٹرڈم پر پھیلا چکی تھی جب سلیم صاحب بنفٹس وہاں آ پہنچے۔ ایک لمبا ترنگا سیاہ قام باڈی گارڈ ان کے ساتھ ہی وہاں آیا تھا۔ پھر وہ دروازے پر جم کر بیٹھ رہا اور سجاد خان دوسرے کمرے میں ارسلان سے مخموتگو ہو گیا..... لڑکی نے کچن میں اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔

ارسلان نے اسے بڑی تفصیل سے آگاہ کیا تھا اور بتا دیا تھا کہ نجمہ بیگم کے حکم پر اس

نے ”شو کے“ سے پاؤ ڈر حاصل کیا ہے۔ اسی نے بیک تیار کر کے دیئے ہیں اور اپنی مدد کے لئے اس مرتبہ دو طوائفوں کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ اس نے سجاد خان کو بتایا تھا کہ ابھی تک اس نے دونوں کو لا علم رکھا ہے اور وہ یورپ دیکھنے کے شوق میں ہی قابو آ گئی ہیں۔

”مستقبل میں یہ جوڑی آپ کا بہترین اثاثہ ثابت ہوگی۔ جناب اگر حکم دیں تو انہیں قابو میں کر لوں..... میں نے آپ کی اجازت کے بغیر بات کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ بیگم نجمہ ان دونوں کو جانتی ہے کیونکہ یہ ملک صاحب کی خدمت بھی کرتی رہتی ہیں لیکن آج تک نجمہ بیگم سے ان کی براہ راست ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی ان کا آپس میں تعارف ہے..... ہاں میں نے اسے یہ ضرور بتا دیا ہے کہ میں اس مرتبہ انہیں استعمال نہیں کروں گا۔“

چرب زبانی اور مکاری پر جو کمال اسے حاصل ہو گیا تھا اس کے لئے وہ اکثر خود کو دل ہی دل میں داد دیا کرتا تھا۔

”وڈرفل.....!“ خدا جانے سجاد خان نے اس کی مکاری کو خراج تحسین پیش کیا تھا یا ارسلان کو؟“ اس نے اپنی عادت کے مطابق ٹہلتے ہوئے اس کی بات پر غور کیا تھا پھر سرگرمی کا کش لگا کر اسے داد دی۔

ارسلان کا دل بلیوں اچھلا..... جس کامیابی سے وہ اپنا کھیل کھیل رہا تھا یہ اسی کا حصہ تھا۔

”میں دیکھوں گا اسے..... کہاں تک بھاگے گی سالی۔“ سجاد خان آہستہ سے بڑبڑایا۔

”بہت احسان فراموش عورت ہے خان صاحب۔ میں نے سیاست میں بہت برے برے لوگوں کو دیکھا ہے لیکن ایسی ناگن نہیں دیکھی۔“ اس نے سجاد خان کے موڈ کو سمجھتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔

”تم مجھے باخبر رکھنا برخوردار! ابھی تک اس کا واسطہ اپنے جیسے لوگوں سے رہا ہے۔ میں اسے جہنم رسید کر دوں گا..... مجھے صرف یہ دیکھنا ہے کہ یہ جاتی کہاں تک ہے..... اور ہاں اب تم کسی بھی طرح اسے اپنے ساتھ لندن آنے پر تیار کرنا۔ باقی پلان تجھے میں سمجھا دوں گا۔ ان عورتوں کو قابو میں رکھو۔ کبھی کبھی کھوٹا سکہ بھی چل جاتا ہے..... دنیا کے بازار کا اتار چڑھاؤ کوئی

انوکھی بات تو نہیں۔“ اس پر پھر فلسفہ بگھارنے کا دورہ پڑا تھا۔
ارسلان کو اس نے نجمہ بیگم کے مال کی فروخت کے لئے دوبارہ بھیجی سے رابطہ کرنے کو کہا اور رخصت ہو گیا۔

○

اپنے کمرے ہی سے اس نے علی الصبح لندن جانے والی ایک فلائٹ پر سیٹ بک کروالی تھی اور اس کی ڈیج میزبان نے اسے وقت گزارنے کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ لفٹھانسا ایئر لائن کی فرسٹ کلاس میں وہ ایئر ہوسٹس کے نرغے میں راجہ اندر بنا بیٹھرو کی طرف محو پرواز تھا۔

ایک تسکین، ایک طمانیت اور فتح کا احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اس نے نجمہ بیگم پر آکٹوپس کی طرح ایک ایک ہاتھ پاؤں باری باری باہر نکال کر اپنا شکنجہ مضبوط کرنا شروع کر دیا تھا..... وہ مسز ملک کو اس طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لینا چاہتا تھا کہ پھر وہ ہاتھ ہلانے کے قابل ہی نہ رہ جائے۔

”گٹ وگ“ ایئر پورٹ کے امیگریشن والوں نے ایک اچھتی نظر اس کے پاسپورٹ پر ڈالی جو مختلف یورپی ممالک کی مہروں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک آدھ روایتی سا سوال اس سے کیا اور اس کے لئے لندن کے دروازے کھول دیئے۔

”ہیٹن“ کی ”ہائیڈ لین“ والے بنگلے پر جب وہ ٹیکسی سے اتر کر دستک دے رہا تھا تو نازنین اور مختار ال ٹی دی سے چٹٹی بیٹھی تھیں۔ دروازہ آصفہ نے کھولا۔

”ویل کم سرا!“ اس نے ارسلان کی شکل پر نظر پڑتے ہی دانت نکال دیئے۔
”کیسے ہیں مہمان؟“ اس نے اندر داخل ہوتے ہی اپنے مہمانوں کی خیریت دریافت کی۔

”ایک دم ٹھیک ہے سر۔“
”کام ٹھیک ہو گیا.....؟“ اس نے آصفہ کی آنکھوں میں جھانک کر اگلا سوال کیا۔
”ییس سرا!“ آصفہ نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ ”توقع سے زیادہ بیوقوف عورتیں ہیں۔“

ہوں بازار میں تمہارا ایسا رعب ہو کہ پھر کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔“
 ”اے بیٹا! تمہارے منہ میں گھی شکر.....!“ مختاراں نے ہاتھ کے مخصوص اشارے سے کہا اور کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ شاپنگ کے لئے جارہے تھے۔.....!
 کار اس مرتبہ بھی آصفہ چلا رہی تھی۔ اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر مختاراں بیٹھی تھی اور اس کی صاحبزادی پچھلی سیٹ پر ارسلان کے ساتھ چپکی بیٹھی تھی۔

لندن کو دن میں دیکھنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا..... پہلے ہی اسٹور میں گھومتے ہوئے انہیں دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ ماں بیٹی نے ندیدے بچوں کی طرح لپک لپک کر میک اپ کا سامان اٹھایا تھا اور اپنے لئے الگ الگ انتخاب کیا تھا۔ دونوں سامان کے پیکیٹوں سے لدی پھندی باہر آئیں۔ اب کار کا رخ ایک مہنگے ہوٹل کی طرف تھا۔

بدذاائقہ کھانے دونوں ماں بیٹی اس طرح مزے لے کر کھا رہی تھیں جیسے وہ بچپن سے ہی کھاتی آرہی ہوں۔ ان کی حتی الوسع کوشش یہی تھی کہ آصفہ انہیں ”جنگلی“ نہ سمجھے اور خود کو مہذب ثابت کرنے کے لئے وہ لقمہ لقمہ کر کے انگریزی کھانے زہر مار کر رہی تھیں۔
 شام تک تھک کر وہ چور ہو گئیں تو آصفہ انہیں واپس لے آئی۔

○

اس رات بھٹی ان سے ملنے آیا تھا۔ اس نے دونوں بیک وصول کر لئے تھے۔ نجمہ بیگم والے بیک کا 70 لاکھ روپیہ ارسلان نے الگ سے وصول کر لیا تھا اور دوسرے بیک کی مزدوری بھی لاکھوں روپے کی صورت میں اسے ملی تھی۔

ہوس کی ماری مچھلیوں کو اپنے جال میں مزید گہرا پھنسانے کے لئے اس نے اچھی خاصی پاکستانی کرنسی بھی اپنے پاس رکھ لی تھی اور اب وہ مختاراں بیگم پر اپنا آخری اور بھرپور داؤ کھیلنے جارہا تھا۔

بھٹی سے اس کو جو لاکھوں روپے وصول ہوئے تھے ان میں سے ایک آدھ لاکھ ان پر خرچ کرنا اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات تھی لیکن مختاراں کی تو آنکھیں اس دولت کی چمک سے خیرہ ہو سکتی تھیں۔

○

باؤ ارسلان کو اچانک وہاں دیکھ کر ماں بیٹی کی باجھیں کھل گئیں۔
 مختاراں تو صدقہ داری ہونے لگی جب کہ نازنین اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی.....
 گھاگ نائیکہ اچانک ہی کسی کام کا بہانہ کر کے باہر نکلی اور اس کے جاتے ہی نازنین ارسلان کے گلے کا ہار بن گئی۔

اس نے ایک ہی لمحے میں اپنے سارے خاندانی داؤ بیچ آزماتے تھے۔ اب تو ماں بیٹی اس سونے کی کان کو کسی بھی صورت ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی تھیں۔ انہیں تو باؤ ارسلان کی اہمیت کا علم ہی اب ہوا تھا۔

مختاراں نے جب سمجھ لیا کہ اب بچی نے دل کی بھڑاس نکال لی ہوگی تو وہ کمرے میں چلی آئی۔

”بیٹا! ایک لمحے کے لئے بھی مولا کی قسم لے لو اگر بچی نے آنکھ جھپک کر دیکھا ہو.....
 یہ تو میرا مولا ہی جانتا ہے۔ میں اسے اس موئے ہوائی اڈے سے جہاں تم اتر گئے تھے، کیسے لندن تک لائی ہوں۔ بس ایک مرنے کی کسر باقی تھی.....“ اس نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق گاہک پر طبع آزمائی شروع کر دی۔

”بی بی! میں نے کہا تھا ناں کہ صبر کرو عیش کرادوں گا۔ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا..... خیر! ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے.....؟“ اس نے مختاراں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”باؤ ارسلان پر یہ اتنا بزنس اتنی دولت! تم نے پہلے تو کبھی بتایا ہی نہیں.....!“ مختاراں نے بڑی خاص نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”بی بی! تمہیں آہستہ آہستہ سب سمجھ آ جائے گی۔ اگر میں تمہیں وہاں سب کچھ بتا دیتا تو تم کبھی یقین ہی نہ کرتیں کیونکہ بد قسمتی سے میرے ساتھ ایک دھوکا ہو چکا تھا، لیکن ان ہی لوگوں کی مدد سے پھر میں نے اپنا بزنس چلا لیا ہے۔ بی بی! کسی کی جرأت نہیں کہ یہاں یا وہاں اپنے ملک میں ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے..... اور ہاں ابھی تو تمہارے لئے ایک بہت بڑی خوشخبری ہے میرے پاس..... لیکن زیادہ بے چینی نہ دکھانا۔ وقت آنے پر سب کچھ بتا دوں گا..... ابھی تم تیار ہو جاؤ۔ ذرا بازار سے شاپنگ کر لیں۔ گھبرانا نہیں۔ جو چیز دل کو اچھی لگے اٹھا لینا..... میں چاہتا

کمرے میں اس وقت وہ تینوں ہی موجود تھے جب اچانک ہی ارسلان اپنی جگہ سے اٹھ اور دوسرے کمرے میں جا کر بریف کیس لے آیا۔ بریف کیس اس نے مختاراں کے سامنے کھولا تو دم بخود رہ گئی۔ یہاں پاکستانی اور برطانوی نوٹ بڑے سلیقے سے ترتیب سے سجے تھے۔ ارسلان نے 50 ہزار گن کر مختاراں کی طرف بڑھادیئے اور بریف کیس بند کر لیا۔

”میری طرف سے یہ معمولی سا نذرانہ نازنین کے لئے ہے۔ بی بی! اس مرتبہ مجھے بہت زیادہ منافع ہوا ہے۔“

ہونقوں کی طرح منہ پھلائے مختاراں نے جانے کس میکاکی عمل کے تحت اپنا ہاتھ بڑھایا اور نوٹ ہاتھوں میں تھام کر ان کو محسوس کیا۔ پھر اس احساس کے بعد کہ خواب تو نہیں دکھ رہی، اس نے نوٹ نازنین کی طرف بڑھاتے ہوئے ہر ممکن طریق پر شکریہ ادا کرتے جانے کتنی دعائیں دیتے ہوئے اس کا سر اور منہ اپنے پوٹلے منہ سے چوم لیا۔

نازنین کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس پر ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح گر پڑے۔ اس نے نظروں ہی نظروں میں نجانے کتنی مرتبہ اس کا شکریہ ادا کیا۔

مختاراں بڑی جہانگیرانہ طوائف تھی۔

ایک زمانہ اس نے دیکھ رکھا تھا۔

وہ اتنی بھولی بھی نہیں کہ باؤ ارسلان کے کاروبار کو سمجھ نہ پاتی، لیکن اس کے منہ سے سننا ضرور چاہتی تھی۔

”بیٹا! اب ہم میں کوئی پردہ تو رہا نہیں۔ اگر اپنے کاروباری راز میں ہمیں بھی شامل کرلو

تو.....“

”بی بی!“ ارسلان نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اب تم اتنی سیدھی بھی نہیں کہ میری بات کا مطلب نہ سمجھ سکو۔ میں نے بھی زندگی میں بہت دھکے کھائے ہیں۔ ہر محفل میں بیٹھا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ سب لوگ یہی کر رہے ہیں۔ آخر میں ساری زندگی کسی کا ”ہتھ ٹوکا“ بن کر تو نہیں رہ سکتا۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ میں بھی دولت کماؤں گا۔ اب تک میں نے صرف دو چکر لگائے ہیں اور دیکھ لو۔ لاکھوں کروڑوں میں کھیل رہا ہوں۔ بی بی! میں تمہیں صاف بتا دوں کہ اس مرتبہ بھی میں مال لے کر آیا تھا جو میں نے جہاں میں اترا تھا وہیں دینا تھا۔ میں نہیں چاہتا

تھا کہ اس موقع پر تمہاری مرضی کے بغیر تمہیں شامل کروں۔ یہ لاکھوں کروڑوں کا کھیل ہے۔۔۔۔۔ بی بی تم جانتی ہو کہ پیسے میں کتنی طاقت ہے۔ دونوں طرف مل ملا کر کام چل جاتا ہے۔ کچھ حصہ یہ لوگ لے لیتے ہیں کچھ ادھر والے اور بس۔۔۔۔۔ باقی خطرہ یوں بھی زندگی میں ہر وقت رہتا ہے۔۔۔۔۔!“ اس نے اپنے آپ سے مختاراں کو تسلی کروادی۔

آخری دو چار فقرے اس نے جان بوجھ کر کہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ہوس کے مارے ذہنوں کو ایسی بودی دلیلیں بہت مطمئن کیا کرتی ہیں اور واقعی مختاراں کی رال ٹپکنے لگی تھی۔

”بی بی! تمہیں کیا علم نہیں کہ ہمارے شہر کی بڑی بڑی بیگمات کیا کرتی ہیں۔۔۔۔۔ میں تمہیں دس چندرہ نام ابھی گنوا دیتا ہوں۔ بس دو تین مہینے میں ایک چکر لگالیا اور ساری زندگی کی روٹیاں اکٹھی کر لیں۔۔۔۔۔ میں تو کہتا ہوں بی بی! ایک آدھ چکر تم بھی لگا لو۔۔۔۔۔ سارا بازار خرید لو گی۔“ ارسلان کی آخری بات نے مختاراں کے دماغ میں زوردار جھٹکا کیا۔

لاچ کی ماری طوائف کو اس نے پانچ منٹ بعد ہی شیشے میں اتار لیا۔ جب اس نے مختاراں کو بتایا کہ وہاں سے روگنی پر اسے ایک چکر لگانے کے لئے دو لاکھ روپے ایڈوانس مل جائیں گے تو مختاراں نے ہتھیا رڈال دیئے۔

”ارے بیٹا! جب ساری دنیا یہ کام کر رہی ہے تو ہمارا بھی بھلا ہو جانے دو۔۔۔۔۔ کوئی ہمارا کام بھی کر دو۔۔۔۔۔ ساری زندگی تمہارے پیر دھو دھو کر پیئیں گے۔۔۔۔۔!“ مختاراں کے منہ میں لاکھوں کے ذکر سے پانی بھر آیا۔

”بے فکر ہو بی بی! اگلی مرتبہ تم آؤ گی تو ایسے بریف کیس نوٹوں سے بھر کے لے جاؤ گی۔“

”دیکھ لو بی بی! میں تو ہر صورت تمہارا فائدہ چاہتا ہوں۔ پھر بھی سوچ سمجھ لو۔ اگر ماضی کی کوئی بات تمہارے ذہن میں ہے تو اسے نکال دو۔“

”ارے جانے دو بیٹا! کیا باتیں لے بیٹھے۔۔۔۔۔ بیٹا! میں کوئی لالچی عورت نہیں ہوں۔ بس ایک ذرا زندگی گزارنے کا آسرا ہو جائے تو کس کافر کا دل چاہے گا ایسے کام کرتا پھرے۔۔۔۔۔ بیٹا! پھر تم ہی تو کہہ رہے ہو کہ ساری دنیا یہی کچھ کر رہی ہے۔“ مختاراں نے اپنے مخصوص خاندانی انداز میں کہا۔

”تم تو یوں تصدیق کر رہی ہو بی بی جیسے تمہیں اس بات کا علم نہیں۔“ ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا۔

ایک ہفتہ تک لندن کی رونقوں میں غرق رہنے کے بعد جب ماں بیٹی ہوس کی دلدل میں گردن گردن تک دھنس گئیں تو ارسلان نے واپسی کا اعلان کر دیا۔ دونوں کا دل ابھی نہیں بھرا تھا۔

لیکن.....!

ارسلان بھی نہیں چاہتا تھا کہ دونوں کا دل بھر جائے۔

اس مرتبہ اس نے دونوں کو دودن پہلے روانہ کیا تھا اور خود ایک دوسری فلائٹ میں اپنے ملک پہنچا تھا۔ اس نے مختاراں سے کہہ دیا تھا کہ ادھر کسٹم پر کوئی ان کے بکس نہیں کھولے گا۔

اور ایسا ہی ہوا.....!

ہوائی جہاز کی سیڑھیوں پر ہی ان کا میزبان موجود تھا جو انہیں امیگریشن اور کسٹم سے گزرا کر سیدھا ٹیکسی سٹینڈ پر لے گیا۔

دونوں ماں بیٹی مسرت سے سرشار ارسلان کی کوشی کی طرف ایک ٹیکسی میں اڑی چلی جا رہی تھیں۔

دو روز بعد ارسلان بھی ان سے آن ملا۔

○

دونوں ماں بیٹی غیر ملکی سامان سے لدی پھندی اپنے ملک پہنچی تھیں۔ مختاراں نے دوسرے ہی روز بازار کا چکر لگایا اور ہر ممکن طریقے سے اپنے غیر ملکی دورے کی خبر اپنے حاسدوں کے کانوں تک پہنچائی تھی۔

”جل کر رہ گئیں گوڑیاں۔“ اس نے ارسلان کا سر ماتھا چومتے ہوئے بتایا.....!

”تم دیکھتی رہو بی بی! ابھی کیا کچھ ہونے والا ہے.....!“ ارسلان نے مسکراتے ہوئے

کہا۔ ”تمہارے مخالفوں کی زبانیں دانتوں میں نہ دبا دوں تو میرا نام بدل دینا۔“

اور.....!

مختاراں نے دل و جان سے اس کی بات مان لی۔

وہ نہیں جانتی تھیں کہ دودن لندن میں ان کے بعد ارسلان نے یونہی نہیں گزارے تھے..... اپنے سب سے پہلے میزبان مائیکل سے جواب سجاوہ خان کے گروہ سے علیحدہ ہو کر اپنا کام کر رہا تھا، مل چکا تھا۔

مائیکل سے اس کی ملاقات بھی کی قیام گاہ کے نزدیک ایک مارکیٹ میں ہو گئی تھی۔ جہاں اس نے خود ہی ارسلان کو پہچان کر اس کا نام لے کر آواز دی تھی۔

پہلے تو ارسلان کے اوسان خطا ہو گئے کہ یہ کیا مصیبت آگئی کیونکہ اس مرتبہ وہ کسی دوسرے نام کے پاسپورٹ سے سفر کر رہا تھا۔

لیکن اسے اس بات کا احساس مائیکل نے خود ہی دلادیا کہ وہ خود اس کی تلاش میں تھا۔ مائیکل سے یہ بات بھی اس کے علم میں آئی کہ اس نے سلیم خان والے گروہ سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور اب وہ ایک دوسرے ایشیائی مافیا سے منسلک ہے۔ اس نے ارسلان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ جی اگر چاہے تو امریکہ پارٹیوں کے ساتھ اس کا رابطہ قائم ہو سکتا ہے۔“

ارسلان نے فوراً ہامی بھری۔

یہ شخص اس کے مستقبل کے منصوبے میں ضرورت بیٹھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن اسے اس ملک کو خیر باد کہنا پڑے گا۔

اب اس نے باہر کا راستہ دیکھ لیا تھا۔

فرار کا راستہ.....!

اسے ایک دن بالآخر بھاگ جانا تھا..... یوں بھی اس نے جس بھیانک کھیل کا آغاز کیا تھا وہ کسی بھی لمحے اپنے انجام کو پہنچ سکتا تھا۔

کسی بھی پل حالات کا پیہہ الٹا چلنا شروع ہو جاتا اور اسے بڑی بے رحمی سے کچل دیتا۔ وہ جانتا تھا۔ اس نے ایک بے گناہ کو قتل بھی کیا ہے۔ کہیں نہ کہیں اس کے اندر والدین کی دی ہوئی مذہبی تعلیمات زندہ تھیں۔

گناہ کی دلدل میں بہت گہرا اترنے کے بعد بھی وہ مکافات عمل سے لرزاں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بالآخر ستم ظریفی حالات اسے انصاف کے کٹہرے میں لا کر کھڑا کر دے گی جہاں سوائے مظلومت کے اور کوئی دلیل اس کے حق میں نہیں جاتی تھی۔

لیکن.....!

یہ مظلومیت بھی تب تک تھی جب تک وہ معصوم تھا۔

اب تو وہ خود ظالم تھا۔ اپنے انتقام کی آگ میں اندھا ہو کر سب کچھ داؤ پر لگانے پر تیل

گیا تھا۔

مائیکل کا رابطہ اس نے محفوظ کر لیا تھا۔

اس نے امریکہ کے دو نمبر ارسلان کو دیتے ہوئے کہا تھا کہ جب کبھی اس پر زندگی کے

تمام دروازے ایک ایک کر کے بند ہو جائیں تو وہ یہاں ضرور دستک دے۔ شاید مائیکل نے ایک

عرصہ سلیم خان مافیا کے ساتھ کام کرنے کے بعد یہ احساس کر لیا تھا کہ ایک نہ ایک دن ارسلان بھی

اس کی طرح اس مافیا سے پناہ مانگے گا..... اور اس دنیا کے اصولوں کے مطابق تب ارسلان کو بھی

سوائے کوئی اور ”مضبوط سہارا“ ڈھونڈنے کے اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دے گا۔

مائیکل کے ساتھ خاصا وقت گزارنے کے بعد ہی وہ لوٹا تھا۔

ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں..... کانتا سے ملاقات کی خواہش بیدار ہوئی تھی

لیکن کسی مصلحت کے تحت اس نے گریز کیا۔ وہ اب دوبارہ اس گندے کھیل میں حصہ نہیں لینا چاہتا

تھا۔

اسے احساس ہو گیا تھا کہ ملکی محبت میں بھی اس بد قسمت ملک کے شہری خود مختار نہیں۔

یہاں ملک سے محبت کرنے کے لئے بھی ان بازی گروں سے سرٹیفیکیٹ لینا ضروری ہے جو

سیاست کی شطرنج پر بچھے مہروں کی طرح حرکت کرتے ہیں۔ اپنے دیسی اور بدیسی آقاؤں کے

اشارے پر۔

اور جو مادر وطن کو پرکاشی اہمیت دینے کو تیار نہیں۔

اس نے دیکھ لیا تھا کہ سیاست کے اس گھناؤنے بازار میں آج کا محب وطن کل کا

غدار۔

آج کے غدار کل کے محب وطن بن جاتے ہیں.....!

عجب طرفہ تماشا تھا کہ ہر کوئی دوسرے کو غدار اور خود کو قومی سلامتی کا واحد ذمہ دار بنانے

اور کہلانے پر بھند تھا۔

یہاں جھوٹ ہی سب سے بڑا سچ تھا اور یہاں سچ ہی سب سے بڑا جھوٹ بھی تھا۔

ارسلان تو اس مکروہ ریا کاری کے سمندر میں ایک تنگے جیسی اہمیت بھی نہیں رکھتا تھا۔

یہاں تو کبر و نخوت کے ایسے ایسے پہاڑ کھڑے تھے کہ جن سے سچائی، ایمانداری اور اصول پرستی

جانے کتنے طویل عرصے سے اپنا سرخ رہی تھی۔

مناقت کے کیا کیا رنگ و روپ نہیں تھے کہ جو ارسلان نے نہ دیکھ لئے ہوں۔

○

مزر ملک کے سامنے جب اس نے نوٹوں سے بھر ابریف کیس کھولا تو زندگی میں پہلی

مرتبہ تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر وہ دیوانہ وار اس کے گلے کا ہار بن گئی۔ ایسی گری پڑی

عورت تھی وہ.....!

ارسلان کو گھن آنے لگی تھی اس سے.....!

اس نے بھی مزر ملک سے بڑھ کر جوش و خروش کا اظہار کیا تھا اور اسے باور کروانے کی

کوشش کی تھی کہ دراصل اس نے ارسلان کو ”انڈر اسٹی میٹ“ کیا ہے۔

”میں نے زندگی میں شاید پہلی مرتبہ مرد کو سمجھنے کی غلطی تب کی تھی جب تمہارے متعلق

غلط اندازہ لگایا۔ تم تو بہت زبردست آدمی ہو..... بہت کام کے..... تم نے تو میرے سارے

اندازے غلط ثابت کر دیئے ارسلان۔“

اس نے بریف کیس بند کرتے ہوئے سگریٹ کا گہرا کش لگایا اور دھوئیں کے مرغولے

بناتے ہوئے دوبارہ ارسلان سے مخاطب ہوئی..... ”مجھے افسوس ہے کہ سجاد خان نے اپنے

اصول کے مطابق تمہاری تصاویر بھی بنائیں اور بد قسمتی سے نیکیو بھی حسب روایت اپنے قبضے میں

رکھے..... لیکن میرا وعدہ ہے کہ میں بہر صورت اس کی رائے تمہارے متعلق بدل ڈالوں گی.....

دراصل ارسلان سجاد خان حد سے زیادہ محتاط اور بظاہر لاپرواہ انسان ہے۔ اس کے اب تک بچے

رہنے کا راز بھی یہی ہے کہ اس نے اپنے کچھ اصول بنا رکھے ہیں جن پر وہ بڑی سختی سے عمل پیرا

ہے۔ بغیر کسی رعایت کے وہ ان اصولوں کا اطلاق خود پر بھی کرتا ہے..... گو کہ میں نے تمہیں بتایا تھا

کہ تمہاری تصاویر میں نے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے بنائی تھیں، لیکن دراصل یہ سب کچھ سجاد خان

کی پلاننگ کا حصہ تھا۔ وہ اپنے کسی بھی ورکر کو کبھی اپنی مٹھی سے نکلنے نہیں دیتا۔

ارسلان جانتا تھا کہ اس وقت مسز ملک کہاں سے بول رہی ہے۔ وہ اب اپنی دانست میں اپنی مظلومیت کا ڈرامہ رچانے جا رہی تھی۔
لیکن.....!

یہ سب بیکار تھا.....!

”مسز ملک تم نے واقعی ارسلان کو سمجھنے میں غلطی کی..... اور یہ جو تمہارا فوٹو گرانی کا شوق ہے یہ بھی میں ضرور پورا کر دوں گا۔“
اس نے دل ہی دل میں کہا۔

مسز ملک اپنے کمرے میں نوٹوں سے بھر ابریف کیس رکھ کر واپس آ گئی تھی اور ارسلان اسے ایک کہانی گھڑ کر سنارہا تھا کہ کس طرح اس نے طوائفوں کو بیوقوف بنا کر اپنا الوسیدہ حاکم کیا۔
”نجمہ صاحبہ! آپ کی شخصیت کا بہت رعب ہے ان پر..... اور میں چاہتا ہوں کہ کسی مناسب موقع پر آپ کی ان سے ایک ملاقات بھی ہو جائے۔ اس وقت انہیں یقین آ جائے گا کہ واقعی آپ کی پشت پناہی ہمیں حاصل ہے۔ ابھی تک میں نے انہیں یہی بتایا ہے کہ یہ کام تو میں اکیلے کر رہا ہوں، لیکن کبھی اگر کوئی مصیبت پڑی تو آپ میری مدد کریں گی۔ مسز ملک! میں نے انہیں اس بات کی بھٹک بھی نہیں پڑنے دی کہ آپ کا اس بزنس سے دور کا بھی واسطہ ہے..... اور ہاں! آج آپ کو یہ بتا دوں کہ ملک صاحب کی تصویر والے کیس میں بھی میں نے آپ کا نام نہیں آنے دیا۔ میں نے انہیں یہی بتایا تھا کہ مخالف پارٹی کے لوگ تصویریں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مسز ملک ہم جس کا نمک کھائیں اس سے نمک حرامی کبھی نہیں کرتے۔“ اس نے چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

مسز ملک یوں ہونٹوں کی طرح اس کا منہ دیکھ رہی تھیں جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ شاید اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ کیا واقعی وہ سچ بول رہا ہے..... اس کی اندرونی کشش کا اندازہ اس کے سانولے چہرے کی بدلتی کیفیات سے ارسلان بخوبی کر سکتا تھا..... دل ہی دل میں وہ مسز ملک کے اندر چلنے والی جنگ سے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔

پھر جیسے مسز ملک کو اس کے لفظوں کی سچائی پر یقین سا آ گیا۔ اس نے ”اوہ ارسلان یو آر گریت!“ کہتے ہوئے خود کو ارسلان پر ڈھیر کر دیا اور خاصی دیر تک اسے خراج تحسین پیش کرتی

رہی۔

○

بھنڈر زخم خوردہ سانپ کی طرح تلملارہا تھا.....!
ملک صاحب نے پارٹی میں اس کی پوزیشن زبرد کر کے رکھ دی تھی۔ جب وہ پارٹی میں موجود تھے تب بھی بھنڈر کی ایک نہیں چلتی تھی اور وہ بے بسی سے سوائے ملک صاحب کے اپنے دوستوں کی محفل میں لعن طعن کرنے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب جب کہ قسمت نے اسے موقع دے ہی دیا تھا اور ملک صاحب نے اچانک فلور کر اسنگ کر لی تھی تو بھی وہ ان کے خلاف کچھ نہیں کر پایا تھا۔

سٹوڈنٹ سیاست کے ذریعے وہ جو کھیل کھیلنے جا رہا تھا وہ بھی اب اس کی سبکی کا باعث بن گیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ سیاست میں اپنی اہمیت منوانا ہی فن ہے۔

جب تک وہ اپنی اہمیت تسلیم نہیں کر داتا، کوئی اسے تسلیم نہ کرتا۔

اس نے سٹوڈنٹ ونگ پر قبضہ جما کر بظاہر ”سٹوڈنٹس پاور“ کو اپنا ہتھیار بنانے کی پلاننگ کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ملک کو کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے ہوئے وہ بھی ان طلباء کے ذریعے ہی اپنا گند اکیل رچائے ہوئے تھا اور اس کی اہمیت بھی ان ہی کی وجہ سے تھی۔
لیکن.....!

یہاں تو الٹا آنتیں گلے کو آ رہی تھیں۔ ایک ہی جھٹکے نے اس کے کس بل نکال دیئے تھے۔ انقلابی طلباء فیڈریشن کے ذریعے اس نے ملک کے حامی گروپ پر جو حملہ کیا تھا اس کا جواب ایسا بھرپور تھا کہ بھنڈر چاروں شانے چت ہو گیا۔
ایکشن کا اعلان ہونے والا تھا.....!

پارٹی مٹوں کی تقسیم کے لئے وزیر اعلیٰ اپنے ساتھیوں سے الگ الگ مشاورت کر رہا تھا۔ بھنڈر کو اور کسی میدان میں تو برتری حاصل نہیں تھی، لیکن پارٹی کے سنٹرل سیکرٹریٹ پر اس نے اپنی گرفت ضرور مضبوط کر رکھی تھی۔

اراکین پارٹی کے ذریعے ہی نہیں..... بلکہ پارٹی کلرکوں کے ذریعے اعلیٰ عہدیداروں

کے سیکرٹریوں کے ذریعے وہ پارٹی کے اندر ہونے والے فیصلوں سے باخبر رہتا تھا۔

اور.....!

ان ہی لوگوں کے ذریعے یہ بات اس کے کانوں تک پہنچی تھی کہ پارٹی کی خفیہ میٹنگز جن میں اسے مدعو نہیں کیا جا رہا تھا، ان میٹنگوں میں نکلنے سے متعلق جو فیصلے کئے جا رہے تھے ان میں بھنڈر کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جا رہی تھی۔ جس طرح وہ خود کو ”ملک صاحب ثانی“ ثابت کرنے جا رہا تھا..... اس کی یہ حیثیت کوئی نہیں مانتا تھا۔

پھر وہ اپنی حیثیت کیسے منوائے.....؟

یہ اس کی غیرت اور مردانگی کے شایان شان نہیں تھا۔ وہ تو مستقبل میں پارٹی قیادت پر اپنے گروپ کے ذریعے قبضہ جمانے کی فکر میں تھا اور اگر اس کی مرضی کے دس آدمیوں کو نکٹ نہیں مل سکتا تو اس کا بے گیا کیا؟

بھنڈر کی مردانگی نے جوش مارنا شروع کر دیا تھا اور اس نے صوبائی قیادت کو اپنے وجود کا احساس دلانا ناگزیر سمجھنا شروع کر دیا تھا اور یہ احساس اس طرح دلایا جاسکتا تھا کہ وہ پارٹی کی اعلیٰ قیادت کے لئے مسائل کھڑے کر دے۔

یہی سیاست تھی یہاں کی.....!

یہی چلن تھا مروجہ سیاست کا کہ اپنی اہمیت منوانے کے لئے تمام اخلاقی، اصولی اور قانونی ضابطوں کو جنم رسید کر کے بد معاشی اور غنڈہ گردی کے ذریعے اپنا آپ منوایا جائے۔

کچھ ایسا کر کے دکھایا جائے کہ انتظامیہ کو تا کون چنے چبوا دیئے جائیں اور پھر حاتم کی قبر پر لات مار کر اپنے ہاتھوں لگائی آگ پر خود ہی پانی ڈال کر اسے بجھا بھی دیا جائے۔

مگر چمچ کے آنسو بہاتے ہوئے اس تباہی کا ماتم بھی کیا جائے تا آنکہ پارٹی حلقوں میں اس کے نام کی دھوم بجتنے لگے اور قیادت یہی سمجھنے پر مجبور ہو جائے کہ معزز ممبر پارٹی جب چاہے مسائل کو پلک جھپکنے ختم کر سکتا ہے۔

یہی کچھ تو ملک صاحب کرتے تھے..... پہلے کرائسز کھڑا کرتے، پھر آگے بڑھ کر اسے ختم بھی کر دیتے۔

بھنڈر جانتا تھا سوائے ہونے بچے کا منہ چومنے سے کوئی کسی کی اہمیت تسلیم نہیں کرتا۔

کوئی ہنگامہ، کوئی دھوم دھڑکا، کوئی چھوٹی موٹی سی بد معاشی ضروری تھی۔ اس کے بغیر بھنڈر کا رعب داب کیسے قائم ہوتا!

تو پھر.....!

کچھ ہونا چاہئے تھا..... کچھ بھی..... فوری طور پر..... ورنہ نکلنے کا فیصلہ ہو جاتا اور بھنڈر صاحب نا کارہ برتن کی طرح پارٹی کی آخری صفوں میں کہیں پھینک دیئے جاتے۔

”او کے!“ اس نے دل ہی دل میں کہا اور ایک شیطانی منصوبہ اس کے ذہن میں جڑ پکڑنے لگا۔

○

آج اس نے اس سلسلے میں ہنگامی میٹنگ طلب کی تھی۔

گجر گروپ کے پانچ مشنڈے سر جھکائے ان کے سامنے بیٹھے تھے اور بھنڈر کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

”میں نے ساری زندگی تمہیں فیڈر سے دودھ پلانے کا ٹھیکہ نہیں لیا۔ ذرا ہاتھ پیر ہلاؤ..... تمہاری وجہ سے ہمیں بہت ذلالت اٹھانا پڑی..... الیکشن سر پر آ رہا ہے۔ اگر کچھ نہیں کر سکتے تو میری جان چھوڑ دو اور اس بات کا خیال رکھنا کہ اگر میرا گروپ کمزور پڑ گیا تو ساری زندگی جیلوں میں پڑے سڑتے رہو گے۔ پولیس ایسے ایسے گڑے مردے اکھاڑے گی کہ پھر.....“

”سرجی آپ حکم کریں۔ انشاء اللہ شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“ ایک چرسی نے اونگھتے ہوئے کہا۔

”میں خاک حکم کروں۔ تم کیا منہ میں اگلوٹھالے کر بیٹھے ہو حکم کے بچے.....“

بھنڈر نے مغلفات بکتے ہوئے کہا۔

”بس بس بھنڈر صاحب! بہت ہو گئی..... اب ہم آپ کو کچھ کر کے ہی دکھائیں گے۔ میں نے آپ کی ہدایت پر ذرا ہاتھ نرم رکھا ہے ورنہ نوید گروپ کو تو ہم سانس نہ لینے دیں۔“

گجر کو جوش آ گیا۔

”باتیں ہی کرتے رہنا۔ کچھ کر کے بھی دکھاؤ۔“ بھنڈر صاحب کے ساتھ ایم پی اے

نے کہا۔

”دیکھئے جناب! اب ایسی بات نہ کریں۔ میرے لڑکوں نے آپ کے حکم پر کبھی پیٹھ نہیں دکھائی.....!“ گجر نے خود پر مشکل سے قابو پایا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ کل سے کام شروع کر دو اور ہاں اس مرتبہ براہ راست ملک کی خبر لو۔ کسی بات کی پروا نہ کرنا۔ بس اپنے آدمی درمیان میں نہ آئیں۔ اگر کوئی پکڑا جائے تو دے دلا کر کام چلانے کی کوشش کرنا۔ اگر بات نہ بنے تو تب مجھے بتانا..... ان دیگن والوں کی وجہ سے ہمیں بہت زک اٹھانا پڑی ہے اور تم لوگ ابھی تک کچھ نہیں کر سکتے..... یہ رکھ لو۔ ضرورت ہوئی تو اور لے جانا.....!“

بھنڈر نے بریف کیس سے نوٹوں کے دو بٹل نکال کر گجر کی طرف یوں پھینکے تھے جیسے کتے کے سامنے چھپھڑے ڈالے جاتے ہیں۔ گجر نے بھی انتہائی بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نوٹ اٹھائے اور گئے بغیر اپنی جیکٹ کی جیبوں میں اڑس لئے اور وہاں سے چل دیا۔ اس کے پیچھے اپنے استاد کے تعاقب میں چل دیئے تھے۔

○

نوید اور اس کے گینگ نے چند روز پہلے ہی شہر میں ایک موقع کا پلاٹ تازا تھا۔ یہ پلاٹ کسی بیوہ کی ملکیت تھا جس پر ایک کرائے دار قابض تھا۔ یہ قابض کسی سرکاری محکمے میں کلرک قسم کی کوئی چیز تھا اور اپنے محکماتی تعلقات کی آڑ میں بیوہ کے لئے باعث عذاب بنا ہوا تھا۔ جس مال واپ بیوہ کا وہ دار تھا۔ اس کے تین جوان بیٹے ملک سے باہر موج میلہ کر رہے تھے اور کلرک بادشاہ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اب وہ کبھی اپنی ماں کی خبر لینے نہیں آئیں گے۔ وہ خود ایک معمولی فلیٹ میں زندگی کے دن پورے کر رہی تھی اور اس کی ڈیڑھ کنال جگہ پر کلرک بادشاہ قابض تھا۔

جب بیوہ کو احساس ہوا کہ اس جگہ کی وہ اچھی خاصی قیمت وصول کر سکتی ہے تو اس نے محفوظ مستقبل کے لئے کچھ اثاثہ جمع کرنا ضروری جانا کیونکہ اسے پہاڑ ایسی زندگی ایسے ہی کاٹنی تھی۔ بیٹوں کے لئے اس نے بیوگی کے ایام کا نوٹوں کی سچ پر گزارے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے امریکہ بھاگ گئے اور اب لوٹنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ دو کا تو بے چاری کے پاس ایڈریس بھی نہیں رہا تھا۔

جب اس نے کلرک بادشاہ کو مکان خالی کرنے کا نوٹس دیا تو کلرک نے خالی کرنے

سے انکار کر دیا۔ وہ بھی کمشنر آفس میں کام کرتا تھا اور ہر محکمے سے اس کی سُر تھی۔ بیوہ نے ایک آدھ وکیل سے مشورہ کیا تو فیس سن کر ہی ڈر گئی۔ اب اس کے پاس سوائے صبر و شکر کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ جب اچانک نوید گروپ کے غنڈوں کی نظر میں وہ آگئی، کیونکہ یہ لوگ کتوں کی طرح ایسے ضرورت مندوں کی بوسو گتے پھرتے تھے۔ انہوں نے بیوہ سے اونے پونے داموں مارکیٹ سے قریباً نصف ریٹ پر مکان خرید لیا۔ اس بے چاری نے بھی ”ساری جاتی دیکھئے تو آدمی دیجئے چھوڑ“ کے مصداق جو کچھ ملا، صبر و شکر کر کے وصول کر لیا اور زمین ان لوگوں کے نام لکھ دی۔ اب انہیں زمین خود خالی کر دانا تھی۔

وہ جانتے تھے کہ کلرک بادشاہ نے بھی عدالت میں اپیل کر رکھی ہے اور ”سٹے آرڈر“ لیا ہوا ہے لیکن ان کے لئے یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے ایک عرصے سے وہ یہی کچھ کرتے آ رہے تھے۔

اگلے ہی روز وہ بندوقیس پستولیں لے کر کلرک کے ہاں جادھمکے اور اسے 24 گھنٹے کے اندر اندر مکان خالی کرنے کا نوٹس دیا بصورت دیگر حالات کی ذمہ داری اس پر عائد ہوگی کی دھمکی دے کر لوٹ آئے۔

کلرک بھی جرائم پیشہ آدمی تھا۔ ساری زندگی اس نے حلال کمائی کا منہ نہیں دیکھا تھا اور اتنی کچی گولیاں بھی نہیں کھیلی تھیں کہ ایک ہی دھمکی سے مارکھا جاتا۔ جس سیٹ پر وہ کام کر رہا تھا یہ تبادلوں کی سیٹ تھی جہاں اکثر اس کی چاندی بنی رہتی تھی۔ شاید ہی اس شہر کے کسی تھانے کا انچارج ایسا ہوگا جس نے ایک آدھ مرتبہ اپنے کسی حکمانہ کام کے لئے اس سے رجوع نہ کیا ہو۔

پہلے تو اس نے چاہا کہ پولیس کے ذریعے ان کی ٹھکانی کروائے لیکن جب پولیس والوں نے دیکھا کہ مقابلہ ”سٹوڈنٹس مافیا“ سے ہے تو انہوں نے معذرت کر لی۔

کلرک بادشاہ نے ہار نہیں مانی تھی.....!

دو تین مرتبہ نوید گروپ کے آدمی اس کے بیوی بچوں کو ڈرا دھمکا چکے تھے اور ایک ”پھینٹی“ بھی اسے لگا دی تھی، لیکن یہ شخص بھی نجانے کس مٹی کا بنا تھا کہ ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

اس روز اچانک ہی کلرک کو ایک خیال آیا کہ وہ سانپ کو سانپ سے کیوں نہ نکرادے

اور اس نے ایسا ہی کیا۔

اخبارات تو وہ مستقبل اور مفت پڑھتا رہتا تھا اور یہ بات اس کے علم میں تھی کہ انقلابی فیڈریشن کے دو گروپ بن چکے ہیں۔ اس نے کسی نہ کسی طرح بھاگ دوڑ کر کے گجر گروپ سے رابطہ کر لیا اور ابتدائی قسط بھی انہیں پہنچا دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اس کی مدد کریں تو مکان خالی کرنے کے جو تین لاکھ روپے وہ وصول کرنے جا رہا ہے اس میں سے کم از کم ایک لاکھ انہیں بھی ادا کرے گا۔

گجر گروپ نے اپنی جنگ کا آغاز اس کیس سے کیا۔ کلرک بادشاہ نے انہیں بتایا کہ آج شام کو نوید گروپ کی طرف سے اسے آخری وارننگ ملی ہے تو گجر نے اپنے تین چار لڑکے بندوقس دے کر کلرک کے پاس بٹھا دیئے۔

شام کو نوید گروپ کے لوگوں نے جب مکان پر پہلہ بولا تو جواب میں کلاشکوفوں کی فائرنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ نوید گروپ کے لوگ بھی یہاں شادی میں شرکت کرنے تو نہیں آئے تھے انہوں نے بھی بندوقس سیدھی کر لیں۔ دونوں طرف سے مقابلہ شروع ہو گیا۔ پولیس حسب روایت تماشہ دیکھتی رہی۔

سیانے پولیس آفیسر جانتے تھے کہ اس کوکلوں کی دلالی سے منہ کالا کرنے کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ انہوں نے بڑی ایمانداری سے غیر جانبداری کی پالیسی پر سختی سے عمل کیا اور دونوں گروپوں کو اپنے حال پر چھوڑ کر خود تر بتر ہو گئے۔

پندرہ بیس منت تک دونوں ایک دوسرے پر کم اور ہوا میں زیادہ گولیاں چلاتے رہے۔ بالآخر گو ہر مقصود اس طرح ہاتھ آیا کہ نوید گروپ کے حملہ آوروں کی فائرنگ سے ایک بے گناہ راہ گیر مارا گیا جبکہ دو بچے خوفزدہ ہو کر بھاگ رہے تھے وہ زخمی ہو گئے۔

○

جب میدان صاف ہوا اور دونوں گروپوں کے ”سورے“ اپنا اپنا کام کر کے چمپت ہو گئے۔ لوگوں نے دونوں زخمی بچوں اور قریب المرگ شخص کو ہسپتال میں پہنچا دیا تو پولیس کے جیلے دندنا تے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے بازار میں مورچے سنبھال لئے۔

حملہ آور چونکہ کلرک کے گھر پر فائرنگ کرنے آئے تھے اس لئے پولیس کے ذمہ دار

افسر نے اسی کے گھر کا رخ کیا۔

کلرک بادشاہ کو اس نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا۔ اس نے تو دوسرے اس افسر کا تبادلہ کینسل کر دیا تھا۔

”شاہ جی! آپ؟ یہ کیا چکر ہے بادشاہ؟ کیا مسئلہ ہے؟“

اس نے کلرک بادشاہ کی شکل پر نظر پڑتے ہی کہا جس کی خوف سے رنگت پیلی پڑ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی کلرک بادشاہ کے ہاں بہت سے ذمہ دار آفیسرز جمع ہو چکے تھے۔ ان ذمہ داروں میں صوبائی لیگ کے مقامی صدر بھنڈر صاحب کے خاص آدمی بھی موجود تھے۔

”شاہ جی! کسی بات سے گھبرانا نہیں۔ ٹھوک کر بیان دو۔ ان غنڈوں کی اصلیت بے نقاب کر دو جنہوں نے اس شہر کا امن و امان تباہ کر رکھا ہے۔ یہ لوگ ملکی سالمیت سے کھلونے کی طرح کھیل رہے ہیں۔ ایسے حرام خوروں کو سزا ملنی چاہئے۔ طلباء برادری کے نام پر یہ دھبہ ہیں۔ یہ طالب علم نہیں غنڈے ہیں غنڈے.....“

”اور کیا جناب! ہمارا تو جینا دشوار کر دیا ہے انہوں نے۔“ ایک اور سپاہی ورکر کو جوش آ گیا..... ”آئے روز فائرنگ آئے روز فائرنگ۔ جانے انتظامیہ کے کان پر جوں کیوں نہیں رنگتی۔“

”انہیں تو تب ہوش آئے گا جناب جب یہاں سو دو سولائشیں پھڑک رہی ہوں گی۔ ایک دو آدمیوں کے مرنے سے بات نہیں بنے گی۔ خدا جانے ان لوگوں کے ضمیر مر گئے ہیں۔ انہیں کیا مجبوری ہے کہ یہ قانون کا تقدس ہی بحال نہیں کر دیا جاسکتا.....؟“ ایک سماجی ورکر نے موقع کا فائدہ اٹھایا۔

”حضرات! میری بات کان کھول کر سن لیجئے۔ اگر ہم نے احکامات خداوندی سے اس طرح پہلو تہی جاری رکھی۔ اگر ہم نے مظلوموں کو اکیلا چھوڑ دیا۔ اگر ظالم اور وحشی درندے اس طرح دندنا تے رہے اور شرفاء کی پکڑیاں اچھالتے رہے تو خدا کی قسم ہم پر خدا کا عذاب نازل ہوگا کہ پھر شاید ہماری داستان تک داستانوں میں باقی نہ رہے۔“

مقامی مسجد کے مولوی صاحب کی جو آئے روز طلباء کی غنڈہ گردیوں سے تنگ آ چکے

تھے، غیرت ایمانی نے جوش مارا۔

”جناب والا! یہ سب کچھ ہماری کمزوری کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اگر ہم لوگ مل جائیں۔ ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر چلیں۔ ایک دوسرے کے دکھ تکلیف میں کام آئیں تو دنیا کی کوئی طاقت ان غنڈوں کو کھل کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔“ ایک دانشور قسم کے صاحب بولے۔

اس دوران مقامی لیڈر صاحب اپنے گھر کا ایک چکر لگا کر واپس آ چکے تھے۔ انہوں نے یہ چکر بے مقصد نہیں لگایا تھا۔ وہ ہجوم کے موڈ کی اطلاع بھنڈر صاحب کو دے آئے تھے اور ان سے تازہ ہدایات لے کر اب یہاں اپنی ”راج نیٹی“ کے گل کھلانے آئے تھے۔

”ایس پی صاحب! آپ نے خود کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ گزشتہ آٹھ دس روز سے یہ لوگ یہاں روزانہ اودھم مچا کر چلے جاتے ہیں اور آپ کی پولیس اپنے منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھی ہے۔۔۔۔۔ آپ صرف اس لئے ان غنڈوں پر ہاتھ نہیں ڈال رہے کہ انہوں نے طالب علموں کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور درگاہوں کی آڑ میں بد معاشی کے اڈے جمائے ہیں، لیکن ایس پی صاحب! بھولے بادشاہ یہ طالب علم نہیں ہیں۔ میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کسی کالج میں نہیں پڑھتے۔ انہوں نے علم کے طلب گاروں کو بدنام کر دیا ہے۔ یہ طلباء نہیں ہیں۔ ان کی آڑ میں بد معاشی کرنے والے غنڈے ہیں اور آج ہم دیکھیں گے کہ یہ فوج کر کیسے جاتے ہیں۔“ انہوں نے تازہ تازہ چارج سنبھالنے والے ایس پی کے وہ لتے لئے کہ بے چارہ دیکھتا ہی رہ گیا۔

نوجوان ایس پی جس نے حال ہی میں اعلیٰ سول سروس میں اعزاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی تھی اور حال ہی میں پولیس سروس جائن کی تھی اس اچانک صورت حال پر گڑبڑا کر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں موجود مجمع کو ٹھنڈا کرتا۔ بھنڈر کے ”جیالوں“ نے جواب یہاں پہنچ گئے تھے اپنا کام شروع کر دیا۔ یہ لوگ جلوس کی شکل میں اکٹھے ہوئے اور مقامی ہسپتال کی طرف چل دیئے۔ انہوں نے یہاں سے مقتول راہ گیر کی لاش حاصل کی اور مرکزی لیگ کے حامی مختلف اخبارات کے سامنے کھڑے ہو کر ”سیا پا“ شروع کر دیا۔ یہ لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے بلند کرتے ہوئے نوید اور اس کے ساتھی غنڈوں کو قاتل قرار دے کر ان کی گرفتاری کا مطالبہ کر رہے تھے۔

خدا جانے انہوں نے پانچ دس بولڈنگ کارڈز کیسے تیار کر لئے تھے جن پر ان کے مطالبات بھی درج تھے۔

بھنڈر کو ایک ایک لمحے کی خبر پہنچ رہی تھی اور وہ اپنی کامیابی پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ قدرت نے جیسے اچانک ہی اسے یہ ”بولس“ دے دیا تھا۔ شاید نوید گروپ کے لوگوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ گجر گروپ ان سے ٹکرا جائے گا ورنہ پلاننگ ذرا بہتر کرتے۔

○

ملک صاحب کے لئے بڑی پریشان کن صورت حال تھی۔۔۔۔۔! انٹیلی جنس کی رپورٹ جیسے ہی مرکز میں پہنچی۔ پارٹی کے وزیر صاحب نے ملک صاحب کو سوتے سے بیدار کر دیا۔

”ملک صاحب یہ کیا ہو گیا حضور! ہم تو مارے جائیں گے۔ چیئر مین صاحب کبھی اس غلطی کو معاف نہیں کریں گے۔ یہ آپ کے لونڈوں کو کیا سوچھی؟ ادھر الیکشن سر پر کھڑا ہے اور ہم کوئی بہتر موقع تلاش کر رہے ہیں کہ جیسے ہی عوام اپوزیشن کے خلاف بولناڑ ہوں، ہم الیکشن کا ڈول ڈالیں اور آپ کے لونڈے یہاں ہماری جڑوں میں پانی ڈالنے کا بندوبست کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ ہوش کریں ملک صاحب کہیں ہمیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔“

شاید وزیر صاحب کو پارٹی چیئر مین کی طرف سے اچھی خاصی ڈانٹ ڈپٹ ہوئی تھی اور اب وہ اپنا غصہ ملک صاحب کی طرف منتقل کر رہے تھے۔

”میں ابھی لوٹا ہوں جو بد رتی صاحب! مجھے کچھ خبر نہیں کہ واقعہ کیا ہوا ہے۔ ایک اخبار نویس دوست نے سب کچھ بتایا ہے۔ بے فکر رہیں۔ میں بندوبست کرتا ہوں۔ بلاتا ہوں لڑکوں کو۔ ابھی تو مجھے حالات کا صحیح علم ہی نہیں ہوا کہ ہوا کیا ہے؟“

ملک نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے لہجہ دھیمہ ہی رکھنا مناسب سمجھا۔ وہ ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا اور معاملات کی تہہ میں اتر جانے والا۔

”ٹھیک ہے ملک صاحب۔ جیسے بھی ممکن ہو اس معاملے کو پیسہ رکھنے۔ خدا کے لئے کچھ ہماری عزت کا خیال کریں۔ ان لڑکوں کی باگیں ذرا کس کر رہیں۔ الیکشن تک صبر کر لیں ملک

صاحب پھر پانچ سال تک جو جی چاہے کرتے رہیں، لیکن خیال رہے کہ ان حالات میں جیسر مین صاحب ہماری کوئی غلطی معاف نہیں کریں گے۔“

”خدا حافظ!“ ملک صاحب نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی فون پر ان کی انگلیاں چلنے لگیں۔ اخبارات میں اپنے دوستوں سے انہوں نے معاملات کی اصلیت اور اہمیت دریافت کی۔ سوائے دو اخبار نویسوں کے اور کسی نے بھی تعاون کرنے سے معذوری ظاہر کی تھی کیونکہ صورت حال بہت سنگین تھی۔

لوگ پہلے ہی طالب علموں کا لبادہ اوڑھ کر غنڈہ گردی کرنے والوں سے تنگ آ چکے تھے اور اب ان کی فائرنگ سے ایک بے گناہ مارا گیا اور دو معصوم بچے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔

ملک کا پارہ آسمان کو چھونے لگا جب اس کے ملازم نے نوید کی آمد سے اسے مطلع کیا۔

”گدھے..... الو کے پٹھے! یہ کیا کر دیا تم لوگوں نے؟ میں نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا کہ میرے علم میں لائے بغیر کوئی کام نہ کرنا..... اور اس پر تم یہاں بھی منہ اٹھا کر چلے آئے۔ گدھے! اگر پولیس نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو..... اوہ میرے خدایا! تمہاری عقل کیا گھاس چرے گئی ہے.....؟“ اس نے غصے میں نوید کو گالیاں بھی کجی شروع کر دیں۔

نوید کے لئے ملک صاحب کا یہ لہجہ اور سلوک چونکا دینے والا تھا۔

غصے سے اس کا خون کھول اٹھا۔

لیکن.....!

اس نے فی الوقت جذبات پر قابو پانے میں ہی مصلحت جانی اور خاموشی سے سر جھکائے ملک صاحب کو ہڈ بان بکتے سنتا رہا۔

”ملک صاحب! پہلے میری بات سن لیں پھر جو جی چاہے کہتے رہیں۔“ بالآخر اس کا پیانا صبر لبریز ہو گیا۔

”ہاں بکو! بکو! کیا بہانہ کرو گے.....؟“ ملک ابھی تک اباتل تھا۔

”دیکھئے ملک صاحب! پہلی بات تو یہ ہے میں یہاں اکیلا اور چھپ کر آیا ہوں۔ مجھے کسی نے یہاں آتے نہیں دیکھا۔ میں رکشہ میں بیٹھ کر آیا ہوں اور دوسری بات یہ کہ ہمیں چال میں

پھنسا یا گیا ہے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ حرام خور کلرک جھنڈر کے لڑکوں سے رابطہ قائم کر لے گا..... ملک صاحب! گجر کے لڑکوں نے فائرنگ کی ہے۔ ہم تو جان بچانے کے لئے گولیاں چلا کر بھاگ رہے تھے اور راہ گیروں اور بچوں کو بھی انہوں نے جان بوجھ کر گولیاں ماری ہیں..... ملک صاحب میں اس کلرک کا خون پی جاؤں گا۔“

وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔

”ہوں..... تو یہ بات ہے۔ اس بڈھے نے دانت نکالے ہیں..... دھوکے سے حملہ کیا ہے..... خیر! میں بھی اب اس سانپ کے دانت نکال کر ہی دم لوں گا۔ تم ایسا کر دقتی جلدی ممکن ہو اپنے لڑکوں کے ساتھ روپوش ہو جاؤ۔ کسی بھی طرح یہاں سے دارالحکومت کی طرف نکل جاؤ وہاں پناہ لے لینا اور میرا انتظار کرنا۔ خبردار کوئی گرفتاری نہ دے۔“

اس نے نوید کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”او کے سر!“ نوید نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

”اور ہاں یہ لیتے جاؤ۔“

اس نے نوٹوں کا ایک بنڈل اس کی طرف پھینک دیا۔

”ٹھہرو..... ادھر سے نہیں ادھر سے۔“ اس نے نوید کو مین گیٹ کی طرف جانے سے روکتے ہوئے کہا۔

نوید کو اس نے کوشی کے عقبی حصے سے فرار کروایا تھا اور اب بڑی بے چینی سے اگلے حالات کی پلاننگ کر رہا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے اچانک ارسلان کی ضرورت محسوس کی۔

”ارسلان اب یہاں نہیں رہتا۔ اس نے اپنا گھر بنا لیا ہے۔“ نجمہ بیگم نے اسے بتایا..... ”اور وہ طلباء سیاست سے بھی علیحدگی اختیار کر چکا ہے جس کا اس نے ایک بھری پریس کانفرنس میں اعلان بھی کیا تھا۔“

”نجمہ! حالات کو سمجھو۔ میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔“ ملک نے زچ آنے والے انداز میں کہا۔

”دیکھئے ملک صاحب! ہمارے درمیان ایک شریفانہ معاہدہ موجود ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بزنس میں دخل نہیں دیں گے..... اس معاہدے کی خلاف ورزی آپ کرنے جا رہے

ہیں۔ جو ہم دونوں کے لئے غلط بات ہے۔“ اس نے کمال لاپرواہی سے جواب دیا۔

”ادنبہ! تو یہ بات ہے۔“ ملک کا ہاتھ اپنی مونچھوں پر چلا گیا۔

اس نے اچانک ہی ایک اور اہم فیصلہ بھی کر لیا تھا۔

اس فاحشہ سے جان چھڑانے کا فیصلہ.....!

اب یہ عورت اس کے کسی کام کی نہیں رہی تھی۔ اس جیسی ایک اور ہوس کی ماری نجمہ اس

نے دیکھ لی تھی۔

”او کے! میں دیکھتا ہوں مجھے کیا کرنا چاہئے۔“ اس نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ

بڑھاتے ہوئے کہا۔

○

کلرک بادشاہ اس وقت بھنڈر کے سامنے موجود تھا جو اس کے محلے میں رہنے والے

لیڈر کے گھر پہنچ گیا تھا۔

”شاہ جی! ہم تو غلام ہیں آپ کے۔ کسی بات سے گھبرانا نہیں۔ کوئی مائی کالا آپ

سے یہ لاکھوں کی جائیداد نہیں جیت سکتا۔ شاہ جی! ہم جو ہیں بس ذرا بیان ٹھوک بجا کر لکھنا ہے۔

میں نے ڈی آئی جی سے بات کر لی ہے۔ پیش گارڈ آپ کی حفاظت کے لئے کھڑی کر دیں گے۔

پھر ہمارے اپنے لڑکے کیا کم ہیں..... اور ہاں یہ بھی رکھ لیجئے۔ ہم ذرا پکی دوستی کے قائل

ہیں.....!“ بھنڈر نے ہزار کے دس نوٹ اس کی طرف بڑھادیئے۔

دراصل انہیں عادت ہو گئی تھی کہ ان کا ہاتھ نوٹ دیکھتے ہی بے اختیار پلکتا تھا۔

”بس شاہ جی! اپنے بیان میں معمولی سا اضافہ کرنا ہے۔“ بھنڈر نے مسکراتے ہوئے

ایک چٹ اس کی طرف بڑھادی۔

”یہ کیا ہے جناب.....؟“ شاہ جی نے حیرانگی سے پوچھا۔

”نمبر ہے پیر جی۔ نیلے رنگ کی بکیر وگاڑی کا نمبر.....!“ اس مرتبہ بھنڈر کی بجائے

گجر نے جواب دیا جو بھنڈر کے ساتھ ہی آیا تھا۔

”میں سمجھا نہیں جناب.....!“ کلرک بادشاہ نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

”شاہ جی! آپ نے اپنے بیان میں معمولی اضافہ کرنا ہے..... صرف ایک فقرے کا

اضافہ۔ وہ یہ کہ آپ مکان کی چھت پر موجود تھے جب آپ نے نیلے رنگ کی بکیر وے جس کا نمبر

آپ کے پاس موجود ہے نوید کو اترتے دیکھا۔“ گجر نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”نوید کو تو آپ پہچانتے ہی ہیں ناں.....؟“

”اوہو بادشاہو! یہ بھی کوئی بات ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ ویسے بادشاہو! یہ نمبر ہے

کس کا.....؟“ اس نے دانت نکالتے ہوئے پوچھا۔

”چھوڑو پیر جی! کالے چور کا نمبر ہے۔ آپ کو اس سے کیا۔ آپ آم کھائیں.....

گٹھلیاں پولیس خود گنتی رہے گی۔ آپ کی کوئی کسی سے دشمنی تو ہے نہیں کہ آپ کسی کا نام لیں۔“

گجر بھی سمجھ گیا تھا کہ بندہ اپنی لائن پر ہے۔ ”اور پھر شاہ جی آپ کا تو یہ مسئلہ ہی نہیں۔ آپ نے تو

صرف نیلے رنگ کی بکیر وکو دیکھا ہے اور اس کا نمبر نوٹ کر لیا..... مطمئن رہیں آپ کے علاوہ بھی

تین چار لوگوں نے اس نیلی بکیر وکو دیکھا ہے جس میں سے نوید باہر نکلا اور اس نے فائرنگ کی

تھی..... بکیر و وہاں کھڑی رہی اور پانچ چھ منٹ تک نوید فائرنگ کرنے کے بعد اسی میں بیٹھ کر

فرار ہوا لیکن آپ نے یہ سب کچھ نہیں دیکھا۔ آپ تو فائرنگ کی آواز سن کر چھپ گئے تھے۔ آپ

نے صرف بکیر و اور نوید کو دیکھا ہے.....!“ بھنڈر کے ایک اور چچے نے جو شل ہی سے پیشہ درگواہ

لگتا تھا، کلرک بادشاہ سے کہا۔

”بے فکر رہو بادشاہو! ہم نے بھی دھوپ میں بال سفید نہیں کئے۔ ساری زندگی

سرکاری دفاتر میں جھک ماری ہے..... ایسا بیان لکھواؤں گا کہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

”اچھا ہم چلتے ہیں۔ ابھی انسپٹر صاحب آئیں گے۔ آپ انہیں بیان لکھوادیں۔“

بھنڈر نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

گجر سمیت اس کے سارے چچے جو اس کے ساتھ آئے تھے باہر نکل گئے۔ یہ لوگ

پریس والوں کے آنے تک یہاں رکتا نہیں چاہتے تھے۔

”شاباش! پہلی مرتبہ کامیابی کا منہ دیکھا ہے، لیکن اس میں بھی تمہاری محنت سے زیادہ

قسمت کا دخل ہے۔ نوید اور اس کے ساتھی اپنی جان چھپاتے پھر رہے ہوں گے۔ یہی موقع ہے کہ

سالوں کو پیس کر رکھ دو..... اور ہاں وہ کیا نام تھا اس ٹرانسپورٹر یونین والے کا..... اس کو تو ایسا مزہ

چکھانا کہ زندگی بھر دوبارہ اس پیشے میں منہ نہ مارے۔ سال! بڑا لیڈر بنتا ہے۔ صبح یہ کام شروع ہو

جانا چاہئے..... ایسی کی تہیسی کر کے رکھ دو سب کی..... سالوں کو تانی یا دلا دو۔ میدان خالی ہے بچہ! میدان مار لو..... یہ موقعے روز روز نہیں ملا کرتے۔ صبح ایسا انجی ٹیشن ہوتا چاہئے کہ ملک اور اس کے کرتادھرتا اپنا منہ چھپاتے پھریں۔ بس اب جاؤ..... اللہ بلی!“ بھنڈر نے اپنی جیب میں بیٹھتے ہوئے گجر کو الگ لے جا کر کہا اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر اسے چڑھ جا سولی رام بھلی کرے گا کا مژدہ سنا کر جہنم میں جھونک دیا۔

○

دوسرے روز انقلابی فیڈریشن کے ”گجر گروپ کا دن“ تھا..... ان لوگوں نے شام گئے تک شہر کی سڑکوں پر اودھم مچائے رکھا..... شہر کے تمام اخبارات کے دفاتر کے سامنے انہوں نے ہنگامہ آرائی کی تھی اور نوید اور اس کے ساتھیوں کی فوری گرفتاری کا مطالبہ کیا تھا۔ گجر گروپ نے دوپہر کو اپنے انجی ٹیشن کا آغاز ایک پریس کانفرنس سے کیا جو میں الزام لگایا گیا کہ غنڈوں کی سربراہی ملک صاحب کر رہے ہیں اور اخبارات نے اپنی خبروں میں کلرک بادشاہ کے حوالے سے جو بیان شائع کیا ہے اس میں کلرک بادشاہ اور دوسرے تین چار راہ گیروں نے جس نیلے رنگ کی بھیر وکی شانہ بی کی ہے وہ ملک صاحب کی بھیر و ہے۔ انہوں نے صوبائی قیادت سے اپیل کی تھی کہ اگر انہیں صوبے میں امن وامان درکار ہے تو قاتلوں کو ان کے پشت پناہوں سمیت گرفتار کیا جائے۔ بصورت دیگر وہ خود معاملات کو ہاتھ میں لینے پر مجبور ہوں گے۔“

ملک کو گرفتار کرو.....!

قاتل قاتل ملک قاتل.....!

غنڈی گردی ہائے ہائے.....!

افرشاہی نہیں چلے گی.....!

طلباء کا مجرم ملک ہے.....!

اور ایسے ہی بے شمار نعروں کے ساتھ طلباء میدان میں نکل آئے۔

شام تک دو تین جگہ ان کا پولیس سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔ انہوں نے صحیح معنوں میں پولیس کو ناکوں چنے چبوا کر رکھ دیئے تھے۔

جس ٹرانسپورٹ یونین نے کچھ عرصے پہلے نوید گروپ اور مرکز کی لیگ کی حمایت کی تھی

ان کے ایک سٹینڈ پر حملہ کر کے طلباء نے تین چار دیکھوں کو پلک جھپکتے میں جلا کر رکھ کر دیا تھا۔ وہ آندھی کی طرح آئے اور دیکھوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا کر طوفان کی طرح چلے گئے۔ انہوں نے اڑے میں موجود قریباً تمام ڈرائیوروں کا مار مار کر بھر کس نکال دیا تھا۔

شام گئے بھنڈر صاحب کو وزیر اعلیٰ نے خصوصی اجلاس میں مشاورت کے لئے طلب کیا تھا جہاں بھنڈر صاحب نے انہیں یقین دلایا تھا کہ وہ طلباء کو ضرور قابو کر لیں گے، لیکن اس کے ساتھ انہوں نے ایک شرط بھی عائد کر دی تھی۔

”دیکھئے آئی جی صاحب! میں سیدھی بات کرنے کا عادی ہوں۔ پولیس کی نا انصافی کے خلاف طلباء کو احتجاجاً میدان میں آنا پڑا اور اس کی وجہ آپ کے نالائق افسران ہیں۔ ملک صاحب کے لڑکے سارے شہر میں بد معاشی کرتے پھر رہے ہیں اور کوئی ان پر ہاتھ نہیں ڈالتا..... آٹھ دس روز سے وہ لوگ اس غریب کے گھر پر فائرنگ کرنے آ رہے تھے..... انہوں نے اس بے چارے بے گناہ اور مظلوم کلرک پر قاتلانہ حملہ کیا اور آپ نے کسی کو گرفتار نہیں کیا۔ اب آپ کو ثبوت مل چکا ہے کہ یہ سب کس کا کیا دھرا ہے؟ آپ جانتے ہیں جس بھیر و میں بیٹھ کر وہ غنڈے جنہیں طالب علم کہنا علم کی توہین کرنے کے مترادف ہے آئے تھے۔ اس کا مالک کون ہے؟ آئی جی صاحب! اس صوبے میں خدا کے فضل سے بڑی مضبوط حکومت ہے اور ہم سینٹر سے ڈرنے والے نہیں ہیں..... اگر کوئی اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ وہ ہمیں دبا لے گا تو وہ اہمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ میں آپ سے صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ آپ کو بہر صورت ملک صاحب کو گرفتار کرنا ہوگا۔ یہی صورت ہے صوبے میں امن وامان قائم کرنے کی.....!“ بھنڈر نے اپنی تقریر بڑے جذباتی انداز میں ختم کی تھی۔

”آپ کو اس بات میں اعتراض بھی نہیں ہونا چاہئے“ آخر ان کے خلاف گواہیاں موجود ہیں اور ہم کسی سے ناجائز سلوک نہیں کرنے جا رہے۔ آئی جی صاحب لاء اینڈ آرڈر کی صورت حال کو بہتر کیجئے۔ ہمیں کل عوام کی عدالت میں بھی جانا ہے وہاں کیا منہ لے کر جائیں گے۔ برائے مہربانی ان مصلحتوں کو ایک طرف رکھئے اور اپنا فرض ادا کیجئے۔“ بھنڈر کے دوسرے ساتھی نے آئی جی کو قلمہ دیا۔

آئی جی نے ایک مرتبہ وزیر اعلیٰ کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر الجھن کے آثار تھے

لیکن پھر وزیر اعلیٰ صاحب نے بھی اثبات میں گردن ہلا دی۔
”ٹھیک ہے جناب! ہم اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کریں گے لیکن آپ ذرا طلباء کو سنبھالئے۔“ آئی جی صاحب نے کہا۔

اور.....!

بھنڈرا اپنے پلان کے مطابق پارٹی کی اعلیٰ کمان کو اپنی اہمیت کا احساس دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے گماشتوں کے ذریعے معصوم طلباء کو درغلا کر سڑکوں پر نکال کر ان کو اور پولیس کو آپس میں ٹکرا کر لاء اینڈ آرڈر کی دھجیاں بکھیر دی تھیں اور اب خود ہی اس کھیل کو ختم بھی کرنے جا رہا تھا۔

اسے امید تھی کہ اب پارٹی قیادت نکلنوں کی تقسیم کا فیصلہ ذرا سوچ سمجھ کر ہی کرے گی۔

○

شام ڈھلے ملک صاحب کو مرکزی وزیر کا فون موصول ہوا تھا.....!
”ہماری اطلاع کے مطابق آپ کے وارنٹ گرفتاری جاری ہونے والے ہیں۔ آپ نزدیک ترین فلائٹ سے دارالحکومت پہنچ جائیے۔ باقی معاملات یہیں طے کر لیں گے۔“
”اچھا تو بات یہاں تک پہنچ گئی ہے..... بھنڈر کی یہ ہمت۔ ذات کی کوڑھ کر لی اور شہتیروں سے چھپے.....!“ ملک صاحب کا خون کھولنے لگا تھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ انہیں کسی نے بھاگ جانے کا مشورہ دیا تھا۔

”ملک صاحب پلیز! حالات کو سمجھئے۔ فی الوقت خاموش رہنے ہی میں مصلحت ہے۔ اپ پلیز آدھ گھنٹہ بعد روانہ ہونے والی فلائٹ میں نکلئے۔ ہم آپ کو ایئر پورٹ پر ریسو کرنے آ رہے ہیں..... اچھا خدا حافظ۔ فون پر زیادہ بات مناسب نہیں۔“
”خدا حافظ.....!“ ملک نے فون بند کر کے گھڑی پر نظر ڈالی۔

اسے علم تھا کہ آدھ گھنٹہ بعد ایک فلائٹ دارالحکومت روانہ ہوگی۔ ایئر لائن میں اپنے ایک ”خاص آدمی“ کے ذریعے اس نے فرسٹ کلاس کی ایک سیٹ حاصل کر لی تھی۔

وہ بڑی افراتفری میں ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوا تھا۔ اپنے ڈرائیور کو اس نے کار پارکنگ سے ہی رخصت کر دیا تھا اور اب خود لاؤنج کی طرف جا رہا تھا۔ فلائٹ کی روانگی کا اعلان

ہو رہا تھا۔

ملک صاحب نے اپنا بریف کیس ایکسپریس مشین پر رکھا اور کلیئر ہونے پر بریف کیس اٹھا کر نزدیکی کاؤنٹر پر سیٹ نمبر لینے کے لئے آگے بڑھے۔ تین چار سفید پوشوں نے جو شاید ان ہی کے منتظر تھے، انہیں گھیرے میں لے لیا۔

”ہمارے پاس آپ کی گرفتاری کے وارنٹ ہیں جناب۔“ ان میں سے ایک نے جو شاید ان کا آفیسر تھا، ملک صاحب کو مخاطب کیا۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا.....؟“ ملک نے غصے سے انہیں ڈانٹ دیا تھا۔
”سر! ہمیں غلط رویہ اپنانے پر مجبور نہ کیجئے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ جیسی محترم شخصیت کو پھنکڑی لگا کر تھانے لے جاؤں.....!“ آفیسر خاصا دلیر اور سلجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔
”او کے.....!“ ملک صاحب نے ہتھیار ڈال دیئے۔

جہاز رن وے سے اٹھ کر دارالحکومت کی طرف پرواز کر رہا تھا جب کہ ملک صاحب کو پولیس کی ایک جیب کو توالی کی طرف لے جا رہی تھی۔ اس جیب میں نصب وائرلیس کے ذریعے یہ اطلاع دو تین جگہ پہنچا دی گئی تھی کہ مشن کامیاب رہا.....!

☆☆☆

فاتح

جس روز کلرک بادشاہ کو تباد لے کے احکامات ملے اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔ وہ مرکزی سرکار کا ملازم تھا جس نے ایک ترقی دے کر کلرک بادشاہ کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اسے فوراً رپورٹ کرنے کو کہا گیا تھا۔ خلاف توقع نوکری میں ایک ترقی نے اسے ضرورت سے زیادہ ہی خوش کر دیا تھا۔ اس کے پرانے ساتھیوں نے کہا تھا۔

”شاہ جی! مرکز میں نہ جاؤ۔ کوئی اور ہی چکر نہ چل جائے۔“

لیکن.....!

شاہ جی اپنی افسری کی دھن میں کسی کو خاطر میں نہیں لارہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مرکز سے دوبارہ تبادلہ کروا کے اسی شہر میں واپس آنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بس ذرا رپورٹ ہی کرنی تھی اور اسی چکر میں مہینہ دو مہینے وہاں گزارنے تھے جس کے بعد وہ ہوتے اور افسری کے مزے۔

کلرک بادشاہ تیسرے ہی روز چارج لینے دار الحکومت اپنے مرکزی دفتر میں پہنچ گیا۔ پہلے روز تو اس نے معمول کے مطابق چارج ہی لیا تھا، لیکن دوسرے روز جب وہ اپنے

اس رشتے دار کے گھر جہاں وہ قیام پذیر تھا، اپنے ہوٹل کی طرف جا رہا تھا تو اچانک ہی ایک جیب کے ٹائزر سے چرچائے اور جیب اس کے نزدیک آ کر رک گئی۔ اس سے پہلے کہ اسے کچھ سمجھ آتی، دو مضبوط ہاتھوں نے اٹھا کر اسے جیب میں پھینک دیا۔

”کیا کیا بات ہے؟ کون ہو تم لوگ؟“ کلرک بادشاہ کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ نجانے اس کے حلق سے کیسے یہ گھٹی گھٹی سی آواز برآمد ہوئی تھی۔ وہ چلانا چاہتا تھا لیکن خوف سے اس کی گھٹکی بندھی ہوئی تھی۔

اپنے سوال کا جواب اسے زوردار تھپڑ کی شکل میں وصول ہوا تھا، اس کے ساتھ ہی اسے سختی سے خاموش رہنے کی تنبیہ کی گئی۔

کلرک بادشاہ کو اب بھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے دس منٹ کے اس راستے میں ہزار مرتبہ گزرتے ہوئے ان لوگوں سے نجانے کون کون سے واسطے دے کر قصور اور ان کا جغرافیہ جاننے کی خواہش کی تھی، لیکن یہ لوگ نجانے کس مٹی کے بنے تھے۔ وہ اس بات کی بات سننے کے بجائے اس کا تسخیراڑ رہے تھے اور کبھی کبھی ایک آدھ چپت بھی اسے جمادیتے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی کھلونا ان کے ہاتھ لگ گیا ہو۔

ایک شاندار عمارت میں وہ جیب سمیت داخل ہوئے اور انہوں نے کلرک بادشاہ کو ”ڈنڈا ڈولی“ کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اٹھا کر ایک کمرے میں پھینک دیا تھا جس کو باہر سے لاک کر دیا گیا۔ کمرے میں صرف ایک قالین نمادری بچھی ہوئی تھی اور ایک کونے میں اس جیسا کوئی اور مصیبت زدہ بیٹھا اپنے زخم سینک رہا تھا۔

کلرک بادشاہ کے گرنے کی آواز جب دھپ پے بلند ہوئی تو اس نے گردن اٹھا کر ”نئے شکار“ کی طرف دیکھا اور دوبارہ اپنی پوزیشن میں واپس آ گیا۔

اس کے جسم پر پکڑوں کے نام پر چیتھڑے جھول رہے تھے اور چہرے پر ایسے نشانات پڑے تھے جیسے گزشتہ سال سے اسے سوائے مار کھانے کے اور کوئی کام نہ رہا ہو۔ داڑھی کے بے ترتیب بال یہ بتانے کے لئے کافی تھے کہ یہ اپنی مرضی سے نہیں رکھی گئی بلکہ گردش حالات نے چہرے پر جمادی ہے۔

”بھائی صاحب! بھائی صاحب!“ شاہ جی نے سہمے سہمے لہجے میں اسے مخاطب کیا

لیکن وہ تو بس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ بمشکل ان کی ”بھائی صاحب‘ بھائی صاحب“ کی گردان پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ناجتنی وحشت نے کلرک بادشاہ کو لرزہ کر رکھ دیا۔ ”یہ کون سی جگہ ہے؟ کون لوگ ہیں؟“ کپکپاتے ہونٹوں سے دریافت کیا۔

جواب میں تلخ سی مسکراہٹ اس شخص کے چہرے پر نمودار ہوئی اور اس نے اپنی گردن دوبارہ جھکالی۔

”جان لوگے..... جان لوگے..... لیکن فائدہ کیا؟ یہاں سے بچ کر تو جاؤ گے نہیں۔ کسی کو بتا تو سکو گے نہیں۔ پھر فائدہ کیا.....؟ پھر فائدہ کیا.....؟“ وہ پاگلوں کی طرح تھپتھپانے لگا۔

شاہ جی پر دوبارہ لرزہ طاری ہو گیا۔

انہوں نے سر کے باپ دھوپ میں تو سفید نہیں کئے تھے۔ کلرک بادشاہ کو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ یہ لوگ انٹیلی جنس کے تھے اور اب وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے صوبائی لیگ کے کہنے پر جھوٹا بیان دیا تھا۔ اس کے بعد سے تو یہ ممکن نہیں تھا کہ مرکزی پارٹی کے لوگ اسے یونہی چھوڑ دیتے۔ اس نے الیکشن کے نزدیک ان لوگوں کی ساکھ کو معمولی نقصان تو نہیں پہنچایا تھا۔

”اف میرے خدا! میں تو مارا جاؤں گا۔“ اس نے سوچا اور دل ہی دل میں کہا۔

”شاہ جی کچھ کرو۔ کچھ سوچو ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔“ اس نے خود کو حوصلہ دیا اور پھر ”یامکاری تیرا ہی آسرا“ کا نعرہ لگا کر آنے والے حالات کا منتظر ہو کر بیٹھ گیا۔

آدھ گھنٹہ تک وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ وہاں موجود شخص کا شاید ذہنی توازن خراب تھا کیونکہ اول تو وہ کسی بات کا جواب نہیں دیتا تھا۔ اگر کچھ کہتا بھی تو ایسے فلسفیانہ انداز میں جو کلرک بادشاہ کی فہم و فراست سے بالاتر ہوتا۔ آدھ گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور جن دو شکلوں پر کلرک بادشاہ کی نظر پڑی اس نے تو بے چارے کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ یہ آدمی کم اور بھوت زیادہ نظر آتے تھے۔ لمبے ترنگے، بڑی بڑی مونچھوں اور خونخوار آنکھوں والے۔

ان میں سے ایک نے ہاتھ بڑھا کر کلرک بادشاہ کو گردن سے ایسے پکڑا تھا جیسے وہ کوئی ذبح ہونے والی مرغی کو پکڑ رہا ہو۔

”ادھر آؤ شاہ جی! سنا ہے بڑی گواہیاں دیتے ہو۔“ اس نے شاہ صاحب کو جھکامارا تو کلرک بادشاہ دوسرے پر جا گرا جس نے اُلٹے ہاتھ کا جھانپڑا سے رسید کیا اور وہ چکرا کر رہ گیا۔

اسے یقیناً دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔

دونوں نے اپنے افسر اعلیٰ تک پہنچتے پہنچتے شاہ صاحب کی ایسی دھنائی کر دی تھی کہ اسے اپنی ہیئت بدلتی محسوس ہو رہی تھی۔

جیسے ہی اسے دونوں نے اپنے افسر اعلیٰ کے سامنے پیش کیا۔ کلرک بادشاہ نے ”بچالو۔ مجھے خدا کے لئے بچالو۔ میری توبہ..... آپ جیسے حکم دیں گے میں کرنے کے لئے تیار ہوں۔“ چلاتے ہوئے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔

افسر اعلیٰ نے آنکھ کے اشارے سے دونوں کو باہر جانے کے لئے کہا اور کلرک بادشاہ کو پاؤں کی ٹھوک مارتے ہوئے کھڑے ہونے کا حکم دیا۔

”آیا دماغ ٹھکانے؟ اب پتہ لگا کہ جھوٹی گواہیاں دینے کا انجام کیا ہوتا ہے؟“ افسر اعلیٰ نے پھسکارتے ہوئے کہا۔

”سمجھ گیا جناب۔ بالکل سمجھ گیا۔ جیسے آپ فرمائیں گے میں ویسے ہی کروں گا۔“ اس نے گھسکیاتے ہوئے ہاتھ باندھ دیئے۔

”اوئے میں نے تو سنا تھا تم بہت عقل مند اور بڑے جی دار ہو لیکن تم تو پرلے درجے کے گدھے اور بزدل نکلتے۔ الو کے پٹھے اگر اتنا حوصلہ نہیں تھا تو پھر پنگا لینے کی کیا ضرورت تھی۔“ اعلیٰ افسر نے اسے بے شمار گالیوں سے نوازتے ہوئے کہا۔

”غلطی ہو گئی مائی باپ۔“ کلرک بادشاہ پر ابھی تک کپکپی طاری تھی۔

”غلطی کے بچے۔ مجھے تمہاری حالت پر رحم آرہا ہے۔ بال بچے دار آدمی ہو اور سرکاری ملازم بھی ہو۔ ہمیں تو حکم ملا تھا کہ تمہیں گولی مار کر تمہارا ”مذا“ ہی ختم کر دیا جائے لیکن میں خدا خونی کرتے ہوئے تمہیں غلطی کے ازالے کا موقع دلاتا ہوں۔ حرام خور مرکزی محکمے کے ملازم ہو کر تو نے ایسی جرأت کیوں کر لی۔ تو نہیں جانتے حکومت کے ہاتھ کتنے لمبے ہوتے ہیں۔“

پندرہ بیس منٹ تک اس نے شاہ صاحب سے فٹیں کروائیں۔ پھر انہیں سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دی۔

تھوڑی دیر بعد شاہ صاحب کو چائے اور کیک پیسٹری پیش کی جا رہی تھی جو بدقت تمام ان کے حلق سے نیچے اترتی۔

اگلے روز پہلی فلائٹ سے ملک صاحب دارالحکومت روانہ ہو گئے۔
کلرک بادشاہ کا پلان انہوں نے یہیں بیٹھ کر تیار کیا تھا اور اس ڈرامے کا ڈراپ سین کرنے جا رہے تھے۔

○

بڑے پیمانے پر پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی اخبارات کے نمائندے بھی موجود تھے اور شاہ صاحب ایک بڑی کرسی پر میز کے سامنے براجمان تھے۔

ان کا بیان شروع ہوا اور تمام اخبار نویس گوش برآواز ہو گئے۔

”میرا نام فقیر حسین شاہ ہے اور میں مرکزی محکمے کا ملازم ہوں۔ مورخہ 3 ستمبر کو میرے آبائی شہر میں فائرنگ کا جو وقوعہ میرے گھر پر ہوا وہ خالصتاً غیر سیاسی تھا اور مکان کے لین دین کے تنازعے پر دو متحارب فریقوں میں جو دونوں سوئے اتفاق سے طلباء تنظیموں سے تعلق رکھتے تھے فائرنگ ہوئی جس کے بعد صوبائی لیگ کے معزز عہدے دار بھنڈر صاحب نے مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے مجبور کیا کہ میں پولیس رپورٹ میں ملک صاحب کا نام بھی شامل کرواؤں۔ اس ضمن میں مجھے لالچ بھی دیا گیا اور دھمکیاں بھی۔ میں ایک غریب اور دوسرے درجے کا ملازم پیشہ آدمی ہوں۔ اس لئے میرے پاس صوبائی لیگ کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔“

”تمہیں اپنا گزشتہ بیان بدلنے پر کس نے مجبور کیا؟“ صوبائی لیگ کے ایک نمک خوار اخبار نویس نے پہلا گولہ داغا۔

”ملک صاحب کی شرافت نے۔“ کلرک بادشاہ کا جواب گو کہ پہلے سے تیار شدہ سکرپٹ میں شامل نہیں تھا، لیکن وہ بھی حق نمک ادا کرنے پر تل گیا تھا۔ یوں بھی اس کی زبانہ ساز نظروں نے دیکھا لیا تھا کہ ابھی اس پارٹی کے لئے حکومت کرنے کے خاصے مواقع موجود ہیں۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اسی اخبار نویس نے تمللا کر پوچھا۔

”جب ملک صاحب ضمانت کروانے کے بعد مجھے ملنے آئے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میری ان سے کیا دشمنی ہے۔ ملک صاحب نے کہا۔ ”شاہ جی جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں اس سے پہلے آپ سے نہیں ملا۔ اگر ملا بھی تھا اور نادانستگی میں کوئی غلطی کر بیٹھا تو آپ مجھے

اس اثنا میں وہاں مرکزی لیگ کا ایک نمائندہ بھی آ گیا۔ شاہ صاحب کو اس کی شکل جانی پہچانی دکھائی دے رہی تھی، لیکن اس وقت اسے یہ جاننے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ شخص کون ہے۔ فی الوقت تو اسے موزیوں کے شکنجے سے خود کو آزاد کرانا تھا۔

جانی پہچانی شخصیت نے اسے ایک بیان ازبر کروایا جو اس نے ایک پریس کانفرنس میں جو آج سے تین چار روز بعد مرکزی دارالحکومت میں منعقد کی جارہی تھی دینا تھا۔ اس درمیان کلرک بادشاہ کے بیوی بچے اور گھرا کا سارا سامان یہیں ایک مکان میں منتقل ہونا تھا، جو اسے سرکاری ملازمین کے کوٹے میں الاٹ کیا گیا تھا۔

اس کی منتقلی کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

○

بھنڈر کا مقصد تو ملک صاحب کو ایک مرتبہ حوالات کی ہوا کھلا کر ان کی ہوا اکھاڑنا تھا جس میں اس نے بہر صورت کامیابی حاصل کر لی تھی۔ جب اسے یہ خبر ملی کہ اگلے ہی روز ملک صاحب کی اعلیٰ عدالت سے ضمانت پر رہائی ہو گئی ہے تو اس نے اس خبر کا کوئی اچھا اثر قبول نہیں کیا۔ اس نے اپنی دانست میں اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کر لی تھی۔

لیکن.....!

ابھی اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ملک اس کے ساتھ کیا کرنے جا رہا ہے۔ اس نے لاعلمی میں بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔

ملک صاحب جب ضمانت پر رہا ہو کر باہر آ رہے تھے تو مرکزی لیگ کے ہزاروں کارکن ان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ اخبار نویسوں کی فوج ظفر موج اس کے علاوہ تھی۔

ملک صاحب نے ان کے تمام سوالات کے جوابات بڑی خندہ پیشانی سے دیئے تھے اور اشارتا بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا کہ انہیں اس چکر میں کس نے پھانسا ہے۔ اخبار نویسوں نے ملک صاحب کی زبان سے بھنڈر کا نام اگلوانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی لیکن ملک صاحب نے..... ان کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی تھی اور یہی کہا تھا کہ وہ اوجھی حرکت کا جواب اپنی سطح سے اتر کر نہیں دے گا اور سیاست میں شرافت کا چلن نہیں بدلے گا۔ ملک صاحب نے اخبار نویسوں سے کہا تھا کہ وہ لوگ بہت جلد سچائی کو منظر عام پر آنا دیکھ لیں گے۔

معاف کر دیں۔“ مجھے تو یہ امید تھی کہ ضمانت کے بعد بھنڈر صاحب کی طرح مجھ پر اپنے پروردہ غنڈوں سے حملہ کروائیں گے کیونکہ وہ تو تھے بھی حق بجانب، لیکن میری توقعات کے بالکل برعکس جب انہوں نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا تو میری غیرت اور شرافت جوش میں آئی۔ مجھے تب اندازہ ہوا کہ میں نے بھنڈر صاحب کے کہنے پر کتنے با اصول اور عظیم انسان کی پگڑی اچھالی ہے۔“

”تمہاری اس پریس کانفرنس کا خرچہ کس نے برداشت کیا؟“ ایک اور نمک خوار آگے بڑھا۔

”کیا آپ لوگ پریس کانفرنس میں آنے کے پیسے لیتے ہیں؟“ شاہ جی کے جواب پر ساری محفل نے زوردار تہقیر لگایا اور اس اخبار نویس کا منہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

”میرا عرض کرنے سے مطلب یہ تھا کہ اس میں خرچ والی بات ہی کیا ہے۔ میں نے اس پریس کلب کے سیکرٹری صاحب سے گزارش کی تھی کہ میں اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا اور ایک اہم قومی راز سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ بطور اخبار نویس آپ اس قومی خدمت میں میرا ساتھ دیں کیونکہ الیکشن نزدیک آرہے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ میرے کسی عمل کی وجہ سے عوام کی غلط فہمی کا شکار بنیں۔“

شاہ صاحب کا ہر جواب نہلے پہلے دہلے تھا۔

”شاہ صاحب ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے صلے میں جناب کو ایک سرکاری کوارٹر بھی تو الاٹ ہوا ہے اس سلسلے میں آپ کیا فرمائیں گے؟“ ایک اور اخبار نویس دور کی کوڑی لایا۔

شاہ صاحب بھی مکمل تیاری کے ساتھ آئے تھے اور جو لوگ انہیں یہاں تک لائے تھے انہیں بخوبی اندازہ تھا کہ شاہ صاحب پر کس کس کا رز سے حملے ہوں گے۔ انہوں نے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنے سامنے رکھی ہوئی فائل کھولی اور اس میں سے ایک فوٹو سٹیٹ نکال کر اپنے قریب موجود پریس کانفرنس کے سیکرٹری کو تھادی۔ اس کے بعد وہ اخبار نویس سے مخاطب ہوئے۔

”اگر 25 سال کی سروس کرنے کے بعد مجھے استحقاق کی بنیاد پر ایک کوارٹر الاٹ ہو گیا ہے جس کے لئے میں نے آج سے بارہ سال پہلے درخواست دی تھی جب میں اس شہر میں مگر کی کیا

کرتا تھا تو یہ اصولاً کوئی غلط بات نہیں۔ اگر آپ نے اس میں بھی کیڑے نکالنے ہیں تو آپ کی مرضی۔“

شاہ صاحب کے اس جواب کے بعد اس مجمعے میں موجود صوبائی لیگ کے تنخواہ دار اخبار نویسوں کو یقین ہو گیا تھا کہ ان کا واسطہ بڑے کائیاں آدمی سے پڑا ہے جس کو سارے سبق زبانی یاد کروانے کے بعد ہی میدان میں اتارا گیا ہے۔

اگلے روز کے اخبارات کی چیختی چلاتی سرخیوں نے صوبائی لیگ کی سیاسی ساکھ کو زبردست دھچکا لگایا تھا اور بھنڈر کو تو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب وہ کس منہ سے پارٹی اجلاس میں شرکت کر سکے گا۔

ملک سے اتنے اچانک اور ایسے بھرپور جواب کی اسے توقع نہیں تھی۔ یہ بات وہ سمجھتا تھا کہ اگر کلرک بادشاہ کو اس نے سوتے میں تول کر بھی ایک اور پریس کانفرنس کے لئے راضی کر لیا تو کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا کیونکہ دوسری مرتبہ اپنا بیان بدلنے والے کو لوگ دروغ گو اور لالچی ہی کہہ سکتے تھے اسے سچا سمجھنے کو کوئی تیار نہ تھا۔

پھر.....!

یہ بھی تو ممکن تھا کہ ملک اگلی مرتبہ اس سے بھی تیز ہتھیار کے ساتھ حملہ آور ہوتا۔ کسی ایسے ہتھیار کے ساتھ جو اس کی سیاسی موت پر مہر تصدیق ثابت کر دیتا۔

○

چھت پر بیٹھے فوٹو گرافر کو اگر کوئی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش بھی کرتا تو نہ دیکھ پاتا۔ یوں بھی آج تہوار کی وجہ سے مکانات کی چھتوں پر خاصی رونق لگی ہوئی تھی اور نیچے لان میں موجود کسی شخص کے اس طرف دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

طاقت ور لینز اپنے کمرے میں لگا کر فوٹو گرافر نے لان میں دھری تین کرسیوں کو فوکس کر رکھا تھا۔ ارسلان نے اسے کہا تھا کہ پیسے اس نے اپنی مرضی کے لئے ہیں، کام ارسلان کی مرضی کے مطابق ہونا چاہئے۔ ”جناب فکر ہی نہ کریں۔ انشاء اللہ آپ خوش ہو جائیں گے۔“ فوٹو گرافر نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اپنی پیشہ ورانہ اہلیت کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔

”او کے..... میں چلتا ہوں۔“

آج اس نے نجمہ ملک کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی اور اسے بتایا تھا کہ وہ نازنین اور اس کی ماں مختاراں بائی کی ملاقات اس سے کروانا چاہتا ہے۔

نجمہ ملک خود کار چلا کر یہاں تک آئی تھی۔ ارسلان نے گھر کے دروازے پر جی جان سے اس کا استقبال کیا۔ جیسے ہی وہ گھر کے مین دروازے سے اندر داخل ہوئی، کیمرہ حرکت میں آ گیا۔ اندر لان میں نازنین اور مختاراں بائی موجود تھیں جنہوں نے ارسلان سے بڑھ کر جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا۔

تینوں وہاں لان ہی میں بیٹھ گئیں اور ارسلان نوکر کو ہدایات دینے چلا گیا۔ اس نے اپنی نگرانی میں ان کی بے تکلفی سے گفتگو کی تصاویر بنوائی تھیں اور جب وہ نوکر کے ہمراہ مشروبات لے کر واپس لان میں پہنچا تو احساس فتح سے اس کا چہرہ متمتار ہا تھا۔ اس نے آج بڑا معرکہ سر کر لیا تھا۔

کافی وقت ان لوگوں نے آپس میں گپ شپ لگاتے گزارا۔ اس درمیان ارسلان کے کہنے کے مطابق نجمہ بیگم نے دونوں ماں بیٹی کو احساس دلادیا تھا کہ وہ دونوں کو کبھی گرم سرد ہوا بھی نہیں لگنے دے گی۔ اس نے اشارے کنایے سے مختاراں اور اس کی بیٹی کو باور کرا دیا تھا کہ وہ بے دھڑک اپنا کام کرتی رہیں اور یہی ارسلان چاہتا تھا۔

فوٹو گرافر نے تین رول مکمل کر لئے تھے جب نجمہ بیگم وہاں سے رخصت ہوئی۔ اسے کوئی زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔ کیمرے میں نصب طاقتور لینز نے اس کا سارا کام بڑی آسانی سے کر دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ شخص جس نے اسے ہزار روپیہ دے کر اس سے صرف تین رول ایکسپوز کروائے ہیں اس کے کام سے ضرور خوش ہوگا۔ فوٹو گرافر کو قطعاً اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ تین عورتیں کون ہیں نہ ہی اس نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی۔ اسے تو یہ کوئی بڑا ہی بے وقوف نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کام جس کے لئے اس نے ایک ہزار روپیہ دیا تھا یہ تو کوئی بھی شخص مفت کر دیتا۔ یوں بھی اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ کوئی غلط تصاویر نہیں بنائی تھیں۔

لیکن.....!

اس بات کی سمجھا سے نہ آہکی کہ آخر یہ شخص چاہتا کیا ہے؟

مسز ملک کی روانگی کے بعد ارسلان نے فوٹو گرافر سے تینوں ایکسپوز فلم رول لے

لئے۔ اب وہ بجا طور پر خود کو فاتح کہہ سکتا تھا۔

”واہ ارسلان باؤ! تم نے تو کمال کر دیا۔ اتنے بڑے بڑے لوگوں سے تمہارے تعلقات ہیں اس کا تو مجھے اندازہ ہی نہ تھا۔“ مسز ملک کے واپس جاتے ہی مختاراں بیگم نے اس پر صدقہ داری ہونا شروع کر دیا تھا۔

”تم دیکھتی جاؤ بی بی! ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ اب تمہیں علم ہو گیا ناں کہ جو کام ہم کر رہے ہیں وہ اصل میں کس کا ہے۔ بس بے دھڑک ہو کر کام کرو۔ دو تین چکر بھی تم نے کامیاب لگا لئے تو سمجھو تمہارے وارے نیارے ہو گئے۔ بی بی! کروڑوں میں کھیلو گی، کروڑوں میں۔ جب تم اس شہر کی سڑکوں پر بحیرہ میں بیٹھ کر گھومنے نکلو گی تو سارے شہر کے شرفاء تمہیں جھک جھک کر سلام کیا کریں گے۔ بی بی! تمہارا ماضی کسی کو یاد نہیں آئے گا۔ تمہیں بھی نہیں۔ اپنے نام کے ساتھ کسی بھی اعلیٰ ذات کا اضافہ کر لینا۔“

ارسلان کی بات پر مختاراں نے زبردست قہقہہ بلند کیا تھا۔

○

ریاست شاہ کا تعلق اس خاندان سے تھا جو ملک کی آزادی کے بعد مسلسل رسم غلامی کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے پیشروؤں کی طرح ملک کی اعلیٰ ترین درسگاہ سے تعلیم حاصل کی تھی اور خاندانی روایات کے مطابق ہر وہ عیب اپنے اندر پیدا کر لیا تھا جو ایسے دؤیروں کے شایان شان ہوتا ہے۔

ڈاکو اور قاتلوں کو اپنے پاس پناہ دینا.....!

معمولی رنجش پر کسی بھی مخالف کی بہو بیٹی کو اغوا کروا دینا.....!

اپنے علاقے کی بیورو کریسی کو ہر ممکن طریقے سے اپنے کنٹرول میں رکھنا۔ یہ وہ عادات تھیں جو اسے ورثے میں ملی تھیں۔

لیکن.....!

ریاست شاہ نے خود کو انہی روایات کا پابند نہیں رکھا تھا۔ اس نے اپنی خاندانی روایات سے اوپر اٹھ کر ایک نئی جدت بھی اپنائی تھی اور کوشش کر کے اپنا تعلق ڈرگ مافیا سے بھی قائم کر لیا تھا۔

ریاست شاہ رہتا تو شہر میں تھا، لیکن اپنے گاؤں سے اس کی غیر موجودگی میں کوئی اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ کتوں کی دوڑ میں ہمیشہ اس کے کتے پہلی یا دوسری پوزیشن حاصل کرتے تھے۔ اس کے گھوڑے ”ڈربی“ میں ہمیشہ فیورٹ ہوتے تھے۔ درجنوں ملازم اس کے ان گھوڑوں اور کتوں کی نگرانی اور خدمت کیا کرتے تھے۔

اس شہر میں بہت کم خوش قسمت ایسے تھے جو اس کے کتوں اور گھوڑوں سے زیادہ بہتر زندگی گزارتے ہوں گے۔

نجمہ ملک اور ریاست شاہ کی ملاقات گھوڑوں کی ریس پر ہی ہوئی تھی۔ نجمہ ملک ”ڈربی“ میں شرکت کرنے آئی تھی۔ یہ ملاقات گوکہ اچانک تھی، لیکن دونوں نے پہلی ہی ملاقات میں اندازہ لگا لیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں۔

ملاقات نے پھر ملاقاتوں کو جنم دیا۔

ریاست شاہ کو اسمبلی ممبری بھی اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی۔ انگریز کے دور سے یہ لوگ اسمبلیوں میں بیٹھے چلے آ رہے تھے۔ عورت اور شراب ان کی زندگی کا لازمی جز تھیں۔ نجانے اس کی زندگی میں کتنی عورتیں آئیں اور چلی گئیں۔ ان میں ملک کے بڑے بڑے مقتدر گھرانوں کی وہ شریف زادیاں بھی تھیں جو خوب سے خوب تر کی تلاش میں اس سے ٹکرائیں اور جسم و جان سے اس کی خدمت کرنے کے بعد جب یہ محسوس کرنے لگتیں کہ معاملہ اس سے آگے نہ بڑھے تو چپ چاپ علیحدگی اختیار کر لیتیں اور فاحشائیں بھی تھیں جنہیں ایک رات میں ایک ایک مہینے جتنا حق الخدمت موصول ہوتا تھا۔

خاندانی شادی تو ریاست شاہ کے بزرگوں نے اس کی کالج کی تعلیم سے فوراً بعد ہی کر دی تھی، لیکن یہ بات وہ بھی جانتے تھے کہ ان کے خاندانوں میں ایسی شادی صرف اتمام حجت کے لئے ہی ہوتی ہے۔

اس کی نیک اور پاکباز بیوی آبائی گھر میں نوکروں کی فوج ظفر موج اور دو بچوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھی اور ریاست شاہ شہر میں پھوڑے اڑا رہا تھا۔ یہ چونکہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں تھی اس لئے بے چاری نے اسے اپنا نصیب جان کر قبول کر لیا تھا۔

ریاست شاہ کو جب سے سرکاری مشیر کا درجہ حاصل ہوا تھا اس کے بعد سے ایک

سیکرٹری نمایوی کی ضرورت وہ شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ جس بے تکلفی کا مظاہرہ نجمہ ملک نے کیا تھا اس کے بعد جب اسے علم ہوا کہ نجمہ ملک کا ایک سیاسی پس منظر بھی موجود ہے تو ریاست چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

یہ تو وہ بھی جانتا تھا کہ ملک ایسے بوڑھے سیاستدان کو نجمہ ملک نے سیزھی بنا رکھا ہے اور اگر اسے ریاست شاہ جیسا مضبوط سہارا مل جائے تو ملک کی بیساکھیاں اٹھا کر وہ پرے پھینک دے گی۔

دوسری طرف نجمہ ملک نے محسوس کر لیا تھا کہ اب ملک صاحب کی کشتی بھی ڈانواں ڈول ہے۔ وہ بلیک میلنگ کے سامنے جھک کر سرکاری لیگ میں شامل ہوئے تھے اور سرکاری لیگ والوں نے انہیں خوب خوب استعمال کیا تھا۔

چند مہینوں ہی میں ملک صاحب کا شمار صوبائی لیگ کے صف اول کے دشمنوں کی صف میں ہونے لگا تھا جس کے بعد کم از کم ان کا سیاسی مستقبل پہلے جیسا محفوظ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

آج اگر مرکزی لیگ کا زور تھا تو سیاست کے اتار چڑھاؤ کا اس ملک میں کسی کو کبھی اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ نجانے کل کس بات پر اس کا دھڑن تختہ ہو جائے۔

یوں بھی بلیک میل ہونے کے بعد سے ملک صاحب کی ”بارکیتنگ پاور“ کم پڑ گئی تھی۔ نجمہ ملک نے محتاط ترین رائے یہی قائم کی تھی کہ ملک صاحب کا معاملہ اب نفی نفی پر اٹک گیا ہے جب کہ اسے صد فی صد کامیابی چاہئے تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ اس پر ”چھا جانے“ کا جنون سوار تھا۔

اور اس جنون نے اسے ریاست شاہ کے نزدیک کر دیا تھا.....!

ادھر ملک صاحب نے نجمہ بیگم کے تیور بھانپ لئے تھے۔ وہ تو دانت دیکھ کر جانور کا اندازہ لگا لیا کرتے تھے یہ تو کل کی لونڈیا اور اس کے اپنے ہاتھوں کا لگایا ہوا پودا تھا۔ بھنڈر کی طلاق یافتہ بیوی نے بڑی تیزی سے سیاسی افق پر نمایاں ہونا شروع کیا تھا۔

یہ خاتون بھنڈر کی رشتہ دار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی، لیکن دوسری بیگمات کے برعکس اس نے بھنڈر صاحب کو من مرضی سے روکنا چاہا تھا۔ بھنڈر نے پہلے تو بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن پھر اس خوف سے کہ کہیں اخبارات کو کوئی اور سیکنڈل ہاتھ نہ لگ جائے اس نے ایک روز چپ چاپ ذکیہ

بیگم سے علیحدگی اختیار کر لی۔

جب غلامی کا یہ طوق مغربی درگاہوں کی تعلیم یافتہ ذکیہ بیگم کے گلے سے اترا تو اس نے کھل کر میدان میں آنے کا فیصلہ کر لیا۔

سیاست کا آغاز اس نے ایک پریس کانفرنس میں سرکاری پارٹی میں شمولیت کے اعلان سے کیا اور جلد ہی پارٹی کی خواتین ونگ کی آرگنائزنگ سیکرٹری کے عہدے تک پہنچ گئی۔ پھر وہ وقت بھی ایسا جب اسے خواتین کی مخصوص نشستوں پر سینٹ میں بٹھا دیا گیا۔

ذکیہ بیگم ”گن شناس“ عورت تھی۔

وہ انسان کی صلاحیتوں کی بناء پر ہی اس کی قیمت کا اندازہ لگایا کرتی تھی۔ ملک صاحب کو مرد و ج سیاست میں ایک خلیفہ کا درجہ حاصل تھا اور ایسے لوگ ذکیہ بیگم کی کمزوری ہوا کرتے تھے۔ جب سے ملک صاحب نے سرکاری لیگ میں شمولیت اختیار کی تھی اس کے بعد سے ذکیہ بیگم کی دلچسپی ان میں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ نوجوان اور انتہائی چالاک کسی چھوٹے گھرانے کی عورت کا یہ بوڑھا خاوند دیر تک اس چڑیا کو اپنے سنہری پنجرے میں بند نہیں رکھ سکے گا۔

ذکیہ بیگم کی جوانی نے بھی پر لگا کر اڑنا شروع کر دیا تھا۔ گو کہ مغرب سے دیر آمدہ سامان آرائش و زیبائش سے اس کے گھر کی الماریاں اٹی پڑی تھیں اور ابھی خاصے عرصے تک وہ اس لپٹا پوتی کے سہارے اپنی تیری سے گزرتی ہوئی جوانی کا بھرم قائم رکھ سکتی تھی۔

لیکن.....!

اب اسے شدت سے ایک خاوند کی ضرورت کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کسی بھی ”ڈمی خاوند“ کی موجودگی میں وہ بہت سی معاشرتی پابندیوں سے مستثنیٰ ہو سکتی ہے۔

دوسری طرف ملک صاحب کے لئے ذکیہ بیگم کا روشن سیاسی کیریئر تو باعث دلچسپی تھا ہی، لیکن جھنڈر کی سابقہ بیوی کو اپنا بنا کر وہ اپنے دشمن کے لئے ایک مستقل ذہنی خلبان کا باعث بھی بن سکتے تھے۔

یہی تھیں وہ مشترکہ دلچسپیاں جو دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھیں اور یہ سلسلہ اب خاصا لمبا ہوتا جا رہا تھا۔

○

”مجھے ریاست شاہ کے حوالے سے چھپنے والی خبروں پر سخت شرمندگی کا سامنا رہتا ہے۔ میں اب یہ ڈھونگ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا۔ نجمہ بیگم اپنی حیثیت کو مت بھولو۔ میں نے تمہیں زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھایا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ تم میری پگڑی اخبارات میں اچھالتی پھرو۔“

اس روز جب ایک اخبار نے نجمہ بیگم کے تازہ عشق کی کہانی کو موضوع بنایا تو ملک صاحب کا پیمانہ صبر بالآخر چھلک پڑا۔

”اوہو! بڑا غصہ کرنے لگے ہیں آج کل آپ.....؟ بلڈ پریشر کچھ بڑھ گیا ہے شاید؟ ملک صاحب میں نے کئی مرتبہ عرض کیا ہے کہ مجھے میری حیثیت یاد نہ دلایا کیجئے۔ یہ کام اگر میں نے شروع کر دیا تو آپ کو زیادہ تکلیف پہنچے گی۔“ اس نے سگریٹ کا طویل کش لگا کر ملک صاحب کی طرف دھواں اور طنز اچھال دیئے۔

”ہماری بلی اور ہمیں کو میاؤں۔“ ملک ہونٹ کا شمارہ کیا۔

”کچھ بھی کہہ لیجئے ملک صاحب لیکن یہ ضرور یاد رکھئے کہ میں آپ کی زر خرید غلام نہیں ہوں اور نہ ہی آپ اس حیثیت میں ہیں کہ اپنا حکم مجھ پر چلا سکیں۔“ نجمہ بیگم نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

”میں اس پاکھنڈ کو ختم کرنے جا رہا ہوں لیکن میں نہیں چاہتا کہ یہ اخبارات کا موضوع بنے۔ ممکن ہے تمہارے لئے اپنی عزت کوئی مسئلہ نہ ہو، میرے لئے بہر حال ہے۔“ ملک صاحب نے بالا خر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔ بس اس بات کا خیال رہے کہ میرے ساتھ نا انصافی نہیں ہونی چاہئے۔ بہر حال میں اب آپ کی داشتہ نہیں ہوں۔ بیوی ہوں۔ برابر کی حقدار اور شاید آپ نے نکاح نامے میں یہ سب کچھ تحریر بھی کیا ہے۔“ نجمہ بیگم نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑ دی۔

”اتر آئی ناں اپنی اوقات پر۔ بے فکر ہو۔ میں تمہارے ساتھ نا انصافی نہیں کروں گا۔ آخر تم نے میری راتوں کو رنگین کیا ہے..... اور میرے لئے یوں بھی پیسے کی کبھی کوئی اہمیت نہیں

رہی.....!“ ملک صاحب نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

”آئی رائیٹ! میں منتظر رہوں گی۔“

”میں تمہیں اس وقت طلاق دے دیتا لیکن زیادہ بہتر یہی ہے کہ یہ بات ابھی اخبارات میں نہ آئے۔ اس میں ہم دونوں کا فائدہ ہے۔ اگر تم اسے بھی میری کمزوری سمجھتی ہو تو بے شک اس معاملے کو اخبارات تک بھی لے جانا..... میرا وکیل آج ہی تمہارے ساتھ معاملات طے کر لے گا۔“ یہ کہہ کر ملک صاحب بغیر کچھ سنے باہر نکل گئے۔

مسکراہٹ نجمہ بیگم کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ وہ ایک درخت سے اپنی مرضی کا رس چونے کے بعد اب دوسرے درخت کا رخ کرنے جا رہی تھی۔ ریاست شاہ بہر حال اسے زیادہ تحفظ دے سکتا تھا کیونکہ صاحب کے برعکس اس کے ہاں ”خاندانی شرافت“ کا سلسلہ ایک عرصے سے چل رہا تھا اور ملک صاحب اپنے خاندان کے ”پہلے شریف“ تھے۔

”میں نے ملک سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ اس نے ارسلان کے بیٹھے ہی کہا۔

ارسلان کو مسز ملک نے فون کر کے خاص طور سے یہاں بلایا تھا۔ بہر حال وہ اس کا بزنس پارٹنر تھا جس کو اعتماد میں لینا اس کے لئے ضروری تھا۔ دونوں ایک فائینو سٹار ہوٹل میں بیٹھے تھے۔

”کیا خیال ہے تمہارا؟“ اس نے ارسلان سے پوچھا۔

”آپ کے ہر فیصلے سے مجھے خوشی ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کبھی غلط فیصلہ کر ہی نہیں سکتیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت زیادہ بصیرت سے نوازا ہے۔ یوں بھی آپ کا مشن آگے بڑھنا ہے پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں۔ اس لئے جو بات ہوگئی اس پر تہمیرہ کیسا؟ البتہ میرے دل میں ایک حسرت باقی رہے گی!“

”کیا.....؟“

”کاش میں ملک صاحب سے اپنی محرومیوں اور مظالم کا بدلہ لے سکتا۔“

ارسلان نے کچھ سوچتے ہوئے ہوا میں تیر چلایا۔

”اس سلسلے میں تم جس طرح چاہو میری مدد حاصل کر سکتے ہو۔ یوں بھی اب ہمارے درمیان کوئی پردہ تو رہ نہیں گیا، چونکہ تم مجھے بیوی کی حیثیت سے قبول نہیں کرو گے اس لئے شاید میں

نے تمہاری منکوحہ بیوی بننے پر غور نہیں کیا اس کے علاوہ تو.....“ نجمہ بیگم آنکھ دباتے ہوئے ہنس دی۔

”میں آپ کا احسان مند ہوں نجمہ بیگم۔ لیکن میں نے کبھی اپنی حیثیت سے بڑھ کر نہیں سوچا۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کے ساتھ اس حیثیت سے منسلک ہو جاؤں۔ بہر حال آپ کا سماجی رتبہ مجھ سے بہت زیادہ ہے۔ آپ مجھ پر ایک احسان ضرور فرمائیں۔ اگر ممکن ہو تو وہ تصدیق جو آپ نے نازنین اور ملک صاحب کی تیار کردہ ان کا ایک سیٹ مجھے بھی عنایت کر دیں۔ میں اس بڑے کھوسٹ کی بے بسی کا تماشا دیکھنا چاہتا ہوں۔ جس طرح اس نے مجھے بے بس کر کے مارا ہے اس کے علاوہ نجمہ صاحب مجھے ان تصدیق کے ذریعے نازنین اور اس کی ماں کو بھی قابو میں رکھنا ہوگا..... گو کہ اس کی ضرورت نہیں لیکن آپ تو خود کہا کرتی ہیں کہ انسان کا دماغ گھومنے پر آئے تو ایک پل میں جانے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دے۔ مستقبل میں ہمارے کاروبار کے تحفظ کے لئے ان طوائفوں پر گرفت مضبوط رکھنا ضروری ہے۔ یوں بھی نجمہ بیگم اب آپ ایک معزز اسمبلی ممبر کی بیوی بننے جا رہی ہیں اور ملک صاحب کو بلیک میل کرنا شاید آپ کو زیب نہیں دیتا۔“ ارسلان نے آخری بات کہہ کر اس کے چہرے پر پرامید نظریں گاڑیں۔

”بہت چالاک ہو۔ مکمل کاروباری اور موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے والے۔ اچھی بات ہے۔ مجھے خوشی ہوتی ہے بہر حال اس تربیت میں میرا بھی حصہ ہے۔ اب تم مانویا نہ مانو، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اگر میں تمہیں راہ راست پر نہ لاتی تو آج تم ملک کے ایک معمولی کارندے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے جسے وہ جب چاہتا نواز یا اختر کی طرح ملی چڑھا دیتا..... ارسلان! میں حیران ہوتی ہوں یہ سوچ کر کہ میں تمہاری کسی بات کو رد کیوں نہیں کرتی۔ ارسلان! میں اتنی آسانی سے بات مان جانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ بہر حال مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تم میری کمزوری بننے جا رہے ہو۔“

یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگی۔

ارسلان خاموشی سے اس کا منہ دیکھتا رہا۔

”ٹھیک ہے کچھ پرنٹ میں تمہیں بھی دے دوں گی لیکن اس کے ٹیکو میرے پاس زیادہ محفوظ رہیں گے، کیونکہ ہم بزنس پارٹنر ہیں۔ اس لئے ہمیں ایک دوسرے سے تعاون تو کرنا

ہی ہوگا۔“

”میں آپ کے اس احسان کا بدلہ ساری عمر نہیں چکا سکتا۔ آپ میرے تصورات سے بڑھ کر عظیم عورت ہیں۔“

”بس بس.....“ نجمہ بیگم نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات ٹوک دی۔

”اس کی ضرورت نہیں۔ تم میری تعریف نہ بھی کرو تو میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ ارسلان مجھے علم نہیں تمہاری میری متعلق کیا رائے ہے لیکن اگر تم یقین کر سکتے ہو تو کر لو کہ میں نے ازدواجی زندگی کے دوران جس نوعیت کے تعلقات تمہارے ساتھ قائم کئے ہیں کسی اور کے ساتھ نہیں کئے..... اور ہاں مجھے ابھی کچھ زیادہ جلدی بھی نہیں ہے۔ میں شادی اب سوچ سمجھ کر ہی کروں گی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ریاست شاہ کی خواہش ہے کہ ہم جلد از جلد رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائیں لیکن میں الیکشن کے بعد ہی کچھ کر سکوں گی۔ ابھی میرے خیال سے مجھے ساری توجہ بزنس اور سوشل ویلفیئر پر ہی دینی چاہئے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“

”میں آپ کی اس بات سے صد فی صد اتفاق کرتا ہوں۔ واقعی ابھی آپ کو جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ پھر نجمہ بیگم یہ بھی تو معلوم نہیں کہ ریاست شاہ سے شادی کے بعد ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہو جائے گی کیونکہ ملک صاحب کی بات تو اور تھی وہ تو.....“

”تم اس کی فکر نہ کرو۔ وہ میرا دوسرا ہے۔“ اس نے ارسلان کی بات سمجھ کر کانٹے ہوئے کہا۔

دونوں دوپہر تک وہیں رہے۔ مسز ملک نے اسے جاتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ جس کوٹھی میں رہائش پذیر ہے وہ ملک صاحب نے اس کے نام لگا رکھی ہے اور نجمہ بیگم اپنی رہائش اب وہیں رکھے گی۔ اس نے اپنے ایک بھائی، بہن اور ماں کو بھی یہیں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس طرح وہ کم از کم ”فیملی لائف“ کا تاثر قائم رکھ سکتی تھی۔ ورنہ تو اخبار والے اس کے وہ لٹے لیتے کہ خدا کی پناہ! اب اسے بہت محتاط ہو کر زندگی گزارنا تھی۔

اس نے ارسلان کو بتا دیا تھا کہ ملک ارسلان کے لئے مسائل پیدا کرے گا کیونکہ وہ کم از کم ارسلان کا نجمہ بیگم کے ساتھ رہنا برداشت نہیں کر سکتا۔

”اس خطرے کی پیش بندی کے لئے ہی تو آپ سے تصاویر مانگی ہیں۔ میں نہیں سمجھتا

کہ اس کے بعد بھی ملک صاحب کو دماغ کی خرابی کا دورہ پڑے گا۔“

”شاباش..... لیکن محتاط رہنا اور ہاں خود کو اکیلا کبھی نہ سمجھنا۔ تم کوئی ایسی ویسی مچھلی نہیں ہو جسے ملک اتنی آسانی سے نگل سکے۔“

نجمہ بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”نجمہ بیگم اب آپ میرے اور ملک کے درمیان سے ہٹ گئی ہیں۔ اب آپ دیکھیں گی کہ میں ملک صاحب کو کس طرح کتنی کا ناچ نچاؤں گا..... بیگم صاحبہ جن لوگوں نے مجھ سے میرا گھر اور میری شناخت چھینی ہے میں ان کو نیست و نابود کر کے رکھ دوں گا۔ اس کے علاوہ میری زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں رہ گیا۔“

ارسلان بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی آخری بات پر ایک لمحے کے لئے نجمہ بیگم چونکی ضرور تھی۔

لیکن.....!

پھر اس نے اس خیال ہی کو اپنے دل سے نکال دیا کہ یہ کل کا لوٹا کبھی اس کے لئے بھی کوئی خطرہ پیدا کرے گا؟



حملہ

نجمہ اور ملک نے بڑی ہوشیاری سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ملک صاحب پندرہ روز کے لئے ”علاج کروانے لندن“ چلے گئے تھے اور جس کوٹھی میں وہ مقیم تھے وہ انہوں نے خالی کر دی تھی۔ نجمہ کی ہدایت پر ابھی تک ریاست شاہ نے زیادہ گرجوش کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ یوں بھی وہ پرانا شکاری تھا اور شکار کو بڑے صبر و سکون کے ساتھ مار کھانے کا قائل!

نجمہ بیگم نے اپنے گھر والوں کو اپنی دولت کے بل بوتے پر خاصا معزز بنا دیا تھا۔ اس کے خاندان میں شاید اس کے وہ دو تین بہن بھائی ہی ایسے تھے جنہوں نے اتنے اعلیٰ اور مہنگے سکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ان لوگوں کے نجمہ بیگم نے بہت عرصہ پہلے جب وہ ملک صاحب کی بیوی بنی تھی اس شہر کے ماڈرن آبادی میں ایک فلیٹ کرائے پر لے دیا تھا جہاں وہ اپنی ذات بدل کر اپنے ناموں کے آگے پیچھے نئے ناموں کا اضافہ کرنے کے بعد بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

پیش آمدہ حالات کی پیش بندی کرنے کی خاطر اس نے ساری منڈلی اب اپنے ہاں جمالی تھی۔ اس کا گھرا تا بڑا تھا کہ ایسے دو چار اور خاندان بھی اس میں سا سکتے تھے۔ جو کاروبار اس نے سنبھال رکھا تھا۔ اس میں اتنی زیادہ آمدن ہو جاتی تھی کہ جس کے بعد اسے کسی اور سہارے کی

ضرورت ہی نہ رہ جاتی۔

اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے اس نے پہلے ہی سے تین چار خیراتی قسم کے ادارے کھول رکھے تھے جہاں وہ بیوہ اور بے سہارا خواتین سے دستکاری کروا کر یہاں کا تیار شدہ مال پھر بازار میں اچھے داموں فروخت کروا دیا کرتی تھی۔ ان اداروں کے نام پر اچھی خاصی گرانٹ اسے سرکاری طور پر الگ سے مل جایا کرتی تھی۔

اپنی دانست میں تو دونوں نے خاصی احتیاط برتی تھی لیکن اس کے اندازوں کے بالکل برعکس ملک صاحب کی لندن موجودگی کے دوران ہی یہ راز طشت از بام ہو گیا۔ جس کے بعد سے اخبارات نے اس کو موضوع بنالیا۔ جس روز ملک صاحب لندن سے لوٹے تو ہوائی اڈے پر ہی اخبار نویسوں نے انہیں گھیر لیا۔ ملک صاحب کا بادل خواستہ اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ ان کے اور نجمہ بیگم کے درمیان خاموشی سے علیحدگی ہو چکی ہے اور دونوں نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ انہوں نے اخبار نویسوں سے اپیل کی تھی کہ ان کی ذاتی زندگی کو اخبارات میں نہ اچھالا جائے۔

اسی نوعیت کا بیان نجمہ بیگم نے اخبارات کو جاری کیا تھا جب ایک تقریب میں ایک اخبار نویس نے ریاست علی کے حوالے سے کچھ بات کہنا چاہی تو نجمہ ملک نے اسے بری طرح ڈانٹا کہ بے چارہ ہکا بکا ہی رہ گیا۔ اس کے بعد کسی نے اس نوعیت کا کوئی سوال ہی نہیں کیا تھا۔ کلرک بادشاہ سے زیادہ تیزی کے ساتھ بھنڈر کی قسمت نے پلٹا کھایا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے پارٹی میں اپنی دھاک بٹھائی تھی لیکن سرمنڈواتے ہی اگلے پڑ گئے اور ملک نے ایک ہی داؤ میں اسے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

اس روز جب صوبائی لیگ کو اپنے ”اندرون خانہ ذرائع“ سے اطلاع ملی کہ اگلے 48 گھنٹوں کے اندر اندر مرکزی لیگ کی طرف سے الیکشن کے انعقاد کا اعلان ہونے والا ہے تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ابھی تک یہ لوگ کوئی ڈرامہ حکومت کے خلاف ایسا تیار نہیں کر سکے تھے کہ جس سے اپنی گرتی ساکھ کو سنبھالا دے سکیں۔

فی الوقت تو ملکی فضا ان کے خلاف تھی اور کلرک بادشاہ کی اس پریس کانفرنس کو ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ میں ایک سازش کے تحت کچھ زیادہ ہی اچھالا جا رہا تھا۔

اس سے بہتر فضا قدرتی طور پر مخالفین کو پھر کب میسر آ سکتی تھی۔ صوبائی لیگ کے کرتا دھرتا جانتے تھے کہ اگر ان حالات میں الیکشن کا اعلان کر دیا گیا تو وہ شاید ایک صوبے میں بھی اپنی حکومت برقرار نہ رکھ سکیں حالانکہ اس سے پہلے ان لوگوں نے دن رات محنت کر کے عوام میں خاصی جگہ بنائی تھی۔

”بھنڈر صاحب برامت مانیں۔ آپ نے ہمارے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ دن رات محنت کر کے ہم نے عوام کے دلوں میں جگہ بنائی تھی اور حالات کو اپنے حق میں استوار کیا تھا لیکن آپ نے ملک صاحب کی دشمنی میں اندھے ہو کر ہمیں اپنے بہترین دماغ سے محروم کر دیا۔ جی ہاں! برامت مانئے بھنڈر صاحب صرف آپ کی وجہ سے ملک صاحب نے پارٹی سے علیحدگی اختیار کی ہے اور آپ نے آج تک سوائے بڑے بڑے دعوؤں کے اور کچھ نہیں کیا۔“

جزل سیکرٹری تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر بھنڈر پر برس پڑا۔ وہ لوگ 24 گھنٹے کے نوٹس پر ملک کے کونے کونے سے آج یہاں اکٹھے ہوئے تھے۔ بھنڈر جانتا تھا کہ یہ جزل سیکرٹری کبھی اس کا ہمدرد نہیں رہا اور ملک کے بہترین ساتھیوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔

”سیکرٹری صاحب! کم از کم پارلیمانی آداب کا خیال تو رکھئے۔ آپ ایک سینئر ممبر سے بات کر رہے ہیں۔ آپ کو کسی بھی پارٹی ممبر کو ڈانٹنے کا حق کس نے دیا ہے۔“

بھنڈر کے اشارے پر اس کے ایک ساتھی نے کھڑے ہو کر ہنگامے کا آغاز کرنا چاہا۔ اس نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ آج کے اجلاس میں سب کی تان اس پر ہی ٹوٹے گی۔ خصوصاً ملک کے پرانے دوست جن میں پارٹی سیکرٹری سرفہرست تھا اس کو خوب رگڑیں گے۔

”آپ بیٹھ جائیں میاں صاحب اور میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“ سیکرٹری کو بھی غصہ آ گیا۔

”کیا مطلب؟ آپ کو شرم آئی چاہئے۔ آپ مجھے۔“

”بیٹھ جاوئے نیچے۔“ میاں صاحب کی بات نامکمل تھی جب عقب سے آواز بلند

ہوئی۔

”کیا بکواس ہے؟ یہ کون سے لوگ آپ نے اکٹھے کر لئے ہیں یہاں؟ میں صدر صاحب آپ سے پوچھ رہا ہوں۔“ میاں کو پیش آ گیا۔

”سٹ ڈاؤن..... اپنی اوقات میں رہو۔ تم ہو کیا؟“ سیکرٹری کے ایک ساتھی کی غیرت جاگی۔

اس کے ساتھ ہی بھنڈر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”صدر صاحب یہاں غنڈہ گردی کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ اس ”بھان متی کے کنبے“ نے کیا پلان تیار کیا ہے۔ خدارا! انہیں سمجھائیے زیادہ تماشا نہ لگائیں۔ جتنی اس کی عمر ہے اس سے زیادہ وقت میں نے سیاست میں گزارا ہے۔“

”آپ نے جھک ماری ہے۔“ بھٹی صاحب کو بھی جوش آ گیا۔ ”اس نے سوائے غنڈہ گردی کی سیاست کے اور کیا ہی کیا ہے؟“

”چپ کر دوئے شرافت کے مامے۔“ اب سیال صاحب کی باری تھی۔

”تیری یہ ہمت.....!“

کہتے ہوئے وہ سیال صاحب کی طرف لپکے۔ اس سے پہلے کہ صدر صاحب اور دوسرے ممبران حالات کو سنبھالیں، دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی وہاں مچھلی بازار لگ گیا۔ ہر کوئی حسب توفیق دوسرے کو صلواتیں اور گالیاں سنارہا تھا۔

”جھڑت بیٹھ جائیے..... بیٹھ جائیے..... بیٹھ جائیے۔“ صدر صاحب مسلسل اپیلیں کر رہے تھے لیکن کوئی ان کی اپیل پر کان دھرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جوتیوں میں دال بٹنے لگی اور صدر صاحب کو بادل خواستہ سہ پہر تک اجلاس ملتوی کرنا پڑا۔

پارٹی ممبران نے ہاتھ پائی تو نہ ہونے دی لیکن اس میں کسر بھی نہیں رہ گئی تھی۔ اس وقت تو ان لوگوں کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ کانفرنس ہال کے باہر موجود انقلابی سٹوڈنٹس گجر گروپ کے کارکن جزل سیکرٹری صاحب کے خلاف نعرے لگاتے اندر گھس آئے۔ انہوں نے بھنڈر صاحب کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا اور ان کے حق میں نعرے بازی شروع کر دی۔

اس کے ساتھ ہی کسی نے کرسی اٹھا کر بھنڈر صاحب کی طرف اچھالی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ اخبار نویس بھی اس سنہرے موقع کی تلاش میں تھے۔ کیمرہ کی فلیش گتیں چمکیں اور یہ مناظر سلائیڈ کے فیتوں میں منتقل ہو گئے۔

پندرہ بیس منٹ تک کانفرنس ہال میدان جنگ کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ جب معاملہ کسی طرح ٹھنڈا پڑتا نظر نہ آیا تو پارٹی سیکرٹری نے دل پر پتھر رکھ کر پولیس کو مداخلت کا حکم دے دیا۔

پولیس والے بھی جانے کب سے تاؤ کھائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے لڑکوں کی وہ درگت بنائی کہ خدا کی پناہ! دس منٹ کے اندر اندر ہنگامہ فرو ہو گیا۔

جب اخبار نویس اپنے دفاتر کی طرف بھاگنے کے لئے اپنی موٹر سائیکلیں اشارت کر رہے تھے تو عین ان لمحات میں صوبائی لیگ کے کچھ ممبران نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر لفافے ان کی جیبوں میں منتقل کئے اور انہیں ہنگامی پریس کانفرنس کے لئے روک لیا۔

یہ پریس کانفرنس پارٹی کے صدر صاحب کی طرف سے پارٹی کے سنٹرل آفس میں کی گئی تھی۔ ایک گھنٹے کے نوٹس پر بلائی گئی اس پریس کانفرنس میں سیکورٹی کے انتظامات اتنے سخت تھے کہ کسی چیز یا کے بھی یہاں پر مارنے کی گنجائش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ انقلابی سنوڈ ٹش کے گجر کے مخالف دنگ کے طلباء نے گارڈ کے فرائض سنبھال رکھے تھے اور وہ صرف اس پارٹی ممبر کو اندر جانے کی اجازت دیتے تھے جسے سیکرٹری یا صدر صاحب کی کلیرنس ملتی تھی۔

صدر صاحب نے اخبار نویسوں میں ایک لکھا ہوا بیان تقسیم کر دیا جس میں بتایا گیا تھا کہ مرکزی لیگ کے پروردہ غنڈہ عناصر نے خوب خوب حق نمک ادا کیا ہے اور ایک سازش کے تحت ہنگامہ کھڑا کیا گیا جس میں پارٹی کا کوئی ممبر ملوث نہیں۔ یہ سارا کارنامہ مرکزی لیگ اور ان..... سرکاری ایجنسیوں کا ہے جو مرکزی لیگ کو آئندہ انتخابات میں کامیاب کروانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں۔ بیان میں اس صورت حال کو انتہائی افسوس ناک قرار دیتے ہوئے اس کی ساری ذمہ داری مخالفین پر ڈال کر صدر صاحب نے وارننگ دی تھی کہ مرکزی لیگ نے سیاست میں تشدد اور غنڈہ گردی کی جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے وہ جمہوریت کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔

”جناب والا.....“ ایک اخبار نویس نے کھڑے ہو کر سوال کرنا چاہا۔

”اوئے بیٹھ جاوئے۔ کوئی سوال نہیں ہوگا۔ سمجھ آئی۔“ صدر صاحب کی بغل میں کھڑے ایک ”انقلابی گارڈ“ نے اسے ڈانٹ کر بٹھا دیا۔

”حضرات باقی باتیں چائے پر.....“ کہہ کر صدر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

اخبار نویس نیدے بچوں کی طرح چائے اور دیگر لوازمات پر ٹوٹ پڑے۔

اس درمیان تمام اخبار نویسوں کی حسب مراتب اور حسب معمول جیبیں گرم ہو چکی تھیں۔

لیکن.....!

صوبائی لیگ کے لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اگلے روز ملک کے قریباً ہر قابل ذکر اخبار نے اس ہنگامے کی خبر شہ سرخیوں سے شائع کی تھی اور اپنے تبصرے بھی شائع کئے تھے۔ یہ تمام اخبارات کم از کم اس بات پر متفق تھے کہ صوبائی لیگ میں موجود ایک خاص گروپ کی غنڈہ گردی کی وجہ سے اچھے لوگ اس سے علیحدگی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

ان اخبارات نے اگلے انتخابات میں صوبائی لیگ کی کامیابیوں کے دعوؤں کو باطل گردانا تھا اور یہی خیال ظاہر کیا تھا کہ اپنے دعوؤں کے برعکس صوبائی لیگ شاید ایک صوبے میں بھی اپنی حکومت قائم نہ رکھ سکے۔

○

نجمہ بیگم نے اگلے ہی روز ملک صاحب کی تصاویر ارسلان تک پہنچا دی تھیں۔ جس کا اس نے ضرورت سے زیادہ ”گرم جوشی“ سے شکریہ ادا کیا تھا۔ یہ بات اب اس کے لئے حیران کن نہیں رہی تھی کہ نجمہ بیگم نے اس کی کسی غیر اخلاقی حرکت کا برا ماننا چھوڑ دیا تھا۔

لیکن.....!

اس نے بھی کبھی اپنی حد سے تجاوز نہیں کیا تھا۔

”سپانسر شپ آگئی ہے اور دونوں ماں بیٹی بھی لندن کی سیر کے لئے اتاولی ہوئی جاتی ہیں۔ بس آپ کے حکم کا انتظار ہے.....!“ ارسلان نے اس مرتبہ کھیل کا ڈراپ سین کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔

”اس میں حکم کی کیا بات ہے جناب۔ ہم برابر کے پارٹنر ہیں۔ بس ذرا سجاوٹ خان

سے.....“

”نجمہ بیگم آپ نے نجانے کیوں اسے اپنے ذہن پر مسلط کر رکھا ہے۔ بھی اس ملک میں کتنے لوگ اس دھندے سے وابستہ ہیں۔ کیا وہ پہلے سجاد خان سے سرٹیفکیٹ لے کر ہی اپنا کام شروع کرتے ہیں..... اگر میں نے پہلے چکر ہی میں باہر منڈی اور گاہک تلاش کر لیا تھا تو سجاد خان کے مشورے سے نہیں کیا تھا..... برائے مہربانی آئندہ آپ یہ نام استعمال نہ کیا کریں۔ مجھے تو اب اس شخص سے خواہ مخواہ کی رقابت محسوس ہونے لگی ہے حالانکہ ریاست شاہ سے ہونی چاہئے۔“

آخری فقرے پر نجمہ بیگم نے قہقہہ لگا کر اس کے گال پر چٹکی لی تھی۔

”اب تم بھی ایسا سوچتے ہو.....!“ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”پرسوں شو کے سے دونوں تیار یک وصول کر لینا۔ اس مرتبہ انہیں دوسرے ایئر پورٹ سے بھیجنا ہے۔ میں خود نہیں جاؤں گی، لیکن وہاں اپنا آدمی موجود ہے اور ہاں اس مرتبہ مال ڈراؤبل کر کے بھیجتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کامیاب چکر کے بعد ریاست علی سے شادی کر لوں جس کے بعد لمبے عرصے تک خاموشی اختیار کرنا ہے کیونکہ ریاست شاہ کو اعتماد میں لیتے ہوئے دیر لگے گی۔ میں جانتی ہوں تم جو کہنا چاہتے ہو اس بات کا مجھے بھی علم ہے کہ وہ یہ کام ایک عرصے سے چلا رہا ہے لیکن اس چیز کا خیال رہے کہ اسے ابھی اس بات کا علم نہیں ہوا کہ میں یہ دھندہ کر رہی ہوں۔ حالانکہ وہ ماضی میں میرے اور سجاد خان کے تعلقات سے باخبر ہے، لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایسے سوشل تعلقات سیاست میں زندہ رہنے کے لئے ناگزیر ہیں اور ان پر قدغن بھی نہیں لگائی جاسکتی۔“

”ٹھیک ہے جیسا آپ کا حکم۔ نوکر کیا اور نگرہ کیسا؟“ ارسلان نے حسب خواہش حرکت کی تھی۔

دونوں کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پھر الگ الگ ہوٹل سے رخصت ہو گئے۔

ملک صاہب سے طلاق لینے کے بعد نجمہ اور ارسلان نے اپنی ملاقاتوں میں خاصی احتیاط برتنا شروع کر دی تھی۔ اس احتیاط کا زیادہ مظاہرہ ارسلان کی طرف سے ہوتا تھا حالانکہ نجمہ بیگم کو اس سے الجھن ہوتی تھی اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ ارسلان اب ملک سے کسی وجہ

سے خوفزدہ رہے جب کہ وہ خود ملک پر دباؤ رکھنا چاہتی تھی۔

لیکن.....!

ارسلان کی خواہش پر اس نے زیادہ اصرار نہیں کیا تھا۔ اس نے نجمہ بیگم سے درخواست کی تھی کہ وہ کچھ عرصے کے لئے سوشل تقاریب میں اسے بطور سیکرٹری اپنے ساتھ لے جانا چھوڑ دے۔ اس درمیان ملک کے شہر سے محفوظ رہنے اور سانپ کا زہر نکالنے کا کوئی بندوبست بھی کرے گا۔

○

یہاں سے رخصت ہو کر اس نے سجاد خان کو فون کیا تھا، لیکن وہ ملک سے باہر تھا۔ ارسلان کی خواہش پھر اس کا پیغام ”فوری رابطے“ کے لئے سجاد خان کو پتہ چلا دیا گیا تھا اور دوپہر کے بعد اسے سجاد خان کے ایک دفتر میں پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

اس دفتر میں وہ دو تین مرتبہ پہلے بھی جا چکا تھا اور یہاں کا سٹاف بھی اسے پہچاننے لگا تھا۔ دفتر کی مقامی انچارج نے اس کی رہنمائی ایک فون تک کی جہاں اس کے بیٹھنے کے پندرہ بیس منٹ بعد ہی سجاد خان کی غیر ملک سے کال موصول ہو گئی۔

اس نے سجاد خان کو فون پر نجمہ بیگم کی تازہ واردات سے جودہ کرنے جاری تھی آگاہ کیا اور اب اس کی اجازت کا منتظر تھا۔

”اگر آپ کا حکم ہو تو یہ کھیل اب ختم کر دیا جائے؟“

”ہاں اب اس کھیل کو ختم ہونا ہی چاہئے.....!“ سجاد خان کی گھمبیر آواز فون پر ابھری۔ اس نے ارسلان سے دو نمبر نوٹ کرنے کے لئے کہا تھا۔ ایک ٹیلی فون نمبر مقامی تھا اور ایک لندن کا۔

”فلائٹ کی روانگی کے بعد پہلے لندن والے فون پر پھر مقامی فون پر رپورٹ کر دینا۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اس زہریلی ناگن کو کس طرح جال میں پھانتے ہو۔ اس بات کا خیال رہے کہ صرف دو طوائفوں کی گرفتاری تک معاملہ محدود نہیں رہنا چاہئے..... اس طرح تو ان بے چاروں سے خواہ مخواہ زیادتی ہو جائے گی۔“

”خان صاحب! آپ مطمئن رہیں۔ میں نے بھی بہت کچھ سیکھا ہے نجمہ بیگم سے اور

اس کی تربیت ہی کو اب اس کے خلاف استعمال کرنے جا رہا ہوں۔ آپ کے لئے چونکا دینے والی خبر بھی موجود ہے کہ ان لوگوں کی گرفتاری کے ساتھ ہی نجمہ بیگم کے ”گینگ لیڈر“ ہونے کے بیانات ماں بیٹی کی طرف سے دیئے جائیں گے اور اس کا دستاویزی ثبوت ذمہ داروں تک پہنچ جائے گا۔“

”دعوتِ رفل.....! خاصے سمجھدار ہونو جوان۔ خاصے کام کے آدمی لگتے ہو گڈ لک..... خدا حافظ!“

دفتر سے باہر آ کر اس نے دوبارہ پیش آمدہ واقعات کی ترتیب کو ذہن میں دہرایا اور کاغذ کا وہ پرزہ احتیاط سے سنبھال کر اپنے پاس رکھ لیا۔ سجاد خان نہیں جانتا تھا کہ ارسلان نے ایسے تین چار نمبر ملکی اور غیر ملکی پہلے ہی سے حاصل کر رکھے ہیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دونوں اس ملک میں گرفتار ہوں۔ دونوں کو وہ غیر ملک میں گرفتار کروانا چاہتا تھا تاکہ نجمہ بیگم کو اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کا موقعہ ہی نہ مل سکے۔

اسے ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر بڑی احتیاط سے اٹھانا تھا۔

سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنے جا رہا تھا وہ.....!

ایک ہی وقت میں اس نے نجمہ بیگم ریاست علی اور ملک صاحب کو لکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ اپنے مفادات پر فوراً شیطانی ٹولے کا روپ اختیار کر لیتے ہیں نجمہ بیگم بہر حال کچھ عرصہ پہلے تک ملک صاحب کی بیوی تھی اور طوائفوں کے بیانات میں یہ سب کچھ بتایا جائے گا۔ یہ بھی بتایا جائے گا کہ وہ ملک صاحب کے بستر کی زینت بھی بنتی رہی ہے۔

ملک تمللا اٹھے گا۔

اس کا تعلق اخبارات فوراً اس گروہ سے جوڑ دیں گے اور اس کا سیاسی کیریئر تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

بھنڈر کے لئے یہ خبر ”ٹرمپ کارڈ“ بن جائے گی۔ وہ ساری دنیا کے پریس کو سر پر اٹھا لے گا اور ارسلان جانتا تھا کہ ملک صاحب اس ملک کے تمام شکاری کتوں کو اس کے پیچھے لگا دیں گے۔ اسے زمین کی ساتویں تہہ سے نکال کر مروا ڈالیں گے۔

اس نے اپنی جوانی کے قیمتی سال ملک کے ساتھ بیٹھ چڑھائے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ

اس ملک کے ہر کوئے میں بڑے بڑے بد معاش اور رسہ گیر اس کے دسترخوان پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ ملک نے کسی کو مروا دیا یا چاہا اور وہ بچ نکلا ہو۔

نجانے کتنے بے گناہوں کا خون تھا اس کی گردن پر.....؟

نجانے کتنی گناہ لاشوں کے پس پردہ اس کا شیطانی ذہن کا رفرما تھا.....؟

نجانے کتنی بیواؤں کی بد دعائیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں.....؟

نجانے کتنی ماؤں کے کلیجے میں انگڑے اتارے تھے اس نے.....؟

”ملک صاحب میں آپ کے لئے خدا کا عذاب بننے والا ہوں.....!“ اس نے زیر

لب دہرایا۔

اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے تھے۔ ماتھے کا پسینہ اس نے قمیض کی آستین سے پونچھا۔

”میں ان شیطانوں کو آپس میں ٹکرا کر تھس تھس کر دوں گا۔ زمین تمہارے بوجھ سے آزاد ہو جائے گی۔ شیطانو! بے ایمانی اور بد معاشی کا جو ہر تم نے قوم کی رگوں میں اتارا ہے وہ تمہارے ہی لئے سم قاتل بنے گا۔“

جانے کتنے نوجوانوں کو تم نے درندہ بنا ڈالا۔ اب یہ درندے تمہاری رگوں سے خون چوس لیں گے۔

تم مر جاؤ گے۔

تمہیں مرنا ہوگا.....!

اس ملک کے ہر دشمن کو مرنا ہوگا خواہ اس نے کوئی بھی لبادہ اوڑھ رکھا ہو۔ کوئی بھی روپ دھار رکھا ہو۔

ملک! میں ابتدا کرنے جا رہا ہوں۔ پہلا پتھر میں ماروں گا۔ پہلی گولی میں فائر کروں گا تم سب کے لئے، تم فرعونوں کے لئے۔ رسم موسوی کی ابتدا مجھ سے ہوگی۔ وہ نجانے کیا کیا کہتا رہا اور پاگلوں کی طرح دیواروں سے باتیں کر کے قہقہے لگاتا رہا۔

تصویرات کے اس جہنم سے اسے ٹیلی فون کی گھنٹی نے نجات دلائی۔ فون پر پراپرٹی ڈیلر اس سے مخاطب تھا۔

”ارسلان صاحب بہت خوش قسمت ہیں آپ۔ بڑا زبردست گاہک ملا ہے۔ کوئی بہت ضرورت مند ہے بے چارہ۔ شاید باہر کے ملک سے کمائی کر کے لوٹا ہے۔“

”لوٹ لو۔ لوٹ لو! صاحب جانے نہ دینا۔ کسی کوچ کرنے جانے دینا۔“

وہ شاید ابھی تک اسی ترنگ میں بولے جا رہا تھا اور دوسری طرف پراپرٹی ڈیلر شیخ بے شرمی سے دانت نکال رہا تھا۔

اگلے 48 گھنٹوں میں اس کے شاندار بنگلے کا سودا چپ چاپ ہو گیا تھا۔ ابھی اس نے ایک ماہ تک اسی بنگلے میں قیام کی قانونی اجازت حاصل کر لی تھی۔

ارسلان کو کسی ایسی ہی پارٹی کی تلاش تھی جو پراپرٹی کی قیمت اس کو کسی دوسرے ملک میں ادا کرے۔ اس نے ساری قیمت غیر ملکی کرنسی میں اپنے غیر ملکی اکاؤنٹ میں جمع کروالی تھی۔

بظاہر اس کی تمام تیاریاں مکمل تھیں.....!

فرار کے سارے راستے کھلے تھے.....!

اور اب وہ حملہ کرنے جا رہا تھا.....!

○

شو کے نے حسب معمول کمال فن کا مظاہرہ کیا تھا اور دوا ایسے بیک تیار کر لئے تھے جن کو ٹٹولنے پر بھی ان میں سے کچھ برا مدد نہ ہوتا۔

”بھلا کوئی ان پر شک کر سکتا ہے.....!“ ارسلان نے دونوں بیک مختاراں کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”واقعی ارسلان باؤ۔ کمال ہے ہمیں تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ اس میں کیا ہے اور کہاں رکھا ہے؟“

مختاراں نے بیگوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہیں جاننے کی ضرورت ہی نہیں۔ بس تم یہی سمجھو کہ جیسے یہ تمہیں نظر آ رہے ہیں ویسے ہی ہیں..... پھر بی بی! فکر کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تم نجمہ بیگم کا کام کر رہی ہو۔ وہ جتنی یہاں با اثر ہے اس سے کئی گنا زیادہ اس کا اس ملک میں اثر ہے۔ کسی بات سے گھبرانا نہیں۔ کوئی بھی بات ہو دھڑلے سے نجمہ بیگم کا نام لے دینا..... کس کی مجال ہے جو تمہاری طرف نظر اٹھا کر بھی

دیکھے..... اور ہاں! ایک بات کا خیال رکھنا۔ اگر کہیں تمہارے منہ سے میرا ذکر نکل گیا تو پھر لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہ انگریز لوگ کسی تیسرے آدمی کی اپنے معاملات میں مداخلت پسند نہیں کرتے۔ تمہارے وہاں پہنچنے سے اگلے ہی دن میں وہاں آ جاؤں گا۔ اس مرتبہ تمہیں جرمن اور ہالینڈ کی سیر بھی کروانی ہے اور اگلی مرتبہ امریکہ.....“

اس کی چرب زبانی کے سامنے مختاراں بیگم کی ایک نہیں چلتی تھی۔ بس ہونٹوں کی طرح منہ اٹھائے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

ہوس نے اسے اس بری طرح اندھا کر دیا تھا کہ اب اسے ساون کے اندھے کی طرح صرف ہریالی ہی دکھائی دیتی تھی اور کچھ نہیں۔

اس مرتبہ واقعی انہوں نے دوسرا ایئر پورٹ استعمال کیا تھا۔ اس شہر تک ارسلان انہیں خود چھوڑنے گیا تھا۔ اس نے لالچ کی ماری ماں اور ہوس کی اندھی نازنین کو یہ باور کروا دیا تھا کہ کوئی بھی مشکل پیش آنے پر وہ فوراً نجمہ بیگم کا نام لے دیں۔ اس کا ایڈریس اور فون نمبر انہوں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا۔

دونوں نجمہ بیگم کی قائل کیوں نہ ہوتیں۔ اپنے ملک سے پرواز کے وقت ارسلان انہیں جہاز تک چھوڑنے آیا تھا جب کہ عام حالات میں یہاں لوگ ایئر پورٹ کی چار دیواری کے اندر بھی داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

جہاز اڑا تو دونوں کا دماغ بھی اس کے ساتھ ہی فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔ اس مرتبہ ان کے لئے ایگزیکٹو میں سیٹیں لی گئی تھیں۔ غیر ملکی ایئر ہوسٹس ان کے سامنے کنیزوں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی۔

”گٹ دگ“ ایئر پورٹ پر جہاز نے لینڈ کیا تو خوشی سے دونوں کا چہرہ دکنے لگا۔ اس ایئر پورٹ پر وہ پہلی مرتبہ آئی تھیں۔ اس سے پہلے جہاز ہیتھر و ایئر پورٹ پر اترتا تھا۔ زمین پر ان کے قدم نہیں نکلتے تھے۔ بڑے ناظرے سے ماں بیٹی امیگریشن کاؤنٹر تک پہنچی تھیں جہاں برطانوی پولیس دیدہ و دل فرس راہ کئے ان کی منتظر تھی۔

امیگریشن کاؤنٹر سے انہیں اندر نہیں آنے دیا۔ کاؤنٹر سے ”بیگ“ تک خفیہ پولیس کی دو عورتیں محکمہ صحت کے ملازمین کے روپ میں ان سے چپکی صرف اس بات کا جائزہ لیتی رہیں کہ

راستے میں کن لوگوں سے سلام دعا لیتی ہیں۔

دوران پرواز جہاز میں نازنین پر ریشہ حطمی ہونے والے دونو جوانوں کو بھی بڑے سخت مراحل سے گزرتا پڑا۔

ماں بیٹی نے بیک ہاتھوں میں تھام رکھے تھے۔ پھر اپنا واحد اٹیچی کیس انہوں نے ”ریوالونگ پیٹ“ سے وصول کیا اور دوسروں کی دیکھا دیکھی گرین چینل پر چلنا شروع کر دیا۔

ابھی بمشکل چند گز ہی چلے پائی تھیں کہ انہیں ایک کسٹمر آفسر خاتون نے روک کر ان کی تلاش لینے کی استدعا کی۔ ماں بیٹی کا رنگ ایک لمحے کے لئے فق ہوا لیکن پھر وہ سنبھل گئیں۔

دونوں کو ایک کیمین میں لے جایا گیا جہاں ان کی ایک ہم زبان ان کے اور کیمین کے محلے کے درمیان رابطے کے فرائض انجام دینے کے لئے موجود تھی۔ چند منٹ بعد ہی پولیس نے انہیں حراست میں لے لیا۔

ان کے بیگوں سے ہیر و من نکال کر سامنے کاؤنٹر پر رکھ دی گئی۔ دونوں نے چلا چلا کر بیگم نجمہ کے نام کی مالا چینی شروع کی۔

لیکن.....! یہاں تو گنگا ہی اتنی بہہ رہی تھی۔ ان کو علم ہی نہ ہو سکا کہ یہ گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے۔ ان کی ایک ایک حرکت کو سلولائیڈ پر منتقل کیا جا رہا ہے۔ برطانوی ”ذمہ دار اہل کاروں“ کو تصاویر کا وہ پیکٹ بھی موصول ہو چکا تھا جس میں دونوں ماں بیٹی اور بیگم نجمہ شہر و شکر ہوتی نظر آ رہی تھیں۔

انگریزی میں تینوں کے نام تصاویر کی پشت پر ٹائپ کئے ہوئے تھے۔



پارٹ آف گیم

”بیٹی گھبراؤ نہیں۔ بھلا کبھی ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ مسز ملک کے حکم سے سرتابی کریں۔ انگریزوں کا ملک ہے ناں اس لئے ذرا ڈرامہ تو کریں گے۔ شاید کھلے عام بات نہ کرنا چاہتے ہوں۔“ مختار اس نے پولیس کار میں بیٹھی اپنی بیٹی کو تسلی دینے کے لئے یہ بات تو کہہ دی تھی لیکن اس کا دل خزاں زدہ بچے کی طرح لرزاں تھا۔ جس قیامت سے وہ گزر رہی تھی اس کا تو تصور ہی کبھی اس نے نہیں کیا تھا۔

”اور ہاں ذرا ہوشیاری سے نجمہ کے علاوہ کوئی اور نام نہ لینا ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

مختار اس نے نہیں جانتی تھی کہ اس کی تمام حرکات کو مانیٹر کیا جا رہا ہے۔ اس کی گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے۔

دونوں کو وہ لوگ جس پولیس سٹیشن لائے تھے وہ اپنے ملک کے دفتر جیسا ہی لگتا تھا۔ یہاں چاروں طرف میزوں، ٹیلی فونوں اور کمپیوٹرز کا جال بچھا تھا۔

”دیکھا میں نے کبھی تھی کہ گھبراہٹ والی کوئی بات نہیں۔ بھلا یہ تھانہ ہو سکتا ہے۔ تھانے بھلا ایسے ہوتے ہیں۔“ اس نے دوبارہ جھوٹ بول کر نازنین کو بھلانا چاہا۔

”بی بی! میرا تودل ڈوب رہا ہے۔“ نازنین نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

انہیں الگ کمرے میں لے جایا گیا تھا جہاں ایک نوجوان پہلے ہی سے موجود تھا جو ان سے ان کی زبان میں بات کر رہا تھا۔ تین گھنٹے تک گفتیش کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر جو آفسران کے ساتھ یہاں تک آیا تھا وہ باہر چلا گیا۔ اس درمیان دونوں کو فون کے کپوں میں پینے کے لئے چائے بھی دی گئی تھی۔

چند منٹ بعد وہ آفسر واپس آ گیا۔ اس درمیان وہاں پہلے سے موجود نوجوان لڑکا ان سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں کئی کام کی باتیں ان کے منہ سے اگھوا لی تھیں۔

انگریز آفسر نے اپنی زبان میں اس نوجوان سے کچھ کہا اور اب مختار اس سے مخاطب

تھا۔

”یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹ بول رہی ہو اور تمہارا نجمہ بیگم سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم تمہیں ٹیلی فون پر اس کا نمبر ملا دیتے ہیں۔ نجمہ بیگم سے بات کر لو۔ اگر اس نے تمہیں پہچان لیا تو تمہاری سفارش خود ہی کردگی اور ہاں دیکھنا کہیں فون ملے ہی گرفتاری کی بات کر کے اسے گھبرا نہ دینا۔ پہلے اس سے سلام دعا کر کے اسے اپنی خیر خیریت سے یہاں پہنچنے کی اطلاع دو۔ اس کے بعد باقی باتیں ہم خود اس سے کر لیں گے۔ تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم کہاں سے فون کر رہی ہو۔ بس اسے یہی کہنا کہ تم نے ایئر پورٹ سے ہی فون کیا ہے..... بات سمجھ آ گئی ناں۔“

”ہاں! ہاں! ملاؤ فون۔ کمال ہے ہمیں کیوں نہ پہچانے گی۔“

خوش فہمی کی ماری مختار اس ابھی تک یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہی سچ ہے اور اب اسے یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ واقعی نجمہ بیگم کا مال لے کر یہاں آئی تھی۔ اس نے نجمہ بیگم کا نام ایڈریس ٹیلی فون نمبر جو اپنے پاس لکھا تھا انہیں سوپ دیا۔

اس نوجوان نے اپنے سامنے رکھے ٹیلی فون پر نمبر ملایا اور اگلے ہی لمحے نجمہ بیگم لائن پر موجود تھی۔ اس نوجوان نے نجمہ بیگم سے اپنا تعارف لندن کے چیکسی ڈرائیور کی حیثیت سے کرواتے ہوئے کہا تھا کہ اس کی مہمان دہن جو یہاں آئی ہیں ان کے میزبان فلائٹ لیٹ ہونے یا کسی اور سبب سے ابھی تک نہیں پہنچ سکے اور دونوں پریشان ہیں۔ آپ سے بات کرنا

چاہتی ہیں۔

یہی سکیم اس نے مختار اس کو سمجھائی تھی۔

فون اب مختار اس کے ہاتھ میں تھا۔

○

”سلام بیگم صاحبہ! ہم خیریت سے پہنچ گئے ہیں لیکن یہاں کوئی موجود نہیں۔ ہمیں تو کچھ پتہ نہیں کدھر جانا ہے۔ یہ نوجوان اپنے ملک کا رہنے والا لگتا ہے اور ٹیکسی بھی چلاتا ہے۔ ہم نے اس کا منت ترا کر کے فون کروایا ہے آپ اسے جگہ سمجھا دیں یہ ہمیں وہاں پہنچا دے گا۔“

مختار اس نے بڑی سادگی سے بات کی تھی۔ مقصد تو یہی تھا کہ ان لوگوں کو نجمہ بیگم کے اور اپنے درمیان تعلق کا یقین دلانے۔

نجمہ بیگم کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ ہو کیا رہا ہے کیونکہ ارسلان نے اسے بھی صاحب کا فون نمبر یا ایڈریس نہیں دیا تھا۔ بس اسے یہی بتایا تھا کہ بھٹی کے آدمی دونوں کو خود ہی وہاں ریسو کر لیں گے اور اسے اطلاع مل جائے گی کیونکہ ارسلان خود بھی شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ماں بیٹی کو رخصت کر کے اپنے کچھ کام نشتانے کا بہانہ کر کے وہاں دو تین روز مزید قیام کی گنجائش پہلے ہی سے نکال لی تھی اور چونکہ وہ اس شہر میں تھا ہی نہیں اس لئے مختار اس کو نجمہ بیگم ہی سے رابطہ کرنا تھا۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان لوگوں کو کیا جواب دیا جائے اور کیا سمجھائے؟ وہ چکر اکر ہی تو رہ گئی تھی۔

اس دھندے میں کبھی کسی نے اتنی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ تو نہیں کیا؟

لیکن.....!

یہ بھی تو ممکن ہے کہ فلائٹ لیٹ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ بروقت نہ پہنچے ہوں یا دوبارہ آنے میں دیر ہو جائے۔

نجانے کتنے خیال ایک لمحے میں اس کے دل و دماغ میں آئے اور گزر گئے۔

”تم گھبراؤ نہیں۔ یہیں انتظار کرو۔ وہ لوگ ابھی پہنچنے والے ہی ہوں گے۔ اگر وہ نہ بھی پہنچے تو میں کسی اور کو بھیج دوں گی۔ اور ہاں دیکھو ان بیگوں کا کسی سے ذکر تک نہ کرنا خصوصاً اگر

ٹیکسی ڈرائیور سے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ تم بالکل نہ گھبراتا۔ میں ابھی سارا بندوبست کرتی ہوں۔“ اس نے مختاراں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جی محترمہ کیا حکم ہے۔ میرے خیال سے آپ کے میزبان شاید آگے پیچھے ہو گئے ہیں۔ بہر حال میں آپ کا ہم وطن ہوں۔ آپ مطمئن رہیں۔ مجھے ایڈریس لکھا دیں میں خود انہیں وہاں تک پہنچا آؤں گا۔“ اس نے فون پکڑتے ہی کہا۔

”دیکھئے آپ کی بہت مہربانی لیکن میرے پاس اتفاق سے میزبانوں کا فون نمبر یا ایڈریس نہیں ہے۔ انہوں نے حال ہی میں مکان شیفلڈ سے تبدیل کیا ہے اور اب وہ لوگ لندن آگئے تھے۔“

”کمال ہے آپ نے اجنبی خواتین کو نامکمل تیاری سے بھیج دیا۔ یہ بیچاریاں کہاں جائیں گی؟ یہ تو بہت پریشان ہیں۔ آپ مجھے اپنے کسی عزیز کا ایڈریس دے دیجئے میں انہیں وہاں پہنچا دوں گا۔ وہاں سے پھر انہیں وہ لوگ آکر لے جائیں گے۔“

○

اچانک ہی مسز نجمہ کا ماتھا ٹھنکا۔! وہ بڑی کانیاں عورت تھی۔ اتنی باتیں کرنے کے بعد اسے یاد آیا کہ اس نے تو کبھی مختاراں کو اپنا فون نمبر نہیں دیا تھا۔ اس کی مختاراں کے ساتھ ساری زندگی میں بالمشافہ ملاقات ہی ایک ہوئی تھی وہ بھی ارسلان کے گھر۔

اور یہ کہ اس نے ارسلان کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دی تھی کہ وہ اس کا فون نمبر انہیں دے۔

پھر یہ کیا چکر ہے؟

”اودہ میرے خدایا۔!“ اس نے اچانک ہی اپنی بے وقوفی پر اپنا سر پیٹ لیا۔ ”دیکھو مسترم جو کوئی بھی ہو تمہارا شکریہ۔ میرا ان عورتوں سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ میرے ایک ملنے والے کی یہ واقف ہیں۔ شاید انہیں کہیں سے میرا فون نمبر مل گیا ہے اور انہوں نے مجھے فون کر دیا۔“

نجمہ بیگم نے پتیرہ بدلتا چاہا۔ فون کے تیسرے کنارے پر موجود آفیسر مسکرایا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گئے کہ اب یہ مچھلی چھننے والی نہیں ہے لیکن انہوں نے اپنے مطلب کی بات بہر حال جان لی تھی اور اب وہ اسے آگے تفتیش کا دائرہ بڑھا سکتے تھے۔

اچانک ہی نوجوان کا لہجہ بدل گیا۔

اب وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

”نجمہ بیگم صاحبہ! آپ جو کوئی بھی ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو ریکارڈ ہو چکی ہے جسے برٹش کراؤن کورٹ میں آپ کے خلاف بطور ثبوت پیش کیا جائے گا۔ ان عورتوں سے دو کلو ہیر وکن برآمد ہوئی ہے اور یہ آپ کو اپنی گینگ لیڈر بتاتی ہیں۔ آپ نے فون پر اس بات کا اقرار کر لیا ہے کہ آپ انہیں جانتی ہیں۔ آپ کو بیگم کا علم تھا اور آپ نے مزید احتیاط برتنے کی تلقین بھی کی ہے۔“

اس سے پہلے کہ وہ مزید گفتگو کرتے نجمہ بیگم نے فون بند کر دیا۔

نوجوان نے مسکراتے ہوئے آفیسر کی طرف دیکھا اور دوبارہ وہی نمبر ملایا۔ اس مرتبہ جب اس نے نجمہ بیگم سے بات کرنا چاہی تو اسے بتایا گیا کہ اس جگہ کوئی نجمہ بیگم نہیں رہتی۔ تین چار مرتبہ فون ملنے کے باوجود یہی بات دہرائی گئی جس سے انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

○

نجمہ بیگم کے ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا۔

اس کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی گہری سازش کے جال میں پھنس گئی ہے یا پھنسا دی گئی ہے۔

لیکن.....!

یہ سب کچھ کس نے کیا؟ کیوں کیا؟ کس کی یہ مجال تھی کہ وہ یوں ناگن کے بل میں ہاتھ ڈال دے؟

ارسلان!!

اس نے سوچا۔ ارسلان نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ اسے پھنسا یا۔۔۔۔۔ ارسلان نے اس لڑکے نے جو پالتو کتے کی طرح اس کے آگے پیچھے دم ہلایا کرتا تھا جس کو وہ جب بھی چاہے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دے۔

اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ ارسلان کبھی ایسی جرأت بھی کر سکتا ہے۔

لیکن.....!

یہ امر واقعہ تھا۔

برٹش نارکوٹکس کنٹرول ایجنسی نے اسے اپنے جال میں پھانس لیا تھا۔ محض ایک ٹیلی فون کال کے ذریعے انہوں نے نجمہ بیگم کے خلاف ثبوت حاصل کر لیا تھا۔

کچھ سوچتے ہوئے اس نے فون اٹھایا اور ارسلان کا نمبر گھمایا۔ غم و غصے سے اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔

فون ارسلان نے خود ہی اٹھایا تھا۔ نجمہ بیگم نے اپنی آواز کو نازل رکھتے ہوئے اسے فوری ملاقات کے لئے بلایا تھا۔

ارسلان سمجھ تو گیا۔

لیکن.....!

ابھی وہ اس عورت کی بے بسی کا بہت تماشا کرنا چاہتا تھا۔ وہ ذہنی طور پر اس بات کے لئے تیار تھا کہ اب کسی لمحے جب نجمہ بیگم پر قیامت ٹوٹے گی تو وہ اس کو کاٹ کھانے کو دوڑے گی۔

”خیریت.....؟“ اس نے مکمل انجان ہوتے ہوئے کہا۔

”غور! چلے آؤ۔ ضروری بات کرنی ہے۔ شوبرا ہوٹل والے آفس میں آ جانا۔“ کہہ کر نجمہ بیگم نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ایک زہریلی مسکراہٹ ارسلان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اس نے پستول اپنی جیکٹ میں چھپایا اور نجمہ بیگم کی طرف چل دیا۔ شوبرا ہوٹل میں نجمہ بیگم کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ شاید اس نے جان بوجھ کر اس دفتر کا انتخاب کیا تھا۔

”خیریت نجمہ بیگم..... آپ کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں۔“ اس نے کمرے میں داخل

ہوتے ہی نجمہ بیگم کی بے چینی کو محسوس کر کے دل ہی دل میں اس صورت حال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

”تمہیں کچھ علم نہیں؟ اب انجان بنے رہنے سے کیا فائدہ؟“ ”یہ کیا کمینگی کی ہے تم نے؟ احسان فراموش! ذلیل انسان تمہاری یہ ہمت..... تم.....“ نجمہ بیگم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ پھٹ پڑی۔ ”تم کیا سمجھتے ہو مجھے ان دو ٹکے کی طوائفوں کے ساتھ سملنگ کے دھندے میں ملوث کر سکو گے۔“ وہ ہانپنے لگی۔

”اوہو! تو یہ بات ہے۔ نجمہ بیگم مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟ اچھا شاید آپ کی دونوں زرخیز ملازمتیں جنہیں آپ نے ہیر وئن دے کر لندن روانہ کیا تھا گرفتار ہو چکی ہیں، لیکن اس میں گھبرانے یا مجھے گالیاں دینے والی کیا بات ہے؟“ ”یہ کیا گھٹیا حرکت ہے؟“ نجمہ بیگم نے اس کی مسکراہٹ پر چراغ پا ہو کر اس کی بات کاٹنے ہوئے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

”پارٹ آف دی گیم۔ اٹس پارٹ آف دی گیم نجمہ بیگم۔ دیکھئے ناں نجمہ بیگم۔ یہ بہت ضروری تھا۔ بھئی انسانی فطرت بھی عجیب ہے۔ ایک پل میں انسان جانے کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ کیا کر بیٹھے۔ اس کی سوچ کیا ہو جائے؟ نجمہ بیگم ماضی کے تلخ تجربات نے مجھے تو بہت حقیقت پسند اور احتیاط پسند بنا دیا ہے۔ آپ بہر حال سیاسی لوگ ہیں اور ظاہر ہے اب مجھے بھی اس میدان میں جھک مارنی ہے۔ جانے آپ کل کیا کر بیٹھیں۔ جیسے میرا کوئی اہم راز آپ کے پاس ہے اسی طرح آپ کی کوئی کمزوری بھی میرے پاس محفوظ ہونی چاہئے تھی تاکہ ہم ایک دوسرے کو یلٹیں کر سکیں۔ نجمہ بیگم! آپ کو تو بتانے کی ضرورت نہیں کہ انسان کمینگی کرنے پر آئے تو کتنا گر سکتا ہے۔ کیا کر گزرتا ہے۔ اب یہی دیکھ لیجئے ملک صاحب آپ کے مجازی خدا تھے۔ آپ کے حکم سے انہوں نے سرتابی نہیں کی تھی۔ آپ کی خاطر انہوں نے اپنی اولاد سے ناطہ توڑے رکھا لیکن آپ نے انہیں بھی معاف نہیں کیا۔ نجمہ بیگم! آپ جیسی پڑھی لکھی خاندانی، سوشل اور معزز خاتون اگر ایسی گھٹیا حرکت کر سکتی ہے تو میرے جیسا بد معاش، دو ٹکے کا لپا لفنگا جانے کیا کر گزرے۔ آپ کو اس بات کا احساس کرنا چاہئے تھا۔ نجمہ بیگم جنگ اور محبت میں کچھ ناجائز نہیں ہوتا۔ ہم دوست ہیں ایک دوسرے کے بزنس پارٹنر اور شاید ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے

ہیں۔ آپ نے اپنی محبت کا ثبوت میری تصاویر دکھا کر دے دیا تھا۔ مجھے استہمال کر کے میرے ذریعے ملک صاحب کے خلاف بلیک میلنگ سٹف حاصل کر کے دے دیا تھا۔ اب مجھے بھی تو موقعہ دیجئے ناں۔ یہ تو نا انصافی ہوئی نجمہ بیگم۔ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ تو مجھے پاؤں کی جوتی بنائے رکھیں اور میں نے اگر معمولی سا جواب دے دیا ہے تو آپ تمللا اٹھی ہیں۔“

نجمہ بیگم کے خون میں انگارے تڑپنے لگے تھے۔

○

اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس موذی کا ٹینٹو ادا دے۔ ارسلان نے وہ ساری تقریر معمولی ترمیم اور اضافے کے ساتھ دہرا دی تھی جو کبھی اس نے اسی طرح اس کی بے بسی کا تسخیر اڑاتے ہوئے اس کے سامنے کی تھی۔ ظالم نے شاید سارے کہے ہوئے فقرے اپنے ذہن میں جانے کب سے اس وقت کے لئے محفوظ کر رکھے تھے۔

بہت گہرا اور کیا تھا اس نے۔

بڑے ٹھنڈے دماغ کے ساتھ بڑے سلیقے سے اس کے دل میں زہریلا خنجر گھونپا تھا

ارسلان نے.....!

اپنی انگارہ آنکھوں اور کانپتے ہونٹوں سے وہ اس کا منہ دیکھتی رہی۔

”اور نجمہ بیگم دیکھو ناں اب تم ریاست شاہ سے شادی کرنے جا رہی ہو۔ وہ کوئی معمولی آدمی تو نہیں ہے۔ بھئی کیا پتہ جب کل تم اس کی بیوی بن جاؤ تو کہیں میرا پتہ مستقل ہی صاف نہ کروادو۔ تم نے مجھے عام حالات میں معاف نہیں کیا۔ جانے ان حالات میں کیا کرگزرو۔ میرے بزنس کا تقاضا ہے کہ تمہاری شادی ریاست شاہ سے نہ ہونے پائے۔ دیکھو! جان من ملک صاحب کی اور بات تھی۔ وہ دوسری قسم کے ٹھنڈے دل و دماغ والے لوگ ہیں۔ ان کے لئے کسی بھی آدمی کو مار دینا چوٹی کو مسل دینے جتنی اہمیت نہیں رکھتا۔ نجمہ بیگم تم نے مجھے عام حالات میں معاف نہیں کیا، خصوصی حالات میں تو مجھے جان سے ہی مار ڈالو گی..... اب کم از کم تمہاری گرفتاری کے بعد ریاست شاہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی تو کرے گا..... اور ہاں میری تم سے درخواست ہے کہ میری جو تصاویر تم نے ایمسنر ڈم پر بنوائی تھیں..... مشہور زمانہ سمگلر جیفری ہاؤ کے ساتھ وہ ضرور پولیس کو پہنچا دینا۔ مجھے تمہارے کیس میں تمہارا ساتھ بننے پر بہت خوشی ہوگی..... اسٹھ موج میلہ کرتے رہے

ہیں تو جیل بھی مل کر کاٹیں گے۔ پھر یہ سلسلہ یہاں ہی کیوں رکے۔ ظاہر ہے میں پولیس کو بتاؤں گا کہ یہ تصویر کب کی ہے؟ کس موقعے کی ہے اور اس کا سیاق و سباق کیا ہے؟ تم سمجھ رہی ہو ناں نجمہ بیگم۔ بھی سجاد خان بھی آخر فارغ کیوں بیٹھے اور پھر وہی کیوں ملک صاحب بھی کیوں نہیں۔ آخر دونوں طوائفوں کی برہنہ تصاویر ان کے ساتھ بھی تو ہیں جن میں سے کچھ تم تحفتاً مجھے عنایت فرما چکی ہو۔ اس طرح بین الاقوامی نوعیت کی خبر تو بنے گی۔ میں بھی دو کوڑی کا تیسرے درجے کا سیاسی غنڈہ کم از کم آپ کے برابر عدالت میں تو کھڑا نظر آؤں گا..... اور ہاں نجمہ بیگم تمہارے لئے ایک تصاویر کا پیکٹ میں اپنے ساتھ لایا ہوں..... اس کے بعد امید ہے تم دونوں طوائفوں کو پہچانے سے انکار نہیں کرو گی۔“

اس نے جیکٹ کی جیب سے تصاویر کا پیکٹ نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا۔

نجمہ بیگم نے بے چینی سے لپک کر تصاویر کا پیکٹ اٹھایا اور جیسے جیسے اسے دیکھتی جا رہی تھی، دنیا اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیر ہو رہی تھی۔ جتنی بے تکلفی سے یہ تصاویر مختاراں اور نازنین کے ساتھ بنائی گئی تھیں اس کے بعد دنیا کی کسی عدالت میں وہ یہ بات ثابت نہیں کر سکتی تھی کہ اس کا ان دونوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ان تصاویر کو دیکھ کر دنیا کا کوئی باریک بین شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ یہ نجمہ بیگم کو لاعلم رکھ کر بنائی گئی ہیں۔

”کتنے، کتنے، ذلیل، پاجی، حرام خور.....!“ وہ دیوانہ وار ارسلان کو گالیاں دے رہی تھی۔

اور ارسلان اس کی ہر گالی پر ایک سکون، ایک طمانیت اور ایک بے نام سے کیف و سرور میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

نجمہ بیگم شاید پاگل ہو گئی تھی۔ اس نے ارسلان کو ہنستے دیکھ کر اسے نگلی گالیاں دینا شروع کر دی تھیں پھر اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ ارسلان سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔ میں برباد کروں گی تمہیں۔“

اس نے گالیاں بکتے ہوئے ارسلان سے کہا اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

ارسلان دیوانہ وار قہقہے لگا کر اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے بری

طرح جکڑ دیا تھا اس حرافہ کو..... اپنا انتقام اس نے بہت گھناؤنا لیا تھا.....! پارانگ ایریا میں پہنچنے تک نجمہ بیگم نے خود کو نائل کر لیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ بری طرح پھنس چکی ہے۔

لیکن.....!

یہ وحشت جو اس پر سوار ہو گئی تھی یہ تو اسے مار ڈالے گی۔ اس نے سوچا۔ اپنے حواس پر اس نے قابو پالیا اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ یہ پتا جو اسے اکیلے دیکھ کر ارسلان نے اس پر ڈھاکا ہے۔ یہ ہر جو اس نے اٹھایا ہے تو اس کا کوئی تریاق بھی ضرور ہوگا۔

اس نتیجے پر تو وہ فوراً پہنچ گئی کہ اس کو فوری طور پر ایک مضبوط ڈھال حاصل کرنی ہے۔

ملک صاحب جیسا کوئی آبرو تلاش کرنا اس کے لئے ضروری تھا۔

یہی سوچ کر وہ گھر جانے کی بجائے ریاست شاہ کی محل نما کوٹھی کی طرف جارہی تھی۔

اس کی عدت کے ایام پورے ہو چکے تھے۔ ریاست شاہ اب تک متعدد مرتبہ اس سے شادی کا تقاضا کر چکا تھا۔ اگلے الیکشن میں وہ اپنی ہونہار اور تجربہ کار سیاستدان بیوی کے ساتھ میدان میں قدم رکھنا چاہتا تھا۔

کسی بھی لمحے الیکشن شیڈول اناؤنس ہو سکتا تھا۔

کسی بھی لمحے.....!

اور نجمہ بیگم شادی کے بغیر ہی معاملات چلانے پر بضد تھی۔ اس نے پہلے سے زیادہ ریاست شاہ کی راتیں رنگین کرنا شروع کر دی تھیں، لیکن ریاست شاہ کا اپنا سوچنے کا انداز تھا۔ جب اچانک ریاست شاہ کو اس کی آمد کی اطلاع ملی تو ایک لمحے کے لئے وہ گڑبڑا کر

ہی رہ گیا۔

”خیریت.....!“ اس نے ڈرائنگ روم میں اپنی منتظر نجمہ بیگم کو دیکھ کر ہونٹوں پر زبان

پھیری۔

نجمہ بیگم نے مکمل تیاری کے ساتھ حملہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے کار میں بیٹھے بیٹھے اپنا میک اپ درست کر کے تمام ناز و انداز کے ساتھ یہاں قدم رکھا تھا۔

”شاہ جی! مجھے آج اور اسی وقت آپ سے نکاح پڑھوانا ہے..... میں ساری رات نہیں

سو پائی شاہ جی۔“ اس نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔

ریاست شاہ نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے اس کو تسلی دی۔ اس کی تو خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس اچانک فیصلے نے اس کے تو ہاتھ پاؤں پھلا دیئے تھے۔

”نجمہ بیگم اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟ جیسے تم حکم کرو دیسا ہی ہوگی۔ تم اندازہ نہیں کر سکتی میرے دل کی حالت کا۔ کل ہمارا نکاح ہو جائے گا۔“

”نہیں شاہ جی! خدا کے لئے ابھی بندوبست کیجئے۔ اب میں آپ کی بیوی بن کر اس گھر سے باہر نکلوں گی۔ مجھے ایک خواب نے بہت پریشان کیا ہے۔ شاہ جی خدا را میری بات مان لیجئے۔“

بالا خرد دو تین مرتبہ اسے سمجھانے کے بعد ریاست شاہ کو اس کی بچگانہ ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

اس نے نجمہ بیگم کی اس ضد کو محبوب کی ادا سمجھا تھا اور اپنے محبوب کی خوشنودی کا حصول ہی اس کا مطمح نظر تھا۔

رات گئے تک دونوں ایک سادہ سی تقریب میں نکاح کے بندھن میں بندھ گئے۔ نجمہ بیگم کی خواہش تھی کہ اس خبر کو فی الوقت پوشیدہ رکھا جائے۔ وہ کسی اچھے وقت پر اس کا باقاعدہ اعلان کرنے کے حق میں تھی۔

ریاست شاہ نے اس کی یہ بات بھی تسلیم کر لی تھی اور اپنے خاص لوگوں کو ہی اس کا گواہ بنایا تھا۔ نجمہ کے گھر والوں، نکاح کے گواہوں اور نکاح خواں کے علاوہ اور کسی کو اس رشتے کا علم نہیں تھا۔

نجمہ بیگم نے اپنی والدہ اور گھر والوں کو خاص طور سے سمجھا دیا تا کہ وہ کسی کو بھی اس واقعے کی ہوا نہ لگنے دیں اور یہی کہا جائے کہ وہ کسی کام سے شہر سے باہر گئی ہوئی ہے۔

رات اس نے اپنے خاوند ریاست شاہ کے محل نما قلعے میں بسر کی اور اگلے روز دوپہر کی فلائٹ سے وہ ہنرمون منانے پہاڑی علاقے کی طرف محو پرواز تھے۔

رواگی سے پہلے نجمہ بیگم نے اپنی ایک رازدار صحافی دوست کو فون کیا تھا۔ شاید اس نے اپنی اس خاص دوست کو جو مقامی اخبار کی صفحہ خواتین کی انچارج تھی، پہلے سے اس منصوبے کا حصہ

بنارکھا تھا کیونکہ ان لوگوں کی روانگی کے اگلے ہی روز اخبارات میں یہ خبر نمایاں تھی کہ مشہور سماجی راہنما محترمہ نجمہ بیگم ممبر اسمبلی سید ریاست شاہ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو چکی ہیں اور یہ شاید ایک ماہ پہلے انجام پائی تھی۔ اب دونوں ہنی مون منانے شہر سے باہر نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔

نجمہ بیگم نے اپنے انداز سے اپنی شادی کی خبر کو استعمال کر لیا تھا۔ اس نے آنے والے وقت کی ابھی پیش بندی کر لی تھی۔

ارسلان نے اس پر جو گہرا وار کیا تھا اس کے بعد سے نجمہ بیگم کی حالت تملنائی ہوئی ناگن جیسی ہو رہی تھی۔

اس کے اندر موجود ساری شیطانیت بیدار ہو چکی تھی۔

اور وہ جلد از جلد بہت کچھ کر گزرتا چاہتی تھی۔

○

عجیب حسن اتفاق تھا.....!

جس روز نجمہ بیگم اور ریاست شاہ کی شادی کی خبر شائع ہوئی تھی اسی روز ممبر سینٹ اور بھنڈر کی مطلقہ ذکیہ بیگم اور ممتاز سیاست دان ملک صاحب کی طرف سے ایک چھوٹا سا بیان اخبارات کو جاری کر دیا گیا تھا جس میں اخبار نویسوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ ان کے متعلق غلط اندازے نہ لگائیں۔ دونوں نے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

لیکن.....!

جب وہ شادی کریں گے تو اپنے اخبار نویس دوستوں کو ضرور مدعو کریں گے۔

بھنڈر کا خون کھول اٹھا تھا۔

اس کی خاندانی غیرت کو لالکا را گیا تھا۔

اس خاندان میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ ان کی طلاق یافتہ عورتیں دوبارہ شادی کر

لیں۔

اور عورت بھی وہ جو بھنڈر کی سابقہ منکوحہ تھی۔

”ملک تم نے بالآخر مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب معاملہ غیرت کا آ گیا ہے ملک! اب

تم بچ نہیں سکو گے۔“

وہ دانت پیتا رہ گیا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ بھنڈر نے فون اٹھایا اور حیران رہ گیا۔ دوسری طرف سے ارسلان مخاطب تھا۔

”بھنڈر صاحب بہت مدت کے بعد مجھے اپنے پرانے قرض چکانے کا موقع ملا ہے۔ میں آپ کو ایسی چیز دے سکتا ہوں جس سے آپ ملک صاحب کو برباد کر کے رکھ دیں گے۔ بھنڈر صاحب! میں گھر کا بھیدی ہوں اور لٹکا کا بھید مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ اگر آپ تیار ہیں تو میں ایک گھنٹے بعد فون کر کے ملاقات کی جگہ کا تعین کر لوں گا۔ آپ جانتے ہیں ملک میرے تعاقب میں ہے اور میں کتے کی موت مرنا نہیں چاہتا۔ آپ سوچ لیجئے۔ پھر ہم ملاقات کر لیں گے۔ خدا حافظ۔“

اس سے پہلے بد قسمتی سے اس کی ہر چال الٹی ہی پڑتی آئی تھی اور دودھ کا جلاب وہ چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پینا چاہتا تھا۔ وہ انتقام کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ ملک کو ہر قیمت پر اس نے ختم کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن وہ سانپ کے بل میں اس مرتبہ ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچنا چاہتا تھا۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ ارسلان کا آج کل ملک سے کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ اس کی سابقہ بیوی کا سیکرٹری بنا ہوا ہے اور ملک سے کئی کترار ہا ہے تو اس نے ملاقات کا فیصلہ کر لیا۔

اگلے فون پر دونوں نے ایک جگہ کا انتخاب کر لیا تھا۔ بھنڈر ملاقات کرنے اکیلا نہیں گیا تھا۔ اپنے باڈی گارڈ کو ساتھ لے گیا تھا۔ البتہ احتیاطاً اس نے گاڑی کسی دوست کی استعمال کی تھی اور اپنی شناخت چھپا کر شہر سے باہر اس ڈاک بنگلے پر پہنچا تھا جہاں ارسلان نے اسے بلایا تھا۔

دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے.....!

”بھنڈر صاحب! میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ سیدھی سادی، ایک ”برنس

ڈیل“ ہے۔ ملک ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہے اور میں نے اپنی محرمیوں کا قرض چکانا ہے۔

میرے سامنے صرف آپ کی شخصیت ہی ایسی ہے جو ملک سے ٹکرانے کے لئے موزوں ہے۔

آپ کو شاید اس بات کا علم نہیں کہ صوبائی لیگ سے ملک صاحب نے آپ کا پیہ کٹوا دیا ہے اور کل

اس کا اعلان ایک ایمر جنسی پریس کانفرنس میں کر دیا جائے گا..... اندازہ کیجئے۔ یہ کتنا خطرناک آدمی

ہے جو ایک پارٹی کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ بھنڈر صاحب جو ہتھیار ملک کو ختم کر سکتا ہے وہ صرف میرے پاس ہے۔

اس نے بھنڈر کو نجمہ بیگم اور اس کا مال لے جانے والی طوائفوں کی کہانی اور لندن میں گرفتاری کے واقعات سنانے کے بعد ان کی تصدیق کرنے کے لئے ٹیلی فون نمبر بھی دے دیا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ بھنڈر خود بھی اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔

”برٹش انٹیلی جنس کو اس بات کا دستاویزی ثبوت آپ کے خادم کے ذریعے مل چکا ہے کہ نجمہ بیگم اس گینگ کی لیڈر ہے جس کی دو عورتیں پہلے ہی گرفتار ہو چکی ہیں۔ وہ جس روز ہنری مون سے واپس لوٹے، جھٹکڑیاں پکڑے انٹر پول کی پولیس اس کی منتظر ہوگی۔ اس نے ہنگامی شادی اس عذاب سے بچنے کے لئے کی ہے لیکن بھنڈر صاحب کمال کی بات تو یہ ہے کہ ملک صاحب بھی اس گروہ کے سرکردہ ممبر ہیں۔ گرفتار ہونے والی طوائف کے ساتھ ان کی بخش تصاویر میرے پاس موجود ہیں۔ ان تصاویر کی خبر جہاں ملک صاحب کو ساری زندگی کے لئے جیل میں پہنچا دے گی وہاں ان کا سیاسی کیریئر بھی تباہ ہو جائے گا۔ ممکن ہے بعد میں وہ جیل سے رہا ہو جائیں لیکن سیاست سے ان کا جنازہ اٹھ جائے گا اور ہاں سب سے بڑھ کر یہ بات کہ پھر ذکیہ بیگم ایسے ذلیل اور مجرمانہ ذہنیت کے حامل شخص کے ساتھ شادی کرنے کا خطرہ مول نہیں لے گی۔ اب بھنڈر صاحب آپ نے دونوں باتوں کی تصدیق کرنی ہے۔ ایک تو اس خبر کی کہ لندن میں کیا حادثہ گزرا ہے اور دوسری آپ کے صوبائی لیگ سے اخراج کی۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ کل تک آپ کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ نجمہ بیگم کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں۔ انٹر پول نے اس کی گرفتاری میں حائل تمام مشکلات حل کر لی ہیں۔ اگر آپ نجمہ بیگم اور ملک صاحب والی تصاویر خریدنے میں دلچسپی رکھیں تو کل دو لاکھ روپیہ کیش لے کر یہاں آجائیں۔ میری زندگی کی یہ وہ کمائی ہوگی جو اپنے ہمراہ لے کر میں روپوش ہو جاؤں گا اور پھر باقی زندگی کے دن گمنامی میں گزار لوں گا۔ اس وقت مجھے یہی کہنا تھا۔ اب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ.....!“

بھنڈر ہونٹوں کی طرح اس کا منہ دیکھتا رہ گیا اور وہ اس کی آنکھوں کے سامنے دور ہوتا

چلا گیا۔



زمین اور ماں

اگلے روز کے اخبارات کی سب سے دھماکہ خیز خبر ملک میں الیکشن کے انعقاد کا اعلان

تھا۔

تین ماہ بعد الیکشن منعقد کئے جا رہے تھے اور مرکزی کابینہ تو ذکر نگران کابینہ تشکیل دے

دی گئی تھی۔

صوبائی لیگ کے لوگ جانتے تھے کہ اس سے بہترین فضا مرکزی پارٹی کو الیکشن جیتنے

کے لئے پھر کب میسر آ سکتی تھی کیونکہ حالات ہر طرح سے ان کے خلاف تھے۔

پارٹی کے سیانوں نے عوام میں پارٹی کی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لئے بادل خواستہ

پارٹی کو ناپاک عناصر سے پاک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جس کا اعلان کرنے کے لئے دوپہر کو ہنگامی

پریس کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ سارے شہر میں اس کانفرنس کے متوقع اہم اعلان پر بحث جاری

تھی۔

دوپہر تک سسپنس برقرار رہا پھر ٹوٹ گیا۔ جب پارٹی کے صدر صاحب نے پریس

کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بھنڈر صاحب اور ان کے چار ساتھیوں کی پارٹی رکنیت ختم

کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے بھنڈر گروپ کی زیادتیوں کی وجہ سے پارٹی

چھوڑ کر جانے والوں سے اپیل کی کہ وہ وسیع تر ملکی مفاد کے لئے پارٹی میں واپس آجائیں۔ ان پر

پارٹی کے دروازے ہمیشہ کے لئے کھلے رہیں گے۔

جاننے والے جانتے تھے کہ اشارہ ملک صاحب کی طرف ہے۔ بھنڈر گروپ پریس کانفرنس

میں بنفس نفیس موجود نہیں تھا، لیکن اس کے ساتھی بل بل کی خبر اسے پہنچا رہے تھے۔

جس طرح کھلے بندوں اس کی بے عزتی کی گئی تھی اور اسے پارٹی سے نکالا گیا تھا، اس

حرکت نے اس کی آتش انتقام کو دو چند کر دیا۔ سہ پہر تک لندن والی کہانی کی تصدیق بھی ہو گئی۔

اب بھنڈر انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

اس نے آج ہی ارسلان کو منہ مانگی قیمت دے کر تصاویر خریدنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ اگلے روز ان تصاویر کے ساتھ پریس کانفرنس کر کے عوام کو بتانا چاہتا تھا کہ ان شریف اور معزز ممبران کی اصلیت کیا ہے جنہوں نے بھنڈر کے غلط سلوک کی وجہ سے پارٹی چھوڑی اور جنہیں صوبائی لیگ والے واپسی کی دعوت دے رہے ہیں ان کے کروت کیا ہیں؟

اس کا نتیجہ جو بھی نکلتا وہ اس کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

اس نے ملک کو ہر صورت تباہ کرنا تھا اور اس پارٹی کو بھی جس نے اس کی سیاسی ساکھ کو کوڑیوں کے مول بازار صحافت میں نیلام کر دیا تھا۔ اسے بھرے بازار میں بنگا کیا گیا تھا پھر وہ چپ کیوں رہتا؟

غصے سے اس کے ہاتھ کی انگلی کانپ رہی تھی۔ جب اس نے ارسلان کے مہیا کردہ ٹیلی فون نمبر پر اس کے لئے رات 8 بجے ملاقات کا پیغام چھوڑا۔

بھنڈر نے چپ چاپ بریف کیس اس کے حوالے کر دیا اور جواب میں تصاویر کا پیکٹ اسے ارسلان نے تمھایا تھا۔ ان کو دیکھ کر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

بہت سستا سودا کیا تھا اس نے۔

ان میں سے تو ایک ایک تصویر کی قیمت دولا کر روپے تھی۔

”شکریہ دوست۔“ بھنڈر نے پیکٹ واسکٹ کی جیب میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

”بھنڈر صاحب میں کمزور آدمی ہوں۔ اس عفریت کا مقابلہ نہیں کر سکتا جس کا نام ملک صاحب ہے، لیکن میں نے آپ کے ہاتھ میں وہ ٹائم بم تمھارا دیا ہے جو پھٹے گا تو ملک قصہ پارینہ بن کر رہ جائے گا۔۔۔۔۔ مجھے انسوس ہے کہ میں اس کی قیمت وصول کر رہا ہوں، لیکن میں غریب آدمی ہوں مجبور ہوں۔ مجھے اس دنیا کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنا ہے اور نئی زندگی وسائل کے بغیر گزارنا مشکل ہے۔“ ارسلان نے بڑے دکھی لہجے میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔

”ارسلان! میرے دروازے تمھارے لئے ہمیشہ کھلے ہیں۔ جب لوٹنا چاہو مجھے اپنا منتظر پاؤ گے۔۔۔۔۔!“ بھنڈر نے کاری طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں بھنڈر صاحب! بس اسے آخری ملاقات ہی سمجھیں۔ میں بھر پایا۔ بہت تلخ تجربات لے کر جا رہا ہوں۔ خدا آپ کو کامیابی نصیب کرے۔ خدا حافظ۔۔۔۔۔!“

صبح کے اخبارات جس کہانی کے ساتھ شائع ہوئے تھے اس نے عوام کو چونکا کے رکھ دیا

انٹرپول پولیس نے مقامی پولیس کی مدد سے مرکزی لیگ کے ممتاز سیاست دان کی سابقہ بیوی مسز نجمہ ریاست شاہ کو ملک کے ایک پہاڑی مقام کے ایئرپورٹ سے عین ان لمحات میں گرفتار کر لیا تھا جب وہ جہاز میں اپنے خاوند اسمبلی ممبر سید ریاست علی شاہ کے ساتھ سوار ہونے جا رہی تھی۔ ملزمہ کی وہ ملازم ساتھی عورتیں جن کا تعلق بازار حسن سے تھا، اس کے مال سمیت لندن میں گرفتار ہو چکی تھیں اور انٹرپول کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ ملزمہ طویل عرصے سے یہ گھناؤنا کاروبار چلا رہی ہے۔ اس نے اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور ملک کے لئے رسوائی کا باعث بنی تھی۔

ملزمہ کے موجودہ خاوند سید ریاست علی نے بتایا کہ وہ نجمہ بیگم کے ماضی سے قطعی لاتعلق تھا اور ان کی شادی چند روز پیشتر ہی ہوئی تھی۔ اسے اب بھی اس بات کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی بیوی کا تعلق ڈرگ مافیا سے ہے۔

ملزمہ کے سابقہ خاوند ملک صاحب نے اس پر تبصرہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ان دونوں میں علیحدگی ہو چکی ہے، لیکن وہ اپنی ازدواجی زندگی کے دوران ان کے علم میں کوئی ایسی بات نہیں رہی۔

اس خبر کی اشاعت پر دنیا میں سب سے زیادہ مسرور شخص بھنڈر تھا۔

یہ خبر اس کے لئے عطیہ خداوندی تھی۔۔۔۔۔!

قدرت نے اس کا راستہ خود سے آسان کر دیا تھا۔ اب وہ اپنی مرضی کے میدان میں شکار کھیل سکتا تھا۔

کامیابی نے بڑھ کر اس کے قدم چوم لئے تھے۔

بھنڈر کے آدمیوں نے ملک کے ہر مقتدر اخبار کے رپورٹر کو اس پریس کانفرنس میں اکٹھا کیا تھا جہاں بھنڈر صاحب چونکا دینے والے حقائق کا انکشاف کرنے جا رہے تھے اور کچھ انقلابی فیصلے بھی۔

بھنڈر اپنے تین مسلح باڈی گارڈوں کے ساتھ پریس کلب میں پہنچا تو وہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ اخبار نویسوں سے دو گنی تعداد میں پارٹی ورکرز یہاں پہنچ چکے تھے۔

بھنڈر صاحب نے سب سے پہلے پارٹی کے کل کے فیصلے کو رد کرتے ہوئے فارورڈ بلاک کے قیام کا اعلان کیا جس کا پہلے سے وہاں موجود اس کے زرخیز چچوں نے زبردست تالیاں

”حضرات! اب میں آپ کو اپنے اس جرم کے دستاویزی اور عکسی ثبوت دینے جا رہا ہوں جس کی بنا پر پارٹی میں موجود سماج اور ملک دشمن عناصر میرے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ کیونکہ میں ان زیادتیوں کے خلاف احتجاج کرتا رہتا تھا جو ان کی طبع نازک پر گراں گزرتا تھا۔ آپ نے آج ملک صاحب کی سابقہ بیگم کے کر تو ت اخبارات میں ملاحظہ فرمائے ہوں گے۔ یہ وہی ملک صاحب ہیں جن کو ہماری پارٹی کے صدر صاحب واپس تشریف لانے کی دعوت دے رہے ہیں۔

حضرات! ملک صاحب نے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنی سابقہ چھٹی بیگم صاحبہ کے کالے کر تو ت سے قطعی لاعلم تھے۔ خدا کی پناہ یہ اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ ڈرگ مافیا کا سب سے بڑا کرتا دھرتا یہی ملک صاحب ہے۔“

اتنا کہہ کر اس نے تصاویر کا بنڈل اپنے ایک ساتھی کو دیا جس نے اخبار نویسوں میں تصاویر بانٹنی شروع کر دیں۔

ان تصاویر نے پریس کانفرنس پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔

اچانک بھنڈر کی گونجدار آواز سنائی دی۔

”محترم اخبار نویس بھائیو! آپ ان تصاویر کے تمام کرداروں کو پہچانتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی تصویر جعلی یا فوٹو گرافر کا کمال ثابت ہو جائے تو مجھے اس شہر کے چوراہے میں پھانسی پر لٹکا دیجئے۔ بصورت دیگر ان مجرموں کو عدالت میں لائیے جو آپ کے راہنما بنے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنی جان پر کھیل کر ان کے کالے چہروں سے نقاب اٹھا دیئے ہیں۔ اب فیصلہ آپ کریں کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون؟“

بھنڈر صاحب کی پریس کانفرنس نے سنسنی پھیلادی تھی۔

ملک صاحب کے پروردہ رپورٹر خبر اور تصاویر لے کر اڑتے ہوئے سیدھے ان کے حضور پہنچے تھے۔

نجمہ کی گرفتاری نے پہلے ہی ملک صاحب کے اعصاب توڑے ہوئے تھے اور انہوں نے بشکل خود کو سنبھالا دیا تھا کہ یہ نئی پٹا آن پڑی۔

تصاویر دیکھ کر ایک لمحے کے لئے تو ملک صاحب مبہوت ہو کر ہی رہ گئے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

مصائب کے سنگلاخ پہاڑوں کو عبور کیا تھا انہوں نے۔

لیکن.....!

یہ عجیب صورت حال تھی۔

اس بری طرح وہ ڈریپ ہو گئے تھے کہ اب بچنے کی کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی۔

نازنین کے ساتھ ان کی بیہودہ تصاویر۔

نازنین کا لندن میں ہیروئن سمیت گرفتار ہونا۔

نجمہ بیگم ان کی سابقہ زوجہ محترمہ کو بین الاقوامی پولیس نے نازنین کی گینگ لیڈر ہونے کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔

اب وہ کس طرح اس الزام سے بچ پاتے۔

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... کہ بادی النظر میں انہیں بھی اس ڈرگ مافیا کا رکن نہ سمجھا جاتا جس کی سربراہ ان کی سابقہ بیوی تھی۔

اور اگر وہ اس الزام سے بچ بھی رہتے تو نازنین کے ساتھ ان کی تصاویر کا ذکر پریس میں آنے سے کوئی عقل کا اندھا ہی انہیں ووٹ ڈالتا۔

ان کی کردار کشی کس بری طرح کی گئی تھی۔

”ملک صاحب آپ کا سیاسی بوریا بستر گول.....!“ کسی نادیدہ طاقت نے ان کے ذہن میں سرگوشی کی۔

اور سب سے بڑھ کر اب یہ کہ ذکیہ بیگم شاید اس کا نام سننا بھی گوارا نہ کرے۔ ایک

رسوائے زمانہ شخص خواہ اس کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبے سے رہا ہو..... اس معاشرے میں خواہ یہ

کیسا ہی گیا گزرہ معاشرہ کیوں نہ بن جائے ناقابل معافی ہے۔“

”بھنڈر!“ ملک صاحب نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”تیری یہ مجال! میں تیری بوٹیاں

کتوں کے سامنے پھینکوا دوں گا۔“

غصے اور احساس ندامت سے ان کو اپنے دماغ کی رگیں پھٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔

ان کے نمک خوار اخبار نویسوں نے پیشگی معذرت کر لی تھی۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ

جناب والا اگر ہم یہ سکیڈل روک بھی لیں تو کیا ہوا؟ کوئی دوسرا اخبار اسے شائع کر دے گا اس ملک

میں کوئی دو حارا اخبار ہی تو نہیں چھپتے۔

”میں دیکھتا ہوں کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔
اب تک تین چار گولیاں اس نے اپنے دل و دماغ کو قابو رکھنے کے لئے زہر مار کر لی تھیں۔
کچھ سوچتے ہوئے اس نے ایک فون نمبر ملایا اور وہاں موجود شخص کو اپنے پہنچنے کی اطلاع دے کر فون بند کر دیا۔
تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنی نئی کار میں اس طرف جا رہے تھے جہاں انہوں نے فون کیا تھا۔

○

یہ شہر کی ماڈرن آبادی کا ایک خاموش بونہ تھا جہاں ایک سریف ملک عمارت کے سامنے پہنچ کر ملک صاحب کے ڈرائیور نے گاڑی روک لی۔ شاید کسی نے اندر سے انہیں دیکھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔ گاڑی برآمدے کے سامنے رکی تھی۔

ملک صاحب کا استقبال ان کے لئے ایک ”آف دی ریکارڈ“ دوست نے کیا۔!

یہ چوہدری صاحب تھے۔!

چوہدری صاحب کا شمار ملک کے ان گنے چنے سرمایہ داروں میں ہوتا تھا جو سیاسی پارٹیوں پر انویسٹمنٹ کیا کرتے تھے۔

ایک لگا کر دس کمانے والے چوہدری صاحب نے ملک صاحب کو پریشان دیکھا تو ان سے کئی گنا زیادہ پریشان نظر آنے کی اداکاری کرنے لگا۔

”نوید کو فوراً بلائیے۔“ ملک صاحب نے ایک خصوصی آرام دہ کمرے میں داخل ہوتے ہی چوہدری صاحب سے کہا۔

نوید اسی گھر میں چھپا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے دو ساتھیوں سمیت وہاں موجود تھا۔

چوہدری صاحب ان کے لئے چائے پانی کا بندوبست کرنے چلے گئے جب کہ ملک صاحب نے ان تینوں سے خیر خیریت دریافت کرنا شروع کر دی تھی۔

”نوید میرے پاس وقت کم ہے۔ اب حق نمک ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ میں نے

”اوپر والوں“ سے اجازت لے لی ہے بلکہ یوں سمجھو کہ سودے بازی کر لی ہے۔ تم مانتے ہو کہ

مرکزی پارٹی نے یہ الیکشن بہر صورت جیتنا ہے۔ اس حلقے سے ہمارے صدر صاحب کے کاغذات

بھی تھکانا نظر آ رہے ہیں۔ اس لئے میں نے تم کو مطلع کر دیا ہے۔

اسمبلی ممبر بن کر بچوں پر بیٹھو گے۔۔۔۔۔ یہ طے شدہ بات ہے جس کا ثبوت تمہیں جلد ہی مل جائے گا۔۔۔۔۔ نوید! میں اپنے دوستوں کا اتنا ہی دوست ہوں جتنا اپنے دشمنوں کا دشمن۔ میں اپنے دوست اور دشمن دونوں کا آخری سرحد تک ساتھ دیتا ہوں۔ ہمیں یہ سیٹ اور تمہاری تمام مقدمات سے رہائی کی کچھ قیمت ادا کرنی ہے۔ میں آج رات یا کل صبح تک جیل پہنچ جاؤں گا۔ اگلے دو روز کے اندر اندر تم بھنڈر اور ارسلان کو مار ڈالو۔ جس طرح بھی ممکن ہو۔ خواہ اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے۔ میں جانتا ہوں ارسلان آج کل غائب ہے لیکن وہ تمہاری نظروں سے چھپ نہیں سکتا۔ اس نے میری پیٹھ میں خنجر گھونپا ہے۔ آستین کا سانپ ثابت ہوا ہے وہ لونڈا۔ تم جانتے ہو میں نے اس حرامی کو۔۔۔۔۔ اس زمین پر ریگنے والے کیڑے کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچایا اور اس نے۔۔۔۔۔ اور اس نے مجھ ہی کو ڈس لیا۔۔۔۔۔ مار ڈالو۔۔۔۔۔ اسے ہر صورت میں ڈھونڈ کر مار ڈالو اور دیکھو اسے آسان موت نہ مارنا۔ کتے کی موت مارنا اسے۔۔۔۔۔ سسکا سسکا کر۔۔۔۔۔ بھنڈر کو البتہ رعایت دے دینا۔ بوڑھا آدمی ہے بے چارہ۔۔۔۔۔!“ ملک اور اس کے ہمراہیوں کے قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے تھے۔

ایک مؤدب ملازم ”چائے پانی“ گھسیٹتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔

ایک ٹرائی میں چائے کم اور ”پانی“ زیادہ تھا۔

چاروں اس ”پانی“ پر نیدے کتوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔

ملک نے ایک کونے میں رکھے انٹرکام پر چوہدری صاحب سے بات کی اور تھوڑی دیر میں ایک بریف کیس ان تک پہنچ گیا۔

”دولاکھ روپے ہیں یہ۔۔۔۔۔ ابتدائی اخراجات۔ پانی کی طرح پیسہ بہا دو لیکن دونوں میں سے کوئی بچ کر نہ جانے پائے۔“ اس نے بریف کیس کھول کر نوید کے سامنے کر دیا۔

”ملک جی! ہم آپ کے نمک خوار ہیں۔ آپ کی طرف اٹھنے والے ہر ہاتھ کو کاٹنا ہمارا فرض ہے۔ بس آپ کو بہت جلدی خبر مل جائے گی۔۔۔۔۔ نوید نے آج تک آپ کا کوئی حکم نہیں ٹالا۔“ اس نے قہقہہ لگا کر بریف کیس بند کر دیا۔

ساری رات اس کوٹھی میں ملک صاحب اپنا غم غلط کرتے رہے۔ یہاں شراب اور شباب انہیں میسر تھے۔۔۔۔۔ اور یہ حوصلہ بھی کہ وہ اپنے دشمنوں کو نیست و نابود کر کے رکھ دیں گے۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اگر وہ اسمبلی میں نہیں جائیں گے تو پھر کوئی نہیں جائے گا۔ ان کے بغیر اسمبلی کیا سیاست کیا اور حکومت کیا؟

دوسرے روزے کے اخبارات نے لوگوں کو چونکا کر رکھ دیا..... ملک صاحب کا سیکنڈل، بھنڈر صاحب کی پریس کانفرنس، نجمہ بیگم کے متعلق تازہ انکشافات! ایسی ایسی سرخیاں جنہاں تھیں اخبارات نے کہ لوگ تھرا کر رہ گئے..... ملک کے تمام دفاتر اور گھروں میں یہی معاملات زیر بحث رہے۔

بھنڈر کی گردن میں سریاٹ ہو چکا تھا..... اس کے ہمنوا اور چچے سے یہی ”فیڈ بیک“ دے رہے تھے اس کا آزاد گروپ تمام سٹیٹس جیت کر اسمبلی میں پہنچے گا۔

اس کے دسترخوان پر پلنے اور چند سکوں کی خاطر اس کے آگے پیچھے دم ہلانے والے سیاسی تجزیہ نگاروں نے اپنے کاموں میں ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اگلی اسمبلی میں کوئی حکومت بھنڈر گروپ کی مرضی کے بغیر برسرِ اقتدار نہیں آ سکتی اور وہ جب چاہے حکومت کی ایسی تیسی کر کے رکھ دے گا۔

عین ان لمحات میں جب وہ اپنے کرم فرماؤں کی مبارکبادیں موصول کر رہا تھا، اس کے پروردہ ایک بد معاش نے بھنڈر کو ایسی خبر پہنچادی کہ جوشِ سرٹ سے بھنڈر پھٹنے کو آ گیا۔

”ملک کو پولیس نے گرفتار کر لیا..... جوڈیشل ریمانڈ پر جیل پہنچا دیا گیا ہے۔“ بد معاش نے بتایا۔

”ذات کی کوڑھ کر لی اور شہتیروں کو جھپے..... سالہا! دو ٹکے کا کتا اور ہم جیسے خاندانیوں سے مٹھا لگانے چلا تھا.....!“ بھنڈر نے قہقہہ بلند کیا۔

”بھنڈر صاحب! قدرت نے سنہری موقعہ دیا ہے۔ میں تو کہتا ہوں اس کا مٹھنا ہی ختم کروادیں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ بھنڈر صاحب! دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہئے۔“

یہ بڑی پرانی جوڑھ ہے۔ مراہوا ہاتھی سوالا کھ کا ہوتا ہے۔ اس سالے کا پتہ نہیں کوئی اور ڈرامہ رچا کر دوبارہ ہیرو بن جائے..... بھنڈر صاحب! بادشاہو! ویسے تو آپ مالک ہیں لیکن ہم نے بھی زمانہ دیکھا ہے۔ بادشاہو! اگر موقع مل ہی گیا ہے.....“ بد معاش کے مشورے نے بھنڈر کے دل کی دھڑکنیں دوچند کر دی تھیں۔

”لیکن کیسے..... کیسے؟“ اس نے بے قراری اور دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔

”صرف دو لاکھ کا کھیل ہے بھنڈر صاحب۔ صرف دو لاکھ کا..... جیل کے اندر ہی مروا

جیل میں آیا ہوا ہے..... سمجھ گئے ناں آپ۔ سمجھدار ہو بادشاہو! آخر خاندانی سیاست دان ہو..... بھنڈر صاحب جیل میں الارم ہوگا اور ملک مارا جائے گا..... کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی اور آپ کی طرف تو کسی کا خیال تک نہیں جائے گا..... کیا سمجھے بادشاہو! آخر ہم آپ کے نمک خوار ہیں۔ ہم آپ کا بھلا نہیں سوچیں گے تو کون سوچے گا!.....“

تجویر بھنڈر کے دل کو لگی تھی۔

ایسا سنہری موقعہ کب ملتا..... فیقا اس کے لئے جان پر کھیل سکتا تھا..... اور یہ تو منصوبہ ہی بڑا سیدھا سادا تھا۔ آج سے تین سال پہلے بھی انہوں نے اپنے گاؤں کے ایک میراثی کو جس نے بد معاشی شروع کر دی تھی اور ان کے منہ کو آنے لگا تھا اسی طرح ایک اور جیل میں آدمیوں سے الارم کروا کے مروا ڈالا تھا۔

کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔

انکو آری کمیشن بنا.....!

اور بات آئی گئی ہو گئی۔

”جیرے میراثی کی طرح کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی بھنڈر صاحب!“

بد معاش کی نظریں بھنڈر کے نوٹوں پر تھیں۔

”ٹھیک ہے..... شام کو رقم لے لینا لیکن.....“

”بادشاہو! لکھو! بس اب لیکن ویکن کو جانے دو۔ اب ہمارے ہاتھ بھی دیکھنا۔ سالے

کی تکابوٹی نہ کروادوں تو کہنا کہ اپنی کا جنا نہیں تھا۔“

شام کو بد معاش نے رقم وصول کر لی۔

اگلے روز جیل میں اس نے فیقے قاتل سے ملاقات کر کے اسے آدمی رقم دی اور منصوبہ سمجھا دیا۔ معاملہ طے پا گیا.....!

○

ارسلان کو انہوں نے ہر ممکن ذرائع سے تلاش کیا تھا، لیکن اس کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

خدا جانے اسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔

ایک روز جب نوہ کے ساتھ اپنے ملک صاحب سے جیل میں ملاقات کی تو ان کا بارہ

آسمان کو چھو رہا تھا۔

”حرام خورو! مجھے یہاں جیل میں رکھ کر خود چھڑو اڑا رہے ہو۔ اگر وہ نہیں ملتا تو کیا تم اندھوں کو بھنڈر نظر نہیں آتا..... میں نے وکیل کو ضمانت سے روک رکھا ہے کہ پہلے ان دونوں کا صفایا ہو جائے تو پھر ضمانت کرواؤں..... ہر صورت اسے مرجانا چاہئے ورنہ پھر.....“

ملک کی تلخی اور ہمکنی آمیز لہجے نے نوید کے ساتھی کے پسینے چھڑا دیئے تھے۔

”ٹھیک ہے ملک صاحب! پرسوں صبح کا سورج بھنڈر کے نصیب میں نہیں ہوگا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ ہم تو چاہتے تھے چھوٹا کام پہلے ہو جائے۔“

”دفع ہو جاؤ اور کام مکمل کئے بغیر مجھے اپنی شکلیں نہ دکھانا۔“

اس نے واپسی پر جب یہ پیغام نوید کو پہنچایا تو وہ سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہوگا۔ واقعی اگر ملک نے اس وقت ان کے سروں سے ہاتھ اٹھالیا تو پھر ان کی حالت ان آوارہ کتوں جیسی ہو جائے گی جنہیں کارپوریشن کے لوگ زہر دے کر مار دیا کرتے تھے۔

”یاد رکھ بہر صورت بھنڈر کا کام ہو جانا چاہئے۔ تم آج رات مجھے ڈکیت اور شرٹی کو بلا لاؤ۔ کل صبح وہ سیر کرنے کو نکلے تو سالے کا ”بولورام“ کرا دو..... صبح وہاں کون سی پولیس ہمارے لئے ناکہ لگا کر بیٹھی ہوگی۔“

○

اگلے روز جیسے ہی جیل کی قیدیوں کی کنتی کھلی، ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بی کلاس کے ساتھ والی بیرک میں قیدیوں نے لنگریوں سے لڑنا شروع کر دیا تھا۔ ایک قیدی نے جیل کی طرف سے تقسیم کی جانے والی سبزی میں سے کوئی شے نکال کر باقی قیدیوں کو دکھائی۔ اس کے ساتھ ہی قیدی گالیاں بکتے لنگر تقسیم کرنے والوں اور ان کے ساتھ موجود جیل کے عملے پر پل پڑے۔

چند منٹ ہی میں وہاں گھسمان کارن پڑ گیا تھا۔

ساتھ والی بیرک کے قیدیوں نے بھی یہی عمل دہرایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ جیل کے عملے کو گالیاں بکتے جیل کے چکر کی طرف آنے لگے۔

ملک صاحب بی کلاس کے احاطے میں ٹھل رہے تھے جب انہوں نے ایک طوفان

بدتمیزی اندتے دیکھا۔

اپنی لیڈری چکانے کا یہ موقع وہ ہاتھ سے کیوں کھوتے، یہی سوچ کر وہ آگے بڑھے۔

کے لئے ہی کیا گیا تھا..... اور اچانک ہی جوانیں درجنوں قیدیوں نے زرخے میں لے لیا تھا۔ یہ بھی سوچی سمجھی سازش تھی.....!

اس سے پہلے کہ ملک صاحب کی تقریر جاری ہوتی، ہجوم میں سے کسی نے زہریلا خنجر ان کے کلیجے میں تار دیا۔ ملک صاحب پر یکے بعد دیگرے پندرہ وار کئے گئے تھے۔ ان کی چیخ چنگھاڑ کوئی کان کیا دھرتا۔

وہاں..... سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔

کیونکہ جیل کا الارم ہو گیا تھا۔

جیل سپرنٹنڈنٹ نے اپنی مدد کے لئے سول لائن سے گارڈ طلب کر لی تھی اور اب سینکڑوں ڈنڈہ بردار سپاہی اس طرف بھاگتے ہوئے آرہے تھے۔

ایک طرف قیدیوں اور پولیس میں ہاتھ پائی ہو رہی تھی اور دوسری طرف ملک صاحب کی لاش قیدیوں کے پاؤں تلے روندی جا رہی تھی۔

جدھر جس کے سینگ سائے وہ اس طرف منہ اٹھا کر بھاگنے لگا۔ آدھ گھنٹے بعد جب ہنگامہ فرو ہوا تو جیل والوں نے دیکھا کہ پندرہ شدید زخمی قیدیوں کے ساتھ ساتھ ایک ”مردہ قیدی“ بھی موجود ہے۔

بی کلاس کے حوالاتی کی موت، وہ بھی خنجر کے زخموں سے۔ جیل والوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

وہ جان گئے کہ مرنے والا کون ہے؟

انہیں یہ بھی سمجھ آ گئی کہ اسے ”قتل“ کرنے کے لئے یہ سارا کھیل رچایا گیا ہے۔ لیکن.....!

اس کے قاتلوں کو کہاں تلاش کیا جائے؟

اس سوال نے انہیں چکرا کر رکھ دیا تھا۔

○

بھنڈر حسب معمول اپنے ایک اونگھتے ہوئے باڈی گارڈ اور ڈرائیور کے ساتھ سیر کرنے آیا تھا۔

اس کو اپنے بزرگوں سے یہی ایک اچھی عادت ورثے میں منتقل ہوئی تھی۔ یوں بھی اس کو ڈاکٹروں نے کہہ رکھا تھا کہ اس کی زندگی کی گاڑی اسی طرح چلے گی اگر وہ ہلکی پھلکی ورزش جاری رکھے ورنہ صرف دو ایوں سے کام چلتا نظر نہیں آتا۔

یوں بھی بھنڈر صاحب مستقبل کے وزیر بننے جا رہے تھے۔ اس لئے انہیں آج کل اپنی صحت کی کچھ زیادہ ہی فکر رہتی تھی۔

باڈی گارڈ بے چارے کی جان خواہ مخواہ عذاب میں آگئی تھی۔ اس کی نیند کبھی قسمت ہی سے پوری ہوئی تھی۔ آج کل تو وہ بڑی سنجیدگی سے استغناء دینے کی سوچ رہا تھا۔

”الو کے پٹھے بندوق ہاتھ میں رکھا کرو۔ یہ گلے میں لٹکانے کے لئے نہیں دے رکھی تمہیں۔ ہر وقت اسے گلے کا ہار بنائے رکھتے ہو۔“

بھنڈر صاحب نے گاڑی سے باہر قدم رکھتے ہوئے باڈی گارڈ کو ڈانٹا۔ جس نے بندوق کو سکول کے بچوں کے بستے کی طرح گلے میں لٹکا کر ان کے لئے دروازہ کھولا تھا۔

جیسے ہی بھنڈر صاحب نے باغ کی طرف قدم بڑھایا۔ عذاب کی طرح ایک کار اس سے ٹکرائی۔ یوں لگتا تھا جیسے کار کو ناڈی چلا رہا ہے۔ جس سے اسٹیرنگ پر قابو نہیں رکھ جا رہا تھا۔

لیکن یہ بڑا کھلاڑی ڈرائیور تھا.....!

بھنڈر کو روند کر اس نے اچانک بریک لگائے۔ اس کے ساتھ ہی کار کے دروازے کھل گئے۔

تین مسلح آدمیوں نے جنہوں نے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ زمین پر کراہتے بھنڈر اور اس کے باڈی گارڈ پر گولیوں کا مینہ برسا دیا۔

دونوں چند لمحے مائی بے آب کی طرح تڑپے اور ٹھنڈے ہو گئے.....!

بھنڈر صاحب کی کار گولیوں سے چھلنی ہو گئی تھی..... ان کے ڈرائیور کو ایک ہی گولی نے زمین بوس کر دیا تھا اور یہی ”زمین بوسی“ اس کی زندگی بچا گئی کہ حملہ آور اسے مردہ سمجھ کر فرار ہو گئے۔

نیم مردہ ڈرائیور کو پولیس کی ایک گشتی کار نے اٹھایا تھا جنہوں نے قاتلوں کو فرار ہوتے تو دیکھ لیا تھا لیکن اس خوف سے کہ مجرموں کے پاس عموماً جدید اسلحہ ہوتا ہے مجرموں کا تعاقب نہ

کیا..... وہ لوگ تو زخمی کو بھی اللہ کے آسرے پر ہی چھوڑ کر اپنی راہ لیتے لیکن اس درمیان سیرگاہ میں موجود تین چار نو جوان جو گنگ کرتے وہاں پہنچ گئے تھے جنہوں نے پولیس کا ردیکھ لی تھی۔

ایک مہربان پولیس افسر نے یہ ضرور کیا کہ کنٹرول کو مشتبہ کار کے فرار کی اطلاع دے دی۔ انہیں امید تھی کہ اب مجرم بچ نہیں پائیں گے۔

○

کمانڈر انچیف پر روز بروز دباؤ بڑھ رہا تھا۔ شمالی کمانڈ کی رپورٹ ان کے سامنے رکھی تھی اور انٹیلی جنس ڈائریکٹر فائلیں سامنے رکھے بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے کہ کمانڈر کے ساتھ ان کی طویل میٹنگ ہو چکی تھی۔

”جناب والا! تمام شواہد آپ کے سامنے ہیں..... وطن فروش تو یہ لوگ پہلے سے تھے لیکن اس طرح بڑھ چڑھ کر ملک و قوم کی عزت اور وقار کی بولی لگائی جائے گی اس کا تصور بھی ہم نے نہیں کیا تھا..... سر! تمام حالات آپ کے سامنے ہیں۔ غیر ملکی سفیروں کے ساتھ ان غداروں کی میٹنگز اور گفتگو کی ریکارڈنگ آپ نے سن لی۔ اب سے ایک گھنٹہ پہلے کی اطلاعات کے مطابق اب تک صرف شہروں کی حد تک 23 سیاسی کارکن مختلف پارٹیوں کے مارے جا چکے ہیں..... کرفیو کے باوجود لوٹ مار کا سلسلہ جاری ہے۔ ہماری مجبوری ہے جناب والا کہ ہم اپنے عوام پر گولی نہیں چلا سکتے اور یہ سارے بندر اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انار کی میں روز بروز اضافہ کر رہے ہیں۔ آج تین پارٹیوں کی طرف سے ملک کے دارالحکومت میں جلوس نکالنے کے اعلانات کئے گئے ہیں جس سے باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔“

جناب والا! بھنڈر اور ملک کے قتلوں سے جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ رکتا نظر نہیں آ رہا..... لوگوں میں مایوسی بڑھ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سرحدوں پر دشمن اپنے دباؤ میں اضافہ کر رہا ہے..... تخریب کاروں کی آمد جناب کے علم میں ہے۔ دشمن ہر روز نئے ”لاچنگ پیڈ“ تیار کر رہا ہے۔ ہمارے لئے ایک ہی وقت میں دشمن افواج اور سیاہ فاموں پر نظر رکھنا بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے..... دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر خطرناک ثابت ہوئے ہیں جناب والا!“

اتنا کہنے کے بعد انٹیلی جنس ڈائریکٹر نے باری باری فائلیں کھول کر کمانڈر انچیف کو پڑھانی شروع کر دیں۔

انتظامی عہدوں پر فائز کیا جائے۔

کمانڈر انچیف صاحب ان کی مشروط پیشکش کا مسکرا کر شکریہ ادا کر دیتے۔ وہ جانتے تھے کہ جو لوگ اس طرح کی پیشکش کر رہے ہیں ان میں زیادہ تعداد ان کی ہے جو عام حالات میں اپنے حلقے سے منتخب ہو کر اسمبلی میں بھی نہیں پہنچ سکتے۔

اگلے روز کمانڈر کے ساتھ کمانڈر انچیف کی انتہائی خفیہ میٹنگ جو شام ڈھلے شروع ہوئی تھی، صبح ہونے تک چلتی رہی۔

ملکی حالات کا سب نے تفصیلی جائزہ لیا۔ خدمات اور ممکنہ خطرات کی نشاندہی اپنی بصیرت کے مطابق کی۔ آدھی رات تک وہ لوگ کچھ عرصے کے لئے ملک میں مارشل لاء نافذ کرنے پر اصولی طور پر رضامند ہو چکے تھے۔

صبح ہونے تک انہوں نے مارشل لاء کی صورت میں ممکنہ رد عمل اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔

میٹنگ کے خاتمے پر جب کور کمانڈر نے اپنے اپنے ہیڈ کوارٹرز کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو سول انٹیلی جنس کے اہلکاروں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔

وزیراعظم کو سول انٹیلی جنس کے سربراہ نے جوان کے دست راست بھی سمجھے جاتے تھے، اگلے چوبیس گھنٹوں میں کسی بھی ممکنہ اور ”انتہائی اقدام“ کی اطلاع دے کر ان کی نیند حرام کر دی تھی۔

جب وزیراعظم صاحب اپنی کابینہ سے رابطہ کر رہے تھے عین ان لمحات میں سول انٹیلی جنس کے کچھ افسران اپنا مال و متاع سمیٹ کر بیرون ملک فرار کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لئے ہر غیر قانونی حربہ روا رکھا تھا۔ اپنی حدود اور قانونی اختیارات کا ناجائز استعمال کیا تھا اور جو جانتے تھے کہ مجاہد کا خون ناک اثر دہا نہیں ضرور نکل جائے گا۔

○

رات گئے کابینہ کا ہنگامی اجلاس چل رہا تھا۔ جب وزیراعظم کو ان کے سیکرٹری نے براہ راست اطلاع دی کہ دارالحکومت پر فوج نے یلغار کر دی ہے اور ٹینکوں اور فوجی ٹرکوں کو وزیراعظم

ہر فائل کے مطالعے کے بعد ان کے ماتھے پر ایک اور بل آ جاتا۔ ان کی کنپیٹیوں کے بل ابھرنے لگے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے کمانڈر انچیف نے اپنے اندر مچلتے طوفان کو زبردستی دبا رکھا ہو..... انہوں نے اپنے اظہار کے سامنے ضبط کا جو بند باندھ رکھا تھا، وہ بالآخر ٹوٹ گیا۔ جب ان کی موجودگی میں دو پارٹیوں کے جلوسوں کے آپس میں ٹکرا جانے کی اطلاع دی گئی موصول ہو گئی۔ ملٹری انٹیلی جنس کے مستعد اہلکار ایک ایک لمحے کی رپورٹ اپنے افسران اعلیٰ تک پہنچا رہے تھے۔

کمانڈر انچیف نے چند منٹ کی مزید کارروائی کے بعد اجلاس ملتوی کر دیا۔ انہوں نے اگلے روز شام کو تمام کور کمانڈرز کو خصوصی میٹنگ کے لئے طلب کر لیا تھا۔

میٹنگ سے فراغت پر کمانڈر انچیف سیدھے وزیراعظم سے خصوصی ملاقات کے لئے گئے تھے۔ انہوں نے تین گھنٹے تک وزیراعظم اور ان کی نگران کابینہ کو بریفنگ دی اور ان سے اپیل کی کہ وسیع تر ملکی مفاد کے پیش نظر وہ لوگ اپنی ذات خواہشات اور ترجیحات ایک طرف رکھ کر ملک میں امن و امان کی فضا قائم رکھنے پر توجہ صرف کریں۔ انہوں نے حکومت کو تفصیل سے دشمن افواج کی نقل و حرکت سے مطلع کر دیا تھا۔

لیکن.....!

وہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کی باتیں لوگوں کے سر سے ہی پھسل جاتی ہیں۔ تین گھنٹے کی طویل میٹنگ میں انہوں نے حکومت کے منہ سے سوائے اپوزیشن کے خلاف الزامات کی بوچھاڑ کے اور کچھ نہیں سنا تھا۔ یہ لوگ حالات کی باہمی کی ساری ذمہ داری اپوزیشن پر ڈال رہے تھے۔

کمانڈر انچیف اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب وزیراعظم ہاؤس سے رخصت ہوئے تو انہیں خاصی مایوسی کا سامنا تھا۔

اسی روز شام کو انہوں نے اپوزیشن رہنماؤں سے الگ ملاقات کی۔ ہر لیڈر تباہی کی ذمہ داری دوسرے پر ڈال رہا تھا۔ ان میں زیادہ تعداد ان لیڈران اکرام کی تھی جو مخالفین کے خلاف زہر افشانی کرتے کرتے کمانڈر انچیف صاحب کو اعتماد میں لے کر مارشل لاء لگانے کا مشورہ دیتے اور اپنی حمایت کا یقین دلاتے ہوئے ان سے درخواست کرتے کہ جب مارشل لاء لگ جائے تو ان کی خدمات سے ضرور استفادہ کیا جائے اور نگران وزارتوں یا دیگر اعلیٰ سول

ہمسایہ ملک سے امریکہ پہنچنے تک کی کہانی تین ماہ پر محیط تھی۔ اس کے پاس زادراہ بہت تھا۔

سارا سرمایہ اس نے محفوظ کر لیا تھا۔

لندن میں وہ اپنی جس شناخت کے ساتھ داخل ہوا تھا اس کا علم سوائے اس کے کسی اور کو نہیں تھا۔ اپنے ماضی کے ہر حوالے سے اس نے ناطق توڑ لیا تھا۔

اب اسے نئی پہچان کے ساتھ زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ اس نے امریکہ میں اپنی جڑوں سے کٹ کر جینا شروع کیا تھا۔

وہ ”منی پلانٹ“ بن گیا تھا۔

خود رو درخت.....!

ایسا پودا جسے بڑے لوگ سجاوٹ کے لئے اپنے کمروں میں گملوں میں لگایا کرتے تھے۔

بغیر پھل پھول اور خوشبو کے اسے صرف اپنے وجود سے لپٹے بچوں کے ساتھ جینا تھا۔ مائیکل کو اس نے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ بہت کچھ مائیکل نے خود سمجھ لیا تھا۔ اس نے ایک اور شناخت کے ساتھ ارسلان کو امریکہ پہنچایا تھا۔

اب اس کے رابطے شمالی امریکہ کے مافیا سے استوار تھے۔ اب اس کی حیثیت ایک ”پانڈی“ والی تھی۔

مال یہاں سے وہاں لے جانا سودے کرنا مال پہنچانا اور اپنی کمیشن وصول کرنا۔ اس نے کیلی فورنیا کے شہر فرانسکو میں اپنا گھر بنالیا تھا..... عیاشی کا ہر سامان اسے میسر تھا۔ اس نے خود کو شراب شباب تک محدود کر لیا تھا۔ زندگی کو اس نے کسی تیسرے حوالے سے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

جب کبھی گمشدہ محبتیں زمینیں لوگ اور حوالے یاد آتے تو وہ پاگلوں کی طرح تہمت لگا کر خود کو غرق سے کر لیتا۔ اب تک دو مرتبہ اس نے خطیر رقم اپنی بہن کو اپنا پتہ دیئے بغیر پہنچا دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کبھی ایک کوڑی اس سے وصول نہیں کرے گی لیکن بیوہ بہن کی بات اور تھی۔

ہاؤس کی طرف بڑھتے دیکھا گیا ہے۔ وزیراعظم نے لپک کرفون اٹھایا کہ سول انٹیلی جنس کے سربراہ سے رابطہ کر کے حالات کی اصلیت جاننے کی کوشش کریں لیکن فون ڈیڈ تھا.....!

”دوستو! خود کو آنے والے حالات کے لئے تیار کر لو۔ فوج نے گھیرا ڈال لیا ہے۔“ وزیراعظم نے بڑی ہمت سے اپنے ساتھیوں کو باخبر کیا جن کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ ”افسوس ہماری بد اعمالیوں نے ہمیں یہ دن دکھائے۔“ ایک وزیر صاحب نے گوہر فشانہ کی۔

وہ لوگ میٹنگ روم میں سر جھکائے بیٹھے تھے جب فوج کے دو مودب اعلیٰ افسران وہاں آ گئے جنہوں نے بڑے مودبانہ لہجے میں انہیں مارشل لاء کی اطلاع دے کر خود کو ”ہاؤس اریسٹ“ سمجھنے کی درخواست کی۔ انہیں بتایا گیا کہ ان کی حفاظت کے لئے فوج انہیں کچھ دن اپنی نگرانی میں رکھے گی۔

ساری کابینہ ہونٹوں کی طرح فوجی افسران کے احکامات سنتی رہی۔ کسی نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

سب نے خود کو متم ظریفی حالات کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

O

ارسلان نے ملک میں مارشل لاء لگنے کی خبر ہمسایہ ملک کے ایک ہوٹل میں پڑھی اور ٹی وی کی خبروں میں سنی اور دیکھی تھی۔

اسے ملک سے فرار ہوئے آج دس روز ہونے کو آئے تھے۔ اپنے ملک سے براہ راست یورپ جانے کی بجائے اس نے مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے یورپ پہنچنے کا فیصلہ کیا تھا۔

”تم اسی قابل تھے حرام خورد! تم انسان نہیں انسانوں کے روپ میں بسنے والے درندے ہو! کاش تمہارے لئے خدا کا کوئی خصوصی عذاب مقرر اور متعین ہو جائے اور میری بد قسمت قوم تم سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر لے۔“ اس نے دل ہی دل میں سیاست دانوں کو مٹھون کیا۔

دھند چھٹ رہی تھی لیکن اسے شیشے کی دیوار کے پار دیکھنا محال ہو رہا تھا۔
ہما اکبر علی نے اب تک تین چار مرتبہ اپنی آنکھیں پونچھی تھیں۔
لیکن.....!

وہ پتھر کا بت بنا اسے دیکھتا رہا۔

اب جو اس نے میز پر رکھے نشوونما کو اکٹھا کر کے اپنی آنکھوں پر جمایا تو ہما اکبر علی کے
ہونٹوں پر آنسوؤں سے بھیگی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تم نے رونے کی عادت کب سے ڈالی ہے؟“ اس نے ارسلان سے کہا۔

”زندگی کا ہر عمل اختیاری نہیں ہوتا ہما!“

”کاش تم نے یہ بہت پہلے جان لیا ہوتا..... کاش!“

دونوں بڑے محتاط انداز میں اپنے ماضی پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ہمانے اسے بتایا تھا کہ وہ
دو بچوں کی ماں ہے اور اس کا خاوند یہاں بزنس کرتا ہے۔ وہ اکثر یہاں کافی پینے چلی آتی ہے۔
آج بھی معمول کے مطابق آئی تھی اور اب اسے سکول سے بچوں کو لینے جانا ہے۔ اس کی گاڑی
نزدیکی پارکنگ میں موجود تھی۔

ہمانے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا لیکن وہ سب کچھ جان گئی تھی۔ دونوں پارکنگ کی
طرف جارہے تھے۔ جب اچانک ہی ہمانے اس کی طرف دیکھا۔

”ارسلان تم میری بات تو نہیں مانو گے لیکن میں تم سے پھر التجا کروں گی کہ لوٹ جاؤ۔
ارسلان المیہ یہی ہے کہ تم بہت تیز چلتے ہو اور بہت آگے نکل جاتے ہو..... ارسلان! کوئی درخت
اپنی جڑوں سے کٹ کر نہیں جی سکتا..... تمہیں قدرتی اور مصنوعی درخت کا فرق امریکہ میں آ کر تو
ضرور معلوم ہو گیا ہوگا..... بے شناخت لوگوں کو مصنوعی درختوں کی طرح پھل نہیں لگتا۔ پھول نہیں
آتے۔ ان کی خوشبو نہیں پھیلتی۔ ارسلان! میں نے بھی زندگی میں سب کچھ کھو کر یہ سب کچھ سیکھا
ہے۔ ہم مشرقی لوگ اپنی شناخت سے کٹ کر کیسے جی سکتے ہیں..... تم واپس چلے جاؤ۔ اپنے لوگوں
میں اپنی ماں کے پاس۔ میرا دل کہتا ہے وہ تمہیں ضرور معاف کر دے گی۔ یہ زمین اور ماں کا رشتہ
بہت مضبوط ہوتا ہے۔ بہت مضبوط۔ ہماری سوچ سے بھی زیادہ.....“ اس کی آواز بھرا گئی۔

ارسلان خاموش رہا.....!

اسے اپنی بہن کے بیوہ ہونے کی اطلاع اسی ملک میں ملی تھی۔ نجانے کیوں ابھی تک وہ
اپنے گھریلو حالات سے باخبر رہتا تھا..... حالانکہ اسے اب ایسا نہیں سوچنا تھا۔ اس نے سوچا۔
لیکن.....!

ہر سوچ کو رو بہ عمل لانے پر اسے اختیار نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ اسے اپنے آپ سے بے خبر رہنے کی عادت سی پڑ گئی۔ اب اس کا مقصد
سوائے اپنے ”مافیا“ کے احکامات کی تعمیل کرنے اور زندگی کی گاڑی جیسے تیسے گھینٹنے کے اور کچھ نہیں
رہا تھا۔

○

اس روز بھی وہ اپنے کام کے سلسلے میں ہی نیویارک گیا تھا جب اچانک اس کا ماضی تمام
تروچشتوں سمیت اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

ہما اکبر علی شیروانی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

خوش بختی کا پرندہ.....!

خوش قسمتی کی علامت.....!

بادشاہت بخشنے والی ہما.....!

اور اپنی آگ میں جل کر بھسم ہونے والا ہما.....!

ایک مرتبہ پھر اس کے سامنے موجود تھا۔

اس نے زندگی کی تمام ترواقیعت کے ساتھ ہما کے قرب کو محسوس کیا جس کی گہری بادی
آنکھوں میں اسے دیکھ کر نمی اتر آئی تھی۔

خود ارسلان نے محسوس کیا تھا کہ وہ دس سال پہلے والا تھرڈ ایئر کا طالب علم بن گیا ہے۔
یونیورسٹی کی گراؤنڈ روٹیں، راستے، کلاس روم، ہوٹل کے کمرے، اس کا ماضی، ایک ایک حوالہ ایک
ایک سچائی ہو لے ہو لے نشتر کی طرح اس کے سینے میں اترنے لگی۔

وہ ہما اکبر علی پر سے نظریں ہٹانا نہیں چاہتا تھا لیکن اپنے گالوں پر آنسوؤں کی گری
محسوس کر کے اس نے منہ شیشے کی اس دیوار کی طرف پھیر لیا جس کے پار نیویارک کے سارے
مناظر رینگ رہے تھے۔

پارکنگ آگئی تھی۔ ہمارا اپنی کار کا دروازہ کھول رہی تھی۔

”مجھے اب جانا ہے۔ میرے بچے میرے منتظر ہوں گے۔ تمہاری ماں بھی تمہاری منتظر ہوگی..... ارسلان! اگر ماضی میں یا آج میرے اور تمہارے درمیان کوئی ذہنی رابطہ رہا ہے تو میں التجا کر رہی ہوں کہ آج میری بات نہ ٹھکرانا۔“

”ہاں ہمارا! میں واپس جا رہا ہوں۔ اپنی زمین کی طرف اپنی ماں کی طرف میں اپنے ملک میں جا کر اپنے سارے گناہوں کا اقرار کر لوں گا۔ اپنی ساری سزا پوری کروں گا..... بہت بھاگ لیا۔ تم مطمئن رہنا میں واپس چلا جاؤں گا..... میں نے کہا تھا کہ ہمارا ہر عمل اختیاری کہاں ہوتا ہے۔ ہمارے حافظ عابد نے بتایا تھا کہ خوش بختی کی یہ علامت جس کا نام ہمارے مجھے بادشاہ تو بنا دے گی لیکن میری نہیں بنے گی۔ کاش میں نے حافظ عابد کی بات سمجھ لی ہوتی..... خیر! اب تو پلیوں کے نیچے سے بہت پانی بہہ گیا۔ مجھے علم نہیں کہ زندگی میں دوبارہ ہم کبھی مل پائیں گے لیکن امید ضرور ہے کہ ہم دوبارہ ملیں گے۔ تب میرا چہرہ بے شناخت نہیں ہوگا۔ تب میں اپنے تمام حوالوں کے ساتھ تمہارے سامنے آؤں گا۔ اچھا تمہارے بچے تمہارے منتظر ہوں گے۔ خدا حافظ! الوداع.....!“

اس نے سسکیاں بھرتی ہمارا کبر کی طرف دیکھا اور منہ دوسری طرف موڑ کر چل دیا۔ اس مرتبہ وہ بڑے اعتماد سے قدم اٹھا رہا تھا۔ اسے آج ہی اپنے ملک کے لئے جہاز کا ٹکٹ خریدا تھا۔ اس نے اپنی شناخت تلاش کر لی تھی۔ اپنی گمشدہ جنت کا نشان پالیا تھا۔

اپنا ملک.....!

اپنی زمین.....!

اپنی ماں.....!

جہاں کے سارے منظر اس کے تھے۔

سارے حوالے اس کے تھے.....!!